اب تک
ظفر اقبال
• وہم و گماں • اطراف • ہے ہنومان
• تفاوت • ترتیب • تماشا
کلیاتِ غزل
جلد دوم

کُلّیاتِ غزل

(جلد دُوم)

ظفر اقبال

معیاری اُردو زبان اور
دُرست املا کا محرک
اشاعتی ادارہ

MULTI MEDIA AFFAIRS

اَب تک: ظفر اقبال (کُلّیات) جلد دُوم

ISBN:969-8483-39-X

اہتمام:

ایچ اے شیرازی
میاں جاوید اقبال ارائیں

اشاعتِ اوّل: 2005ء
ٹائٹل: ریاظ
کمپوزنگ: اعظم علی شاہ
مطبع: حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز
ناشر: ملٹی میڈیا افیئرز
قیمت: 650 روپے
$: 40
£: 30
€: 35

MULTI MEDIA AFFAIRS

21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji.
Lahore-54500, Pakistan.
Tel: (92-042) 7356454 Mobile: 0333-4222998
E-Mail:multimediaaffairs@hotmail.com

معشوقِ اُردو

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام

درمیانِ من و اُو رشتہ موج است و کنار
دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

''شاعر ایک ایسا خرگوش ہوتا ہے جس کے پیچھے کوئی بھیڑیا لگا ہُوا ہو، یا وہ
خُود ایک ایسا بھیڑیا ہوتا ہے جو کسی خرگوش کے تعاقب میں ہو۔''

مت چھوڑو زمیں ہماری ہے 933
نئے سرے سے اس کو بسانا چاہتا ہوں 934
تماشا ہو رہا ہوں یا تماشا کر رہا ہوں 935
لڑی ٹوٹ گئی ہے مجھ میں 936
بجتی ہوئی چاروں طرف آواز پھیل کر 937
بیٹھے بیٹھے کھو گیا 938
ہاتھوں ہاتھ اب آتے ہے لیتی دنیا 939
لفظ جگنوں کی طرح اڑنے لگے چاروں طرف 940
سوئے سوئے ہوئے الفاظ 941
اک اور شور سی اُس کے جی میں آیا ہوا 942
جہاں لکھی وہ شام بکھیر دیا 943
کیا کچھ بھی نہیں ہے، اور معافی چاہتا ہوں 944
انکار میں ہے کہیں اقرار میں ہے 945
کاغذ پر اک باغ بنایا کرتا ہوں 946
لیے ہوئے لاچاری کو 947
ہر سو کیا چھوٹا ہے مصرع 948
بچا جتا خبر ہونے سے پہلے 949
میں تو ہوں آواز کرنے کے لیے 950
پر تکلف کا تکلف اٹھانے والا ہوں 951
ذرا ہاتھ کہیں جاتا ہوا ہو جانے سے 952
چھوڑی جلوہ پڑی میں نے 953
روز میں اپنے کنارے تک چلا جاتا ہوا 954
کن چیزوں کے لیے ترستا رہتا ہوں 955
کبھی میری کبھی تیری پڑی ہے 956
نہ ہمارے نہ تمھارے طفیل 957
لفظوں کو لکار رہا ہوں 958
چار سُو پھیلا ہوا ہو کر ہے 959
پر کس انداز خطر سے بچ رہا ہوں 960
کسی نقش کی بے خبر نشان کے درمیاں 961
سان دھوپ کی دھار کا 962
پہلا نہیں دوبارہ سے والا 963
یا آخر حال سے بے حال کرکے 964
پکڑے گئے بیاکاری میں 965
ذکر اس کا ہی کیا کرتا ہوں 966
کچھ رابطہ رہے قریبی سے 967
برا ہوتے کہ اچھا ہوتے ہوتے 968
دولت خود ہی روانی میں 969
جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا 970
سارا دانہ پانی لے گئے 971
کہے کو چھوڑ دیا ان کہے کو چھوڑ دیا 972
راستے سے جو گزرتا ہوا ہو جاتا ہوں 973
بیٹھے بیٹھے منتظر کرتا 974
سورج اوپر نیچے سا ہونے لگتا ہے 975
ابر ہے ٹھنڈی ہوا کے اور گرد 976
بے سبب رہ گیا تو نظر کیسے آئیں گا 977
دکان بڑھا دی ذوں گا اک دن 978
کچھ بیٹھا رہتا ہو جاؤں 979
لوٹ آؤں ہونے سے پہلے ہی 980
مرے الفاظ ہیں سب کچھ معانی کے بجائے 981
سنیں گے آپ بھی شاید نئے طریقے سے 982
جب بیچ پڑا تا کا ہی سے 993
لوٹ کر آنے لگا ہونے لگا ہوں 994
رفتہ نہیں چاہتا ہوں، بھائی 995
بھلے ہی اتنا وہ بھولا ہے اور بھاتا ہے 996
پیچھے پیچھے آتا ہوں 997
لکھا ہوا بھی ہے اور دکھتا ہوا ہے 998
میں جو کچھ شور و غوغا کر رہا ہوں 999
طبیعت رُک گئی ہے پھر رواں ہونے کی خاطر 1000
کوئی خواب میں جاتا ہوا ہو سکتا ہوں 1001
شور تھی رات جس دوران رک جاتی ہے اصل کر 1002
وہ ستارہ وار سا شام اٹھتے ہی بے نشان چھپا ہوا 1003
دوسری تحریر میں مصرعہ ہے اک ضرورت اپنی کی فہرست عباس تابش 1004

جے ہنومان

○ انتساب 1016
○ ہنومان جی اور ہم۔ ظفر اقبال 1019
تاج ہے سر پر ہنومان کے 1021
دُم کی اپنی شان ہے 1022
بال ہوئے پوشاک 1023
کندھے پر گرز جمائے ہو 1024
جتنے ایسے ویسے ہو 1025
جرأت سے کچھ ڈرتے کچھ 1026
یہ جڑی بوٹیاں ہی کیا لائے 1027
ٹھیک ٹھاک انسان ہو 1028
جس بندریا سے گئے ہو پھنس 1029
ہنومان کو پکڑا اوپر 1030
پل میں کہاں گئے ہنومان 1031
سب سے آگے آگے آئے 1032
میرے پیچھے ہیں کہ تمھارے پیچھے ہیں 1033
کچھ تو بولو جلو ہنومان 1034
سچائی کی صدا کچھ ہو 1035
قسمت کھوٹی ہے، ہنومان 1036
تاج کہاں سے پایا تم نے 1037
بیٹھے جی اب مرہ بھی 1038
قائم سے ہیں، ڈولے سے ہیں 1039
ہنومان نے کھولا لب 1040
ہنومان جی، بے مثال سے کیوں ہیں 1041
بے ہتھیار سے لڑتے ہو 1042
آدھا حاجی اور آدھا کھوٹ 1043
دو پاؤں پر کھڑے ہوئے 1044
سنا نہیں تھا ایسا ناچ 1045
سو کیں کبھی ہمارے ساتھ 1046
پہنا دیکھا پاپ کا 1047
ہنومان کی پوجا کر 1048
جنگل جنگل شور ہے 1049
آ ہنومان 1050
کب چھوڑو گے جان جی 1051
بندر تھوڑا ہنومان 1052
بندریاؤں سے پرے ہیں 1053
بن پر کوئی مصیبت آئے 1054
آنکھوں سے دیکھے ہنومان 1055
آؤ پکاریں ہنومان کو 1056
ہیں شرمائے ہوئے ہنومان 1057
ہاتھ سے نکلا جائے زمانہ 1058
آدھی رات سے ہوگی 1059
ہنومان ہم سے شرمائے 1060
تھے ڈرتے ہنومان سے 1061
چاروں سمت اسی کا نرم نظارا ہے 1062
ہنومان کا رب جانے 1063
آخر کیا ہوگی اُن کی مجبوری 1064
آخر ہم کب تک سنتے جائیں 1065
بیٹے پہ چڑھ کر بیٹھ ہو گئے 1066
آبادی سے ہو گئے تنگ 1067
مہک رہی ہے گھاس 1068
پچھلی نجراہیں ہنومان کی 1069
جتنی پیچھے چھان پھٹک 1070
میں سمجھا تھا ہوں بس میں 1071
جھنڈا کیا یہ گاڑا میں نے 1072
میں تو ہوا ہوں گم 1073
بڑی ہی مشکل سے جا کھوئے 1074

برملا کبھی ہوئی ہو، پذیرائی چاہیے 1195
پاسے ہوئے اس وقت کو کھونا ہی عجب ہے 1196
رہے کچھ راہ سے ہٹ کر کبھی تھے راہ کے اندر 1197
سمندر کا کنارہ دیکھنا کافی نہیں تھا 1198
کسی پیاس کی پاسبانی میں ہے 1199
قمر قمری چہکی ہوئی ایک زمانے تک ہے 1200
سبزہ تھا اور باغ تھے صحرا کے دائیں بائیں 1201
اکیلے کیا کبھی گھر میں کبھی دفتر میں ہوتا ہے 1202
نہیں کہیں تھا مگر ہمارے لیے نہیں تھا 1203
رستہ بھی ہو جیسے کہیں دیوار کے برعکس 1204
جنت کے باوجود زمانے کے باوجود 1205
کہیں کر تیرے اشارے نہیں سمجھتا ہوں 1206
جلا نہیں تو بجھتا ہے 1207
کبھی اظہار میں ہوں اور کبھی انکار میں ہوں 1208
گرنے کی طرح کا نہ سنبھلنے کی طرح کا 1209
یہی نہیں کہ دل زار سے اُلجھتا ہے 1210
اگرچہ اور بہت انکار میں کچھ تھا 1211
منزل خواب دوام آگے ہے 1212
جو سلسلہ سا بظاہر دن اور رات کا ہے 1213
نکال لائے ہیں جانے کہاں کہاں سے مجھے 1214
کوئی آتا ہمارے راستے میں 1215
انتہا کرتے رہنا 1216
کسی روک میں، کسی تھام سے اسے روکنا 1217
کسی کے روح و رواں تھے 1218
ہے جو ہمارا اثر شامل حال 1219
نزدیک و دور یوں ہی خدا ہے بذات خود 1220
آنکھوں والی نشانوں والی 1221
اندر کی سمت وسعت صحرا تو ہو سکے گی 1222
حق بات ہے افسانہ وحشتوں کے مقابل 1223
عالم خواب میں بہتا نہیں دریا فی الحال 1224
وہ کچھ ایسا مرے مخالف ہے 1225
پیچھا فرار کا ہے نہ آگا خیال کا 1226
کلام ہوتا ہے اپنا بھی دل کے اندر 1227
ویسے بھی راستے میں ہی پڑتی دکان ہے 1228
کہاں گئی وہ امید موہوم و معصومہ 1229
کوئی اپنی ہی ادا اس میں، کوئی اور کی تھی 1230
زمیں کا رنگ ترے آسماں میں شامل تھا 1231
ساتھ اپنے کوئی غم ہے نہ خوشی رہ گئی ہے 1232
نہیں کہتا کہ زیب داستاں ہونے دے مجھ کو 1233
پایا نہیں شام کا کنارا 1234
فسوں طرازی میں سو فسانے نکالتا ہوں 1235
نہ اس کو قبول پائے ہیں نہ ہم نے یاد رکھا ہے 1236
سراسر اہل دنیا سے کبھی بیزار ہو جانا 1237
ہیں اتنے تنگ جو ہر لحظہ ہارنے والے سے ہم 1238
زندہ بھی خلق میں ہوں مرا بھی ہوا ہوں میں 1239
سب کو معلوم ہے تو نے نہیں کھلنا چاہا 1240
جوڑتا ہوں، بکھر نہیں جاتا ہوں 1241
ہوا یہ لگی اس بے وفا کے ہونے سے 1242
اس فضا میں نئے لفظوں کی جو پروازیں ہیں 1243

ترتیب

○ انتساب 1246
صورت اشک تپاں ہوتی ہوئی 1247
کچھ زاویہ منظر دنیا تو نیا ہو 1248
کہیں میرے ترے سوا کوئی ہے 1249
کوئی اک دوسرے سے کب جدا ہوتا ہے کوئی 1250
یہاں سب سے الگ سب سے جدا ہوتا تھا مجھ کو 1251
نئی تحریر فلک سے کوئی جاری تو کرے 1252
ذرہ ذرہ کرتے آئے پاس بلانے سے کیا 1253
چلو کبھی دست رعنا پہ ہاتھ ڈالتے ہیں 1254
چشم روزن نہ کسی در کی طرف سے آئی 1255
کب سے رکی ہوئی جو ملاقات کوئی ہے 1256
سنبھل گئے ہیں شکایت بہت زیادہ نہیں تھی 1257
نوید عاقبت کار کے برابر ہے 1258
بظاہر صحت اچھی ہے جو بیماری زیادہ ہے 1259
بہت سے خواب دکھانے کی طرف سے آیا 1260
خود بین سے بندگی ہے تو خبر، خواب ساتھ ہے 1261
پھیلا ہے چار سو جو تماشا بھی دیکھ لوں 1262
تجھے پانا جو ایسا ہو، تجھے کھونا ہی ایسا تھا 1263
کوئی کیا اور دیتا اس کو کھونا ہی کچھ ایسا تھا 1264
پھر کوئی شکل نظر آنے لگی پانی پر 1265
کیا تماشا ہے کہ اب تک بھی نہیں کرتا ہوں 1266
بہتا ہے کہیں اس کو کھل کر چھانے والا ہے 1267
سحر سے پیشتر ہی رات میں نے ختم کر دی ہے 1268
غلط کیا ہے مرے ہونے میں، کیسا ہوتا جاتا ہوں 1269
پردۂ شب سے پرے چاند چمکنے لگا 1270
دل بجھ گیا تو کیا ہے کہ دنیا تو ہے ابھی 1271
اگر اب بھی مری عزت نہیں کی جا سکتی 1272
کرنے سے زیادہ ہوں نہ کرنے میں تو وار 1273
موسم ہواؤں کا مرے اندر نہیں کھلا 1274
باقی تھا ابھی دن کہ بجی رات کی نوبت 1275
مرے خیال میں جنگل گھنا بھی ہوتا ہے 1276
رکاوٹ پڑ گئی ہے، روانی چلے 1277
جو شور سا کوئی میری صدا کے اوپر ہے 1278
جیسے کتاب میں سوکھے پھول کی لیک مہک رہ جاتی ہے 1279
جلدی ہی ٹل گئی جو مصیبت ہی نہیں تھی 1280
مشکل میں پڑا ہوں کسی آساں کی بدولت 1281
پہنچتا ہے مجھے دریا کنارے راستے پر 1282
حسن اتنا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ! 1283
ہیں صرف کناروں کے نہ دھاروں کے مخالف 1284
سر بھی میرا نہیں، وحشت بھی کسی اور کی ہے 1285
کس طرح کا یہ ظفر، ذوق نمو آگے ہے 1286
شکست کی شباہت کوئی پتھر سے نکالوں 1287
دیتے آواز کبھی میرے پکارے ہوئے خواب 1288
تنہا یہ بار خواب اٹھانا پڑا مجھے 1289
دکھایا اور کچھ تھا اور اب کیا دے رہا ہوں 1290
کہیں اپنی رسائی میں تو وہ بیشک نہیں تھا 1291
حسرت لیے پھرو، کبھی حیرت لیے پھرو 1292
قیامت آنے والی ہے یہ سارا کیا بنے گا 1293
کہیں تو جائیں جو یہ راستے نکالتا ہوں 1294
رونا جو ہے کھلا ہوا گانے کے ساتھ ساتھ 1295
تفکر سے یہ جو شور مری پیشانی ہے 1296
قافلے میں کہیں شامل بھی نہیں ہو سکتا 1297
منظر کوئی اس شہر فضا سے نہیں نکلا 1298
سر بسر شخص اپنی ہی کمی ہونے لگی ہے 1299
کف ہوا نہ کسی آئنے کو ملتا ہے 1300
رکا ہوا ہوں کہ آگے کہیں رواں ہوں میں 1301
سننے کے لیے ہوں نہ سنانے کے لیے ہوں 1302
لگ رہا ہے یہ محبت کا تماشا کیا کیا 1303
آر میں آئی ہے، پار میں آئی ہے 1304
غلط بھی ہونے سے انکار تو نہیں کرتا 1305
میرے شش جہات کی ہاؤ ہو کے علاوہ ہے 1306
کچھ دنوں سے میری ہر جانب جو حیرانی سی ہے 1307
کبھی کسی کی ادھوری کتاب میں ہوتا 1308
کرتے تو ہیں کبھی وہ حماقت جو ہم نے کی 1309
کچھ اس نے سوچا تو تھا مگر کام کر دیا تھا 1310
آنکھوں کو آہوں پہ جانے سے آئے گا 1311
کرتا ہوں سفر راہ گزاروں سے بہت دور 1312
آوارۂ سفر ہوں ٹھکانا کہیں نہیں 1313
کہتے رہو، باتوں میں اثر کچھ نہیں آتا 1314

کیا اُترا آئے سارے مرے ہر طرف 1315
اپنی جو اس کے ساتھ عداوت ہی رہ گئی 1316
تسلیم بھی کیا اُسے، بیعت بھی ہم نے کی 1317
گھر بھی مطلوب ہے، آنگن بھی مجھے چاہیے ہے 1318
سفر کا اپنے بہانہ ہی اور ہوتا ہے 1319
کوئی اس کی خبر نہیں آتی 1320
تھوڑے تھوڑے سے کسی سارے نہیں تھے 1321
جہاں قیام ہے اُس کا وہیں سے ہٹ کر ہے 1322
ہوا سے نام ہے یا سر بسر محبت ہے 1323
نفع ہے یا ضرر ہے، یا کچھ اور 1324
اکثر تو یہ اُفتادِ طبیعت نہیں پڑتی 1325
خسارہ جانچتا ہے اور منافع دیکھتا ہے 1326
گھر میں ہو گا کوئی دُشمنوں کے ہوا اور چراغ 1327
نکل نہیں پاؤں گا جہاں جا کے پھنس گیا ہوں 1328
محبت سے مُکر جانے کی گنجائش نہیں ہے 1329
دریا دور نہیں، اور پیاسا رہ سکتا ہوں 1330
صرف آنکھیں تھیں، ابھی اُن میں اشارے نہیں تھے 1331
ویسے تو بھرے شہر میں کیا کیا نہیں چلتا 1332
دُھند میں دُھوپ سی کھڑکیوں سے نکل آئی ہے 1333
جو سامنے نہیں، لگتا بھی تیرے سامنے ہے 1334
جو کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں 1335
ہم نے سامانِ سفر میں تری حسرت رکھ لی 1336
رفتہ رفتہ کسی راکھ میں احتجاج رہتا ہے 1337
اُسے خبر نہیں جو اتنا تعلق ہے 1338
کھلتے ہیں جب آشفتہ بیانی کے معانی 1339
کوئی گرا ہوا منظر سنبھل کے دیکھتا ہوں 1340
یہ کیا طراوت دریا سے واپس آیا ہوں 1341
جو خوش ہو رہے تھے، تماشا کر رہے ہیں 1342
جیسا بھی ہے احوال سنانے کے نہیں ہم 1343
آیا ہے پیغام اتنا، کچھ پتا چلتا نہیں ہے 1344

کوئی بتاؤ کہاں اور کدھر گزار رہا ہوں 1345
جیسے ہو کسی دشت سے آہو کا نکلنا 1346
زمیں کم ہے تو جا کر آسماں پر گھومتا ہے 1347
یہ کشف سب کے لیے عام بھی نہیں ہوتا 1348
کسی طرح کا کوئی اہتمام بھی نہیں تھا 1349
پایا ہے کوئی چیز نہ کھویا کسی کے ساتھ 1350
ممکن ہے کہ وہ صاف اشارہ بھی نہ دیکھے 1351
سوا دو جو بھی ہے سارا کہاں سے آتا ہے 1352
بہت مصروف ہوں چھوٹا سا کوئی گھر بنانے میں 1353
نہیں معلوم کہ ہے کس کے لیے ہونے والی 1354
یہ آنکھیں اور ہوئی تھیں تماشا اور ہوتا تھا 1355
ہم نے کاغذ پہ اگر حشر بپا کر لیا ہے 1356
پھر کوئی سی شکل ساز کہاں سے کریں ہم 1357
بات ایسی بھی کوئی نہیں کہ محبت بہت زیادہ ہے 1358
گماں گزر نہیں سکتا ہے، خواب آ نہیں سکتا 1359
ہر طرف پھیلی خوشبو کی حفاظت کرنا 1360
دوری دُور تک سنے کی ضرورت کیا ہے 1361
نہ جینا چاہتے ہیں اور نہ مرنا چاہتے ہیں 1362
اندر سے دیکھتا ہے یا باہر سے دیکھتا 1363
اس حاضر و غائب میں خلل ہے مرا ہونا 1364
جواب اور بھی دریا خیال ہو گئے ہیں 1365
بھلا سا تھا کوئی، نہیں اُس کا نام بھول گیا ہوں 1366
کسی لرزتے ہوئے ہمارے پہ چار تھا 1367

تماشا

○ احتساب 1370
تھی اگر ختم تو پھر بات بڑھائی کیوں ہو 1371
ہنسی خوشی میں جو اس رات وہ جدا ہوا ہے 1372
زمیں پہ ایڑیاں رگڑ کے پانی نکالتا ہوں 1373
شدید شور کے اندر، غبار کے پیچھے 1374

نفع سمجھو اسے یا خسارہ، بس اتنا ہی تھا 1375
وہ خواب انتظار بسر نہیں ہوا 1376
ہوا بھی ہو، اور گرد ور گرد خیال اس کے 1377
ہجر کے سارے عذابوں سے گزر جانا ہے 1378
مجھے شام تماشا سے نکالا کس لیے ہے 1379
چاند سا کوئی لب بام بھی آ جاتا ہے 1380
یہ دنیا ہے تو پھر اس کے کنارے کون سے ہیں 1381
سانسیں جو ہوئیں ختم، ہوا نے مجھے دیکھا 1382
کشتیاں رہتی ہیں دھارے سے الگ 1383
کیسے کیسے منظر مہتاب تھے چاروں طرف 1384
ڈھلا ہوا اُس کے قد و قامت سے بھی تھا 1385
جہاں نہیں کوئی اس خاکداں کے چاروں طرف 1386
دنیا کی طرف سے، کبھی عشق کی طرف سے 1387
دھویں میں تھوڑی ہوئی گفتگو زیادہ ہے اب کے 1388
کچھ اب کی بار بطرز دگر نکال رہا ہوں 1389
سفر کیا نہیں، رنج سفر ہی کچھ ہے 1390
سخت مشکل ہے کسی اور طرح کا ہونا 1391
اک بار الجھ کر وہ دوبارہ سے اُلجھا 1392
ہے اس بہت اپنے ہی آثار میں ہونا 1393
اپنے مشاغل سے یوں آپ جو فرصت میں ہیں 1394
وہی دریا تھا مگر، اور ہی گہرائی میں تھا 1395
اس مرے جسم نے اب تک تو سنبھالی مری جاں 1396
شرم سے دور، شرافت کے بغیر 1397
مصیبتوں کے مضافات سے نکال دیا 1398
تڑپ، اور جھگڑا تو ہونا ہی تھا 1399
شاید کسی موہوم اشارے پہ کھڑا ہوں 1400
ملتا نظر آئے بھی تو حاصل نہیں کرتا 1401
دُور دُور تک بہت اپنے ہمارے بھی ہوئے 1402
ناچار انتظار تمہارا ہی کرتے ہیں 1403
قیمت سے پرے، خواب خریدار سے ہٹ کر 1404

مشغول بیٹھا تھا مگر، یاد بھی تو نہیں نے کیا 1405
خیال اندر خیال کرنا پڑے گا اس کو 1406
باہر کے علاوہ ہے کہ اندر کے علاوہ 1407
پھر گزرتی مرے منشا کے مطابق 1408
اہل دنیا سے تو انکار کیا رکھتے تھے ہم 1409
اس دل کے اندھیرے ہیں تری ذات سے آگے 1410
مہربانی نہ عنایت کے لیے دیکھتا ہوں 1411
انجم نجم ہو اس کو دیکھنے کے لیے 1412
رونق رہ گئی ہے نہ تماشا کم ہے 1413
کیا خبر سلسلہ ناز ہی بدلا ہوا ہو 1414
جہاں کھڑا ہوں بہت ہی وہاں سے آگے ہے 1415
دیکھو تو کچھ زیاں نہیں کھونے کے باوجود 1416
توفیق کیوں نہیں، دیوار کے اندر کیا ہے 1417
بات جب ہے جو کسی کی بھی رسائی ہوئی ہو 1418
فقط الفاظ ہیں، الفاظ کی تاثیر غائب ہے 1419
دل کے اندر ہی تک ہے، مرا تک ہے 1420
یہ اپنی بات کا کوئی نیا مفہوم لیتا ہے 1421
کس طرف اور کہاں آ گئے ہے 1422
نظر سے دور و دور بنا نظر بھی آ جانا 1423
جتنا حاصل تھا نہیں اس سے سوا چھوڑ دیا 1424
محبت کا اعلان کرنا پڑا 1425
یہ بھی ہو سکتا ہے باتیں بھی مانے ہوئے ہوں 1426
ہم نے آواز دی برگ و نوا ہوتے ہوئے 1427
میرے جانے پہ آنے پہ نہیں ہے موقوف 1428
نفرت ہے کہ گزرا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم 1429
باہر حساب تھا کبھی اندر حساب تھا 1430
آگ بکاری ہے تو شعلہ سا لپکنے لگے ہم 1431
اُس کی یا بات ابھی سوچا ہی نہیں کرتے ہم 1432
باہر کے رنگ چھوڑ کے گھر واپس آئے گا 1433
یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہوں، تماشا ہی نہ ہو 1434

تھا اپنے ہی اندر کے اشارے سے نکلنا 1435
سنے رنگ بدلتے ہوئے آثار سے تھی 1436
غبارِ دل مری چشمِ ہنر میں کیا رہتا 1437
تنگئ صداقت کے مارے کی طرف سے 1438
ہمارا الجھنا ہے یا تمہارا الجھنا ہے 1439
مطلب اب مائل پرواز تو ہونے لگا ہے 1440
اس کے علاوہ اور بھی ہیں اس خدائی میں 1441
کہیں آ سکنے والے ہیں نہ ہم جا سکنے والے ہیں 1442
کشاکش میں ہیں نہ کسی ناصبوری پر کھڑے ہیں 1443
عجب ذکر تھا اور داستاں میں چھوڑ دیا 1444
عشق یہ کیا ہے کہ ہوتے ہوئے سائل میرے 1445
نظر آتے ہیں مری سر ہوا اتنا الجھتا ہے 1446
دل تو یکتا ہے دنیا بھی کسی اور کی ہے 1447
کچھ آتش معنی میں پگھلتا بھی نہیں ہوں 1448
کسی کے وصل کا سامان تو نہیں کیا ہے 1449
میں نے کب دعویٰ کیا تھا سر بسر باقی ہوں میں 1450
باہر نہیں رہا بھی اندر نہیں گیا 1451
ہوا ہی اور ہے سینچے بیانے ہو چکے ہیں 1452
ابھی نہیں کوئی غم روزگار چلتا ہے 1453
بدن بہار ہے پایاں ہیں تماشا ہے 1454
اس آئنے میں جھلکتے ہی دل دھڑکتے ہی 1455
کسی بھی طرح سے اقرار تو نہیں کیا تھا 1456
ڈھونڈو مجھے سمندر سے نکالنے کے آس پاس 1457
سمندروں میں سراسر پہاڑ جھونکتا ہوں 1458
جھگڑا کبھی خود سے کبھی دنیا سے رہا ہے 1459
میں ہوں برا سے نام ہوا ہے برا سے نام 1460
اثر بھی ہے تو کوئی شے اثر سے غائب ہے 1461
ناکام ہو ہوا کی سازش نہیں ہوئی 1462
بے نشاں تھا وہ اگر، اس کو نشاں کیسا کیا 1463
کچھ نہ کچھ کرتی ہوئی سا کچھ سنبھالی ہوئی ہے 1464
یہ سہولت ہی کوئی ہے نہ سہارا ہوتا 1465
جو سمندر ہے اسے کس لیے ساحل کرتا 1466
ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پیالہ ہی کرتے ہم 1467
جسے ہم ڈھونڈتے ہیں وہ کہیں پر بھی نہیں ہے 1468
بظاہر رنگ پیدا کر رہا ہوں 1469
تماشا ہونے والا ہے نہ وحشت کرنے والے ہیں 1470
کیا تو ہوگا مگر، وہ بار نہیں کیا تھا 1471
جو بھی ہے شب وصل کا ہنگام یہ غث ہے 1472
جہاں خواب کی کوئی خامشی ہے مری صدا سے بھری ہوئی 1473
گراں جانی ہی ہے، اور سنگساری نہیں آئی 1474
محبت ہو چکی، ملنا ملانا رہ گیا ہے 1475
پھر سرِ راہ کسی دوست کے مارے ہوئے ہیں 1476
کبھی آ کر وہ اگر شکل دکھا جاتا ہے 1477
خم زلف سیہ میں اس دل رنجور کا کھلنا 1478
کچھ ایسا ہے کہ اس کو بے سبب چاہوں جہاں چاہوں 1479
شاہِ زماں کا جو فرمان جنگ ہے 1480
آئیں گی ہر طرف سے صدائیں نئی نئی 1481
میری طرف جو اس کا ذرا سا جھکاؤ تھا 1482
پھر ذہن دائرۂ کار سے باہر ہوا 1483
ہجوم شہر کی حالت بیاں بھی کر سکتا 1484
کچھ ڈوبنے کی ہے نہ ابھرنے کی اطلاع 485
دل ہے کسی گماں کے یقیں سے بھرا ہوا 1486
دیکھا پھر اس کو دھوپ کنارے پڑے ہوئے 1487
خواہشوں کے جو خلاف تھے نہ خوابوں کے خلاف 1488
چراغ بجھ گئے سارے، چمن خراب ہوا 1489
ہماری تمہاری ملاقات جچتی نہیں 1490
کئی دن سے یہ کیسے آنکھوں میں آ رہا ہوں 1491
○ عرض: ڈاکٹر اظہر غوری 1504

ادبی منشیات

خدا کے فضل و کرم سے اُردو کے عام ادیبوں کی طرح ہم بھی مدح و تعریف کے معاملے میں خود کفیل ہیں۔ یعنی اپنی تعریف کرنے اور سننے میں اتنا انہماک رہتا ہے کہ کسی دوسرے کی تعریف کرنے یا سننے کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ لیکن جب بھی ظفر اقبال کی کوئی غزل یا کالم نظر آ جاتا ہے تو ہم اپنے طرزِ عمل اور طرزِ فکر میں تبدیلی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جو کام مجبوری سے کیا جائے وہ خوشی سے نہیں کیا جاتا۔ تاہم یہ سوچ کر ہم اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ جب اہلِ ثروت اپنے مال پر زکوٰۃ دیتے ہیں تو ہمیں بھی اپنے سرمایۂ مدح و تعریف کی زکوٰۃ نکالنی چاہیے۔ اگر اس بہانے کسی دوسرے کے کمالات کے اعتراف کا موقع مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لہٰذا ہم کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ ظفر اقبال ہمارے پسندیدہ شاعر اور کالم نگار ہیں۔

ہم اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ظفر اقبال شاعر اچھے ہیں یا کالم نگار۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ اُن کی غزل پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ کالم پڑھ رہے ہیں، اور کالم پڑھیں تو اُس میں غزل کا مزہ آتا ہے۔ اس لیے کہ غزل کی خوبیاں غزل ہی میں نکھر کر سامنے آتی ہیں اور کالم کے اوصاف کالم ہی کو نکھارتے ہیں۔ ظفر اقبال کی غزل کے بارے میں اپنے کسی سابقہ کالم میں ہم محمد حسین آزاد کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں کہ موصوف بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے، کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

ظفر اقبال کی کالم نگاری کے بارے میں بھی اگر محمد حسین آزاد کے حوالے سے بات کی جائے تو ''آبِ حیات'' میں بیان کردہ یہ واقعہ سنایا جا سکتا ہے۔ کسی محفل میں میرزا سودا نے ایک خان صاحب کی ہجو اُن کی موجودگی میں سنائی۔ خان صاحب نے ہجو پوری توجہ سے سُنی اور پھر خنجر

نکال کر میرزا سودا سے کہا: "میں نے تمھاری نظم سنی، اب تم میری نثر سنو"۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے خان صاحب کا غصہ ٹھنڈا کیا، ورنہ بھری محفل میں نظم اور نثر کے امتزاج سے نثری نظم کا فتنہ پیدا ہوجاتا اور ادبی تاریخوں میں خان صاحب کا نام نثری نظم کے بانی کی حیثیت سے درج کرنا پڑتا۔

خان صاحب موصوف نے "نثر" کا لفظ جس چیز کے لیے استعمال کیا تھا، وہی چیز ظفر اقبال کے پاس بھی ہے اور اسی کی نوک سے وہ کالم لکھتے ہیں۔ ہم خامہ بگوش ہیں تو وہ خنجر بگوش۔ فرق یہ ہے کہ خامہ ہمارا اپنا ہے اور کان بھی اپنا، ظفر اقبال کان دوسروں کا استعمال میں لاتے ہیں۔ مزید فرق یہ ہے کہ یہ خنجر بوقتِ ضرورت نادر شاہی تلوار بن جاتا ہے۔ نادر شاہ دوست دشمن میں تمیز نہیں کرتا تھا، ظفر اقبال کرتے ہیں۔ دشمن کو غصے سے اور دوست کو محبت سے ایک ہی گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

کچھ عرصے سے ظفر اقبال کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ موصوف نقاد بھی بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ نوادرات ادب کے بارے میں ان کے ایک مقالے پر کچھ عرصہ قبل ہم اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کا جو مقالہ ہمارے سامنے ہے، اس کا عنوان ہے "جدید اردو غزل اور نئی شعریات کی ضرورت"۔ پہلا مقالہ فکر انگیز تھا، مگر یہ خاصا تشویش انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ موجودہ شاعری ناقابلِ برداشت حد تک یکسانیت کا شکار ہوچکی ہے۔ اسے مسترد کر کے اس کی شکل و صورت کے ساتھ اس کے معیارات کو بھی تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

شاعری کی موجودہ صورتِ حال کی تصویر کشی انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے: "کتابیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں اور روایتی سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار ٹنوں کے حساب سے برآمد ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ روایتی انداز و اسلوب میں اب مشکل ہی سے اتنی گنجایش رہ گئی ہے کہ بہت زور لگا کر بھی عمدہ شاعر نکالا جاسکے...... ہماری زیادہ تر شاعری چوں کہ صنفِ غزل میں ہو رہی ہے، اس لیے بات غزل ہی کے حوالے سے آگے چلے گی۔ اسے ایک نیم وحشی صنفِ سخن بھی کہا گیا ہے، جب کہ میں خود غزل گو ہونے کے باوجود اسے ایک بے ہودہ صنفِ سخن بھی قرار دیتا ہوں اور وہ اس لیے کہ جو غزل آج لکھی جارہی ہے، وہ اساتذہ کی رنگا رنگ جگالی کے سوا اور کچھ نہیں"۔

ان سب باتوں سے ہمیں اتفاق ہے، مگر استاد لاغر مراد آبادی نے اپنا حق اختلاف محفوظ رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ہماری بہترین شاعری غزل ہی میں ملتی ہے۔ اگر یہ صنفِ سخن بے ہودہ ہوتی تو ظفر اقبال ہرگز اس کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بناتے۔ ہاں ان کی طبع آزمائی کے بعد غزل کی قلب ماہیت ہوگئی ہو تو دوسری بات ہے، لیکن اس کا بھی امکان نہیں، کیوں کہ ظفر اقبال نے اردو غزل کو ایک نئے اور تازہ لہجے سے آشنا کیا ہے۔

استاد گرامی نے مزید یہ فرمایا: ظفر اقبال چوں کہ الفاظ کو ماورائے لغت معانی بھی عطا کرتے ہیں، اس لیے ممکن ہے انھوں نے لفظ "بے ہودہ" کو اس کے برعکس معنی میں استعمال کیا ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو آیندہ ہر بے ہودہ کو کلا فخر گو سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

اردو غزل میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے ظفر اقبال یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ شاعری کا سارا سرمایہ ضائع کر دیا جائے، تاکہ شاعری کی عمارت نئی بنیادوں پر تعمیر کی جاسکے۔ فرماتے ہیں: "جہاں تک میری عاجزانہ کاوشوں کا تعلق ہے، تو میں ہر وقت اپنی جملہ شاعری کو مسترد کرنے کے لیے تیار رہتا ہوں، لیکن اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے اور کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو ایک مہم، ایک تحریک چلائی جاسکتی ہے اور برآمد شدہ منشیات کی طرح اس شاعری کو نذر آتش کر کے کوئی نئی طرح ڈالی جاسکتی ہے، کیوں کہ جب تک سابقہ جملہ شاعری تلف نہیں کی جائے گی، اس وقت تک مکمل طور پر اس سے قطع تعلق کے بغیر شاعری میں کوئی نیا بیج بویا ہی نہیں جاسکتا"۔

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں ایثار کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شاعر خود اپنی شاعری کو نذر آتش کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اپنی شاعری کی حد تک تو ظفر اقبال اپنی تجویز پر عمل کر سکتے ہیں، لیکن انھیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ دوسرے شاعر بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ بفرضِ محال اگر شعرا فروتنا راضی ہو بھی گئے تو ان کی شاعری کا وہی حال ہوگا جو آتش زدنی منشیات کا ہوتا ہے۔ اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ اتنے ٹن منشیات کو نذر آتش کر دیا گیا، لیکن نذر آتش ردی اخبار ہوتے ہیں، منشیات کو دوبارہ بازار میں فروخت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

ہم ظفر اقبال کے ایثار کی قدر کرتے ہوئے انھیں مخلصانہ مشورہ دیں گے، کہ وہ دوسروں کی شاعری کو بلا تکلف نذر آتش کر دیں، لیکن اپنی شاعری کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں، کیوں کہ جیسی اعلیٰ درجے کی شاعری انھوں نے اب تک کی ہے، ویسی کوئی دوسرا تو کیا، وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ غالب کی بہترین شاعری وہ ہے، جو انھوں نے پچاس برس کی عمر تک کی تھی۔ اس کے بعد تو وہ زیادہ تر نثر ہی لکھتے رہے۔ نثر انھوں نے اس لیے لکھی کہ ویسی شاعری وہ نہیں کر سکتے تھے، جیسی وہ

کر چکے تھے۔ شاعری کو نذرِ آتش کرنے یا ضائع کرنے سے ہمیں یوں بھی اتفاق نہیں ہے کہ جو کام آنے والے زمانے کو کرنا ہے، اُسے ہم کیوں انجام دیں۔ ہر کام اپنے وقت پر اور مناسب ہاتھوں سے انجام پانا چاہیے۔

ظفر اقبال نے نئی شعریات کی تشکیل کے لیے متعدد نکات پیش کیے ہیں، جن میں سرِ فہرست یہ ہے کہ شاعر زبان سے مغلوب نہ ہو، بلکہ اس پر غالب آ کر شعر کہے۔ گرامر کی پابندیوں کو توڑ دے، کیوں کہ اس طرح شعر زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ شعر میں کسی فعل، اسم یا مصدر کی شعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لفظ کے استعمال میں بقدرِ ضرورت من مانی کو روا رکھا جائے، کیوں کہ شعر میں ایک ہی لفظ کا غیر معمولی، غیر متوقع یا غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اُس کی کایا پلٹ سکتا ہے۔

ان باتوں کو سن کر ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر گرامر کی پابندیوں کو توڑنے سے شاعری بامعنی ہو سکتی تو انیس ناگی موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔ شعر اگر فعل، اسم اور مصدر کے بغیر مکمل ہو سکتے تو پھر بہترین شاعری بغیر لکھے وجود میں آ جاتی۔ لفظ کے استعمال سے من مانی روا رکھنے کی اجازت کے نتیجے میں جو شاعری لکھی جائے گی، اُسے من مانی ہی کہا جائے گا نہ کہ شاعری۔

''بعض لوگوں'' کی ان باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ظفر اقبال نے جو نکات پیش کیے ہیں، اُن پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرامر کی پابندیاں زبان اور شاعر کے ارتقا میں حارج ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال نے نہ صرف فعل، اسم اور مصدر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تجویز پیش کی ہے، ہمارا بس چلے تو ہم مذکر و مونث اور جمع و واحد کے قاعدوں کو بھی دریا برد کر دیں۔ جن چیزوں کی اصلیت ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے، اُن کے لیے اصول اور قاعدے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

جدید غزل کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں ظفر اقبال نے ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرماتے ہیں: ''یہ جو دُنیا بھر کی شاعری کے تراجم دُنیا بھر میں دھڑا دھڑ ہو رہے ہیں، تو غزل وہ واحد صنفِ سخن ہے، جس کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا سب سے زیادہ مُشکل ہے، کیوں کہ اس کے مخصوص اشارے اور اصطلاحات ترجمہ کی ہی نہیں جا سکتیں۔ چناں چہ میری ذاتی ناقص رائے میں جدید غزل کی نئی عمارت تعمیر کرتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھا جانا ضروری ہوگا کہ اس میں ایسی تبدیلیاں لانے کی بھی کوشش کی جائے کہ دوسری بین الاقوامی زبانوں میں اس کا ترجمہ بے حد مُشکل یا ناممکن نہ رہے۔ جدید غزل میں تسلسلِ خیال کی روایت پہلے ہی سے موجود ہے جو اس طرح بھی شکل پذیر ہو سکتی ہے کہ کسی بھی غیر ملکی شائق ادب کو اُس کا ترجمہ پڑھتے وقت کسی جھنجھلاہٹ کا احساس نہ ہو''۔

آج کل ہمارے ادیبوں میں اپنی تحریروں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرانے کا جو شوق ہوا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کسی تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے ترجمے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو آج کل کی نوے فی صد طبع زاد تحریروں پر ترجمے کا گمان گزرتا ہے۔ شاعروں کی اسی خواہش ترجمہ کا لحاظ کرتے ہوئے ظفر اقبال نے مذکورہ بالا تجویز پیش کی ہے۔ ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ آپ کی تجویز کردہ شعریات کے مطابق جو غزل وجود میں آئے گی، اُسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ غزل جتنی کسی اُردو جاننے والے کی سمجھ میں آئے گی، اُتنی ہی کسی اُردو نہ جاننے والے کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔

(26 فروری 1996ء) سخن در سخن، مرتبہ: مظفر علی سید

☆

مزاحیہ کسرِ نفسی

یہ فیصلہ کرنا مُشکل ہے کہ ظفر اقبال شاعر بڑے ہیں یا کالم نگار۔ جنھوں نے اُن کی شاعری پڑھی ہے، وہ اُن کی کالم نگاری کے حق میں نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جن اوقات میں ظفر اقبال بہترین شاعری کر سکتے تھے، اُن اوقات میں اُنھوں نے کالم نگاری کر کے اپنی بہترین شاعری کو منصۂ شہود پر آنے سے روک دیا۔ جن لوگوں نے اُن کے کالم پڑھے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ جس کٹھور نے یہ کالم لکھے ہیں، وہ شاعری کیا کرے گا کہ شاعری کے لیے نرم دلی و نرم خوئی بنیادی شرطیں ہیں۔ جنھوں نے ظفر اقبال کی شاعری اور کالم نگاری دونوں سے استفادہ کیا ہے، اُن میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کی یہ رائے ہے کہ وہ کوئی تیسرا کام کیوں نہیں کرتے؟ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ وہ صفِ اوّل کے شاعر ہی نہیں، اسی صف کے کالم نگار بھی ہیں۔ ہمارا تعلق اسی گروہ سے ہے اور ہم اُن کی نظم و نثر کے اس حد تک مدّاح ہیں کہ اُن کی اُن تحریروں کو بھی ادبِ عالیہ میں شمار کرتے ہیں جو ابھی لکھی بھی نہیں گئیں، کیوں کہ ہمارے نزدیک ادب کی سب سے بڑی خدمت لکھنا نہیں، نہ لکھنا ہے۔

ہم جب ظفر اقبال کی شاعری پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے، اُن سے پہلے اُن جیسا شاعر نہیں گزرا اور جب اُن کے کالم پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلی مرتبہ کوئی ڈھنگ کی چیز پڑھ رہے ہوں۔ ممکن ہے ظفر اقبال کے بدخواہ ہمارے اس بیان کو ہماری کم نظری پر محمول کریں، لیکن ہمیں اس کی پروا نہیں۔ ہم اُن بدنظروں سے پھر بھی اچھے رہیں گے جنھیں دُوسروں کی کوئی خُوبی نظر نہیں آتی۔

یگانہ نے کہا تھا:

تُو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اُٹھا، اپنے بل پہ کٹتا جا

یگانہ کی شاعری اُس کی سپر بھی تھی اور شمشیر بھی، لیکن ظفر اقبال نے شاعری سے یہ یک وقت دو کام نہیں لیے۔ اس سے اُنھوں نے صرف سپر کا کام لیا ہے۔ شمشیر کا کام وہ کالم نگاری سے لیتے ہیں۔ شاعری سپر اس لیے ہے کہ وہ اُن کی شخصیت کے جمال کو دُنیا کی آلائشوں سے بچائے رکھتی ہے۔ کالم نگاری سے اُن کی شخصیت کے جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ شمشیر اندھے کی لاٹھی کی طرح چلتی ہے جو گناہ گار اور بے گناہ میں امتیاز نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ظفر اقبال سے لوگ محبت کرتے ہیں، جب کہ کالم نگار ظفر اقبال سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنے والے صرف اسلام آباد، لاہور اور اُن شہروں کے مضافات میں پائے جاتے ہیں کہ اُن کے کالم انھیں علاقوں میں پڑھے جاتے ہیں، لیکن ظفر اقبال سے محبت کرنے والے ہر جگہ نظر آتے ہیں، جہاں اُردو زبان کا چلن ہے۔ اُن کی شاعری کو دُنیاے ادب میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے۔

پُرانے زمانے میں شاہی سکوں پر شعر لکھے جاتے تھے، مگر ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے شعر ہی کو سکے میں ڈھال دیا۔ پاکستانی سکے کی قیمت آئے دن گرتی رہتی ہے، مگر ظفر اقبال کی ادبی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکوں کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب ڈالر کے مقابلے پر ہمارے پاس یہی سکہ رہ جائے گا۔ اسٹیٹ بینک بھی چھوٹے نوٹوں کی جگہ ظفر اقبال کے شعر جاری کیا کرے گا۔ بڑے نوٹوں کی جگہ اس لیے نہیں کہ آخر عالی صاحب کے نغموں سے بھی تو کوئی کام لینا ہوگا۔

بلاشبہ ظفر اقبال پاکستان میں خاصے مقبول ہیں، مگر مشاعروں میں شرکت کرتے رہنے کی وجہ سے مشاعروں سے باہر اُن کی شاعری کی اتنی قدر نہیں ہوتی جتنی کہ ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں اُنھوں نے کبھی کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا۔ اس لیے وہاں اُن کے قدردانوں کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہاں اُن کی پرستش کی جاتی ہے تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ پاکستان کے دو ہی شاعر وہاں مقبول ہیں، ایک اقبال اور دُوسرے ظفر اقبال۔ بعض لوگ تو فرطِ عقیدت سے دونوں کا نام ایک ہی سانس میں لیتے ہیں، تو دونوں ناموں کو ملا کر ''علامہ ظفر اقبال'' کہتے ہیں۔ ایک پاکستان ہے کہ جہاں اقبال اکیڈمی کا نام بھی صرف اقبال اکیڈمی ہے، حال آں کہ اُس کے کاموں کا معیار اتنا اُونچا ہے کہ اگر اُسے ظفر اقبال اکیڈمی کہا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

ہندوستان میں جدید ادب کے بارے میں جہاں کہیں گفتگو ہوتی ہے، ظفر اقبال کا حوالہ ضرور آتا ہے۔ ہندوستانی نقادوں نے جتنے مضمون ظفر اقبال پر لکھے ہیں، اُتنے پاکستانی نقادوں نے نہیں لکھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں نقاد دوا کے طور پر بھی دستیاب نہیں، جب کہ ہندوستان میں ہر مرض کی دوا بلکہ سب ہی نقاد ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے نقاد شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے ممدوح کے سب سے بڑے مداح ہیں اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ فاروقی جس شاعر کی تعریف کر دیں، اُس کی دُنیا تو کیا، عاقبت بھی سنور جاتی ہے، یعنی وہ دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ فاروقی نے ''شعرِ شور انگیز'' کے نام سے کلامِ میر کی جو شرح لکھی ہے، اُس میں جگہ جگہ ظفر اقبال کے شعر میر کے شعروں کے بالمقابل پیش کیے گئے ہیں۔ اگر یہ شرح میر کی زندگی میں لکھی جاتی تو یہ اُن کی زندگی کا دُوسرا صدمہ ہوتا۔ پہلا صدمہ دِلّی کا اُجڑنا تھا جسے وہ برداشت کر گئے، مگر دُوسرا صدمہ آخری صدمہ بن جاتا کہ اپنے شعروں کے بالمقابل ظفر اقبال کے شعر دیکھنا، قیامت سے کم نہ ہوتا۔

''شعرِ شور انگیز'' میں ذکرِ میر کے ساتھ اپنا ذکر دیکھ کر ظفر اقبال اتنے خوش ہوئے کہ اُنھوں نے سرخوشی کے عالم میں شمس الرحمٰن فاروقی کو ایک خط لکھا، جو مکتوب الیہ نے مزید خوشی کے اظہار کے طور پر اپنے رسالے ''شب خون'' میں شائع کر دیا۔ اس خط میں ظفر اقبال لکھتے ہیں: ''جا بہ جا اپنا تذکرہ دیکھ کر یقین ہُوا کہ اقربا پروری کی روایت پُوری طرح جاری و ساری ہے''۔ یہ خط پڑھ کر ''شب خون'' کے ایک قاری نے فاروقی کو خط لکھا کہ آخر کار اُردو تنقید میں اقربا پروری کی روایت کا اعتراف اُس شخص نے کر ہی لیا، جس کی وجہ سے یہ روایت پروان چڑھ رہی ہے۔ فاروقی نے یہ خط بھی چھاپ دیا اور ساتھ کے ساتھ یہ جواب دیا: ''جناب عالی کو ظفر اقبال کی عبارت سمجھنے میں

غلطی ہوئی۔ انھوں نے مزاح المومنین سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ تم نے جو اپنی کتاب میں جگہ جگہ میرا ذکر کیا ہے تو وہ برِ بنائے محبت و مؤدت ہے۔ یعنی انھوں نے مزاحیہ کسرِ نفسی کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا اور آپ سمجھ بیٹھے کہ ظفر اقبال واقعی خود کو نا اہل سمجھتے ہیں اور واقعی مجھے دوست نوازی کا مورد ٹھہرا رہے ہیں"۔

ہم اس خط و کتابت پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے ظفر اقبال کے خط کے مطالب کی اس عمدگی سے شرح کر دی ہے کہ مزاح المومنین یا مزاحیہ کسرِ نفسی سے مزید کام لینے کی گنجایش نہیں رہی، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ظفر اقبال کی عام نثر بھی شرح کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اُن کی عام نثر تو اتنی مزے دار ہوتی ہے کہ پڑھنے والا پہلے اُنگلیوں کو چاٹتا ہے اور پھر کاٹتا ہے۔ مزے دار ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس بھی اتنی ہوتی ہے کہ لفظوں سے پہلے اُن کے معانی ذہن میں آجاتے ہیں۔ اُن کی نثر میں اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں، مگر فی الحال ہم اُن سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ سارے راز ایک ہی بار نہیں اُگل دینے چاہییں۔ آیندہ بھی تو ظفر اقبال پر ہمیں کالم لکھنے ہوں گے۔ کچھ نکتے اُن کے لیے بھی محفوظ رہیں تو اچھا ہے۔

ظفر اقبال کی خوب صورت نثر کا تازہ ترین مجموعہ "خشتِ زعفران" ہے۔ یہ لاہور کے روزنامہ "پاکستان" میں 1993ء میں چھپنے والے کالموں کا انتخاب ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سیاسی موضوعات پر لکھے گئے کالم سیاست سے بھی زیادہ بے مزہ ہوتے ہیں، لیکن ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ بے مزہ طرحی مصرعوں پر بھی مزے دار غزلیں لکھ دیتے ہیں۔ سیاسی موضوعات پر لکھنے میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ خبروں کی طرح کالموں کی بہارِ جاں فزا ایک ہی دن کے لیے ہوتی ہے، بلکہ بیشتر کالم تو اُن غنچوں کی طرح ہوتے ہیں جو بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں، مگر ظفر اقبال صرف آج ہی کے قاری کے لیے نہیں لکھتے، اُن کی نظر میں آنے والے کل کا قاری بھی ہوتا ہے۔ یہ اہتمام اُن کے کالموں کو صحافت کے بجائے ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال سے ہوگی۔

پاکستان میں نام نہاد جمہوری حکومتوں نے آئین سے جو کھلواڑ روا رکھی ہے، اُس پر لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں بہت کچھ لکھا ہے، مگر ظفر اقبال نے اس معاملے میں جو رائے ظاہر کی ہے، وہ سب سے مختلف ہے: "اس میں کوئی شک نہیں کہ جلسے جلوس نکالنا اور نعرے بازی اپوزیشن کا آئینی حق ہے، لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان بھی آئین کو گھسیٹ لانا کوئی اچھی

روایت نہیں ہے۔ اُن سے آئین کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایک قوم کو آئین وغیرہ کا اس حد تک پابند اور غلام بنا دینا بھی قابلِ رشک صورتِ حال نہیں ہے، جب کہ آئین کو محفوظ کرنا بجائے خود ایک آئینی تقاضا ہے، نہ کہ کثرتِ استعمال سے یہ دستاویز گھس گھسا کر ویسے ہی غائب ہو جائے"۔

ویسے تو اُردو کی ہر کتاب گوناگوں نقائص کا مجموعہ ہوتی ہے، مگر ظفر اقبال کو "خشتِ زعفران" میں ازراہِ انکسار صرف دو نقص نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "اگر اس مجموعے میں دو نقص نہ رہ گئے ہوتے تو یہ ایک بہتر کتاب ہو سکتی تھی۔ یعنی ایک تو کالموں کا انتخاب میں نے خود کیا ہے اور دوسرے اس کا مصنف بھی میں ہوں"۔

جہاں تک پہلے نقص کا تعلق ہے، اُس سے بچنا ممکن نہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص ان کالموں کا انتخاب نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اس کام کے لیے سیکڑوں کالموں کو پڑھنا پڑتا اور پھر بھی اس کا امکان رہتا کہ دُرِ مقصود ہاتھ نہ آتا۔ پڑھنا ایک مشکل کام ہے اور مشکل کاموں سے لوگ بچتے ہیں اور محنت سے جی چُراتے ہیں۔ ظفر اقبال خود ہی اس ہفت خواں کو خوش اسلوبی سے طے کر سکتے تھے، کیوں کہ ہر لکھنے والے کو اپنی تحریروں میں اپنے عیب دکھائی نہیں دیتے، جب کہ دوسروں کے نظر میں آجاتے ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسروں کی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت لوگ تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہزاروں صفحات میں سے دس بیس صفحات ہی اُن کی نظر میں لائقِ انتخاب ٹھہرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب کوئی ادیب خود اپنی تحریروں کا انتخاب کرتا ہے تو فراخ دلی سے کام لیتا ہے۔ فراخ دلی کسی بھی ادیب کا بنیادی وصف ہے، جو اس سے محروم ہوگا، اُس کے لیے اعلیٰ ادب تخلیق کرنا تو کیا اعلیٰ ادب کا انتخاب کرنا بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

ظفر اقبال نے اپنی کتاب کا جو دوسرا نقص بتایا ہے، اُسے بآسانی دور کیا جا سکتا تھا۔ یعنی کتاب میں شامل کالم کسی بہتر شخص سے لکھوائے جا سکتے تھے۔ اب تو ظفر اقبال ایک بڑے علمی ادارے اُردو سائنس بورڈ کے سربراہ ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے ادارے میں کالم نگار کی ایک اسامی پیدا کر کے کسی اچھے کالم نگار کا تقرر کر سکتے ہیں۔ علمی اداروں میں یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ کام کوئی کرتا ہے، نام کسی کا ہوتا ہے۔ مگر ہمیں معلوم ہے ظفر اقبال اس تجویز پر عمل نہیں کریں گے، کیوں کہ وہ صرف اُس تحریر پر اپنا نام دیکھنا پسند کرتے ہیں جو انھوں نے خود لکھی ہو۔ ظاہر ہے اس کتاب کا دوسرا نقص بھی دور نہیں ہو سکتا۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کتاب

کو اس کے دونوں نقائص کے ساتھ قبول کر لیا جائے اور باقی نقائص کی ذمہ داری کا تعین قارئین پر چھوڑ دیا جائے۔

البتہ ایک سوال کا جواب قارئین پر نہیں چھوڑا جا سکتا کہ ظفر اقبال کا سائنس سے کیا تعلق ہے، جو انھیں سائنس بورڈ کا سربراہ بنایا گیا۔ اس کا جواب صرف کشور ناہید دے سکتی ہیں، جن کے بارے میں یہ اطلاع ملی ہے کہ انھیں اٹامک انرجی کمیشن کا سربراہ بنایا جا رہا ہے۔

(26 ستمبر 1996ء): سخن در سخن، مرتبہ: مظفر علی سید

-☆-

وغیرہ

35 برسوں سے ہم ظفر اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ واحد شاعر ہے جس کا دریائے سخن سال بھر طغیانی پر رہتا ہے۔ طغیانی کا نتیجہ تعمیر و تخریب، دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ تعمیر یہ کہ اطراف دریا کی پیاسی زمینیں دور دور تک سیراب ہو جاتی ہیں، اور تخریب یہ کہ طغیانی کی زد میں آنے والی بستیاں اگر مستقل طور پر تباہ نہیں ہوتیں تو شکست و ریخت کے عمل سے ضرور گزرتی ہیں۔ ظفر اقبال کے دریائے سخن نے جہاں نئے نئے پھول کھلائے ہیں، وہیں پرانے درختوں کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

ظفر اقبال بنیادی طور پر کلاسیکی روایت کا غزل گو ہے۔ اس نے اسی روایت کے سائے میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور بہت جلد اپنے لیے ایک الگ لہجہ دریافت کر لیا۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ نئے خیال کے لیے نئی زبان کی بھی ضرورت ہے۔ بس یہیں سے اس نے زبان کے مروجہ اسالیب سے اپنا راستہ الگ کر لیا اور زبان و قواعد زبان کے ساتھ اس بے تکلفی کا آغاز کیا جس نے اس کی شاعری کو شاعری سے زیادہ لسانی تجربہ گاہ بنا دیا۔ اس تجربہ گاہ میں لفظوں کو مسخ کیا گیا، قواعد کے اعتبار سے ان کے استعمال کی صورتیں تبدیل کی گئیں، اور اس تغیر و تبدل کے عمل کے دوران لفظ و معنی کے باہمی ربط کو بھی مجروح کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ظفر اقبال شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اسی شان سے داخل ہوا جس شان سے محمد حسین آزاد نے غالب کو داخل ہوتے دکھایا ہے۔ یعنی: ''بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے''۔

واہ واہ کرنے والوں میں دو طرح کے لوگ شامل تھے۔ ایک تو وہ جنھوں نے طنزاً صدائے تحسین بلند کی اور دوسرے وہ جو ظفر اقبال کے لسانی اجتہادات پر صدق دل سے ایمان لے آئے۔ اُن میں وہ شاعر بھی تھے جنھوں نے ظفر اقبال کی پیروی میں لسانی توڑ مروڑ کو اپنا شعار بنایا اور اُن کا وہی حشر ہوا جو جھوٹے نبیوں پر ایمان لانے والوں کا ہوتا ہے۔ ظفر اقبال خود تو فائدے میں رہا کہ لسانی اجتہاد والی شاعری کے ساتھ ساتھ کلاسیکی انداز میں بھی شعر کہتا رہا، لیکن اُس کے مقلد نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ ظفر اقبال آج اُردو غزل کا ایک اہم نام ہے اور اُس کے مقلد گمراہانِ جادۂ سخن کی حیثیت سے نقش و نگار طاقِ نسیاں بن چکے ہیں۔ اب اگر خود ظفر اقبال بھی چراغِ رُخِ زیبا لے کر انھیں تلاش کرنے نکلے تو ناکام رہے گا۔

ظفر اقبال نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام ''آبِ رواں'' میں دوسروں سے الگ جو لہجہ دریافت کیا تھا، وہ اُس کے پچھلے مجموعۂ کلام ''عیب و ہنر'' میں بے مثال لہجہ بن گیا ہے۔ اس مجموعے میں لسانی اجتہاد کا ''ہوکا'' پہلے جیسی شدت کے ساتھ موجود نہیں ہے، لیکن کلاسیکی روایت سے تعلق اس روایت کی توسیع کی صورت میں اس طرح ظاہر ہوا ہے کہ اُردو غزل اپنی وسعتوں کے ایک نئے مدار میں داخل ہوتی نظر آ رہی ہے۔

اقتباس: ہفت روزہ تکبیر

20 اپریل 1995ء

-☆-

حسین حقانی کے نام

نشاں دور است غالبؔ در سخن ایں شیوہ بس نبود

بدیں زوریں کماں می آزمایم دست و بازو را

بازار بھی ایک راستہ ہے

ظفر اقبال نے اپنی تازہ کتاب (جس کا ابھی کوئی نام نہیں رکھا گیا[1]) کا جو مسودہ مجھے پڑھنے کے لیے دیا ہے، اس کی آخری غزل کے آخری شعر سے، جو اتفاق سے مقطع بھی ہے، میں بات شروع کرنا چاہتا ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مجھے دریا کی اُلٹی طرف تیرنے کا شوق ہے۔ شاید اُتنا نہیں جتنا ظفر اقبال کو ہے۔ مگر یہ مسئلہ صرف مقداری ہی نہیں معیار کا بھی ہے۔ میں نامانوس معانی کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہوں اور ظفر نامانوس لفظیات کی طرف راغب ہے۔ شعر یہ ہے:

معانی سے ظفر رشتہ نہیں کوئی بھی جس کا
مرے سر میں وہی لفظوں کا پیکر گھومتا ہے

میں اس شعر کے سارے معانی تو بیان نہیں کر سکتا، اور یہ شاید ممکن ہونا بھی نہیں، مگر یہ سوال تو بہرحال اُٹھایا گیا ہے کہ معانی اور لفظ کا رشتہ متعین رشتہ نہیں ہے اور بسا اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے درمیان کوئی رشتہ موجود ہی نہ ہو۔ شاعری میں معانی کی وہ سطح ہوتی بھی نہیں جو علوم کے اندر ہوتی ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا شعر یا کوئی ایسی نظم پڑھیں، جو آپ پر اثر انداز تو ہو مگر آپ یہ متعین نہ کر سکیں کہ اس میں کیا کہنے کی کوشش کی گئی ہے، تو یہ اُس شاعری سے کہیں بہتر صورت حال ہوگی، جس کی چاروں چولیں کسی ہوئی ہوں اور اس کے معانی کلاس رُوم میں بیان کیے جا سکتے ہوں۔

شاعری اصل میں معلوم اور نامعلوم کے درمیان کہیں موجود ہوتی ہے۔ اگر آپ وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں جو سب کو پہلے سے معلوم ہے تو وہ شاعری کے زُمرے میں نہیں آتا، لیکن اگر آپ کوئی ایسی بات کہنا چاہیں جو کسی کو بھی معلوم نہ ہو تو وہ کہی کیسے جا سکتی ہے۔ لہٰذا

[1]۔ جب دیباچہ نگار کو مسودہ دیا گیا تھا، تب کتاب کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔

شاعری میں دریافت کا یہ عمل معلوم اور نامعلوم کے درمیان ایک مسلسل سفر ہے۔ جس دُنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کے بارے میں ہم کافی کچھ جانتے ہیں، مگر بہت کچھ نہیں جانتے۔ یہ دُنیا ہمارے لیے اسی لیے مثالی دُنیا ہے کہ اسے دریافت کیا جا سکتا ہے، ہزاروں برس سے اسے دریافت کیا جا رہا ہے، اور شاید آیندہ بھی یہ امکان نہیں کہ دریافت کا عمل کبھی ختم ہو جائے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر شاعری کی گنجایش نہیں رہے گی اور شاید جینا بھی حیرت اور مسرت سے خالی ہو جائے گا۔

ظفر اقبال دو دُنیاؤں کا باسی ہے ایک طرف تو وہ زبان و بیان کے تمام قواعد و ضوابط کا پُوری طرح خیال رکھتا ہے، جب تنقید لکھتا ہے تو کسی کو اتنی گنجایش بھی نہیں دیتا کہ وہ تھوڑی بہت رُوگردانی کر سکے۔ مگر دُوسری طرف وہ لفظیات کے بہت سے پیمانے توڑ دیتا ہے۔ اُس کی شاعری کی دُنیا بھی بیل کے دو سینگوں پر کھڑی ہے، ایک سینگ روایت کا ہے اور دُوسرا امکان کا ہے۔ اُس کی شاعری ان دو سینگوں کے درمیان لُڑھکتی رہتی ہے۔ کبھی ایک طرف اور کبھی دُوسری طرف۔ وہ شاید یہ فیصلہ کرنا بھی نہیں چاہتا کہ اُسے دونوں میں سے کون سا سینگ پسند ہے۔ ممکن ہے دونوں ہی اُسے پسند ہوں، اور ممکن ہے ایک بھی اُسے پسند نہ ہو۔

اُسے اپنے خلاف باتیں کرنے کا چسکا ہے، روایتی طور پر تو شعرا تعلّی کی طرف راغب رہے ہیں، مگر ظفر اقبال کے ہاں ردِ تعلّی کا رویّہ موجود ہے۔ وہ اپنے آپ کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کرتا ہے، جیسے بچّے اپنی ہی تصویر پر مونچھیں اور ڈاڑھی لگا دیتے ہیں۔

جب چھٹی دہائی کے اوائل میں میں پہلی بار گورنمنٹ کالج کی مجلسِ اقبال کی ایک محفل میں اُسے ملا تھا اور اُس کے اشعار سُنے تھے تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس میں شعر کہنے کی صلاحیت بلاخیزی کی حد تک ہے۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں شعر کہنے والے بہت لوگ تھے، سُنا ہے پاکستان بننے سے پہلے بھی ایک ایسی ہی کھیپ اس کالج میں آئی تھی اور اُنھوں نے جدید نظم کو آگے بڑھانے میں زبردست کردار ادا کیا تھا، نام گنواؤں تو خدشہ ہے کہ بہت سے نام رہ جائیں گے۔ مگر جو نام اس وقت یاد آ رہے ہیں اُن میں صفدر میر، ضیا جالندھری اور الطاف گوہر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُس زمانے میں حلقہ اربابِ ذوق کو قائم ہوئے شاید چار پانچ برس ہوئے تھے، مگر میرا جی لاہور شہر میں موجود تھے۔ اور اُن جیسا شاعری میں کھویا ہُوا آدمی شاید اُردو ادب کو کبھی میسّر نہیں آیا۔ وہ خاص طور پر نظم، نظم کی تنقید اور

نظم کے امکانات کے رسیا تھے، لہٰذا اُن کو صحیح معنوں میں جدید نظم کا محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔
اس بات کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ گورنمنٹ کالج اور حلقہ ارباب ذوق لاہور میں کوئی رشتہ موجود نہ ہونے کے باوجود، ایک گہرا رشتہ موجود رہا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اور پاکستان بننے کے بعد بھی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے سارا زور جدید نظم پر تھا اور پاکستان بننے کے بعد یہ بہاو غزل کی طرف مراجعت کر گیا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد ادبی صورت حال اب سے بہت مختلف تھی۔ ترقی پسندی ایک تحریک کے طور پر بے حد فعال تھی اور لکھنے والے جوق در جوق اُس میں شامل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جو لوگ اُس میں شامل نہ ہوتے تھے، اُن کو رجعت پسند کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ کچھ برس تو ایسے بھی گزرے جب ترقی پسند رسالوں نے غیر ترقی پسندوں کو چھاپنے سے بھی انکار کر دیا۔ اُس زمانے میں سعادت حسن منٹو کا لاہور میں ہونا کئی لحاظ سے بہت اہم تھا۔ پھر اُس زمانے میں حسن عسکری بھی لاہور ہی میں تھے۔ اُن دونوں نے مل کر ایک رسالہ بھی نکالا تھا اور حسن عسکری نے 'ادب برائے ادب' کے سلسلے میں ایک مضمون حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا تھا، اور ایک دم 'ادب برائے زندگی' اور 'ادب برائے ادب' کی بحث میں گرمی آ گئی تھی۔

اُن دنوں غزل ایک معتوب صنفِ سخن تھی۔ غزل کے خلاف تو بہت کچھ کہا گیا تھا، مگر اس کے حق میں کوئی کوئی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ حفیظ ہوشیار پوری اپنے غزل گو گروہ کے ساتھ عام طور پر رجعت پسند کہے جاتے تھے۔ اُس گروہ میں ناصر کاظمی بھی شامل تھے۔ ایک چھوٹی سی دُنیا سیف الدین سیف اور اُن کے گرم جو دوستوں نے بھی بسا رکھی تھی جو ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہ رکھتی تھی۔ پاکستان بننے سے کچھ ماہ پہلے سیف الدین سیف نظمیں لکھتے لکھتے نہ جانے کیوں غزل کی طرف راغب ہوئے تھے۔ اُنھوں نے شورش کاشمیری اور غلام محمد بٹ کے ساتھ مل کر ترقی پسند تحریک پر بند باندھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

یہ سب کچھ ایسے تناظر میں ہو رہا تھا جو خون آلود تھا۔ ابھی مہاجرین کے قافلے ہندوستان سے آ رہے تھے اور لہو کی لکیر بھی ابھی پوری طرح خشک نہیں ہوئی تھی۔

اُن حالات میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ غزل اپنے اقداری نظام کو قائم رکھتی، اس سے پہلے بھی اردو غزل میں ردِ غزل کے رویے موجود تھے، غزل چوں کہ اپنے لیے ایک معاشرتی اور مابعد الطبیعاتی نظام تشکیل دینے کا حوالہ ہمہ وقت رکھتی ہے، لہٰذا اس کے سلسلے میں ردِ عمل

کا اظہار بھی ممکن ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا بھرپور ردِ عمل نظیر اکبر آبادی میں ظاہر ہُوا، جس نے نہ صرف نظم کی طرف رجوع کیا، بلکہ خود غزل کے اندر وہ رویے اپنائے جو کلاسیکی غزل کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ پھر حالی نے بھی اس سلسلے میں پیش رفت کی، مگر اب اُن کے پاس انگریزی ادب کا حوالہ کسی نہ کسی حد تک موجود تھا۔ لہٰذا غزل کے مابعد الطبیعات کو نظم کی نیچرل فلاسفی کے ساتھ بدلنے کی کوشش کی گئی، اگرچہ حالی کے خیالات نے اردو شاعری کو بہت متاثر کیا، مگر خود غزل کے اندر ایک نظامِ فکر کے طور پر کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی، اقبال نے غزل کے مابعد الطبیعاتی نظام کی قدری فوقیتوں (Heirachy Values) کو تبدیل کر دیا، اور ایسی غزل لکھی جسے غزل کے کلاسیکی نقاد غزل ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اقبال نے خود بھی اُسے غزل کا نام نہیں دیا۔ بہر حال اُسے نام دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو، وہ ہے تو غزل ہی، کیوں کہ غزل کی ہیئت سے انحراف نہیں کیا گیا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب اقدار کی توڑ پھوڑ کا عمل وسیع پیمانے پر ہُوا تو اقبال کی غزل کی مثال موجود تھی۔ پہلے ردِ عمل کے طور پر جدید غزل نے مابعد الطبیعاتی نظام کے خلاف آواز اُٹھائی، بہت سے شعرا نے ترقی پسندی کو بطور ردِ عمل قبول کیا، ترقی پسند تحریک کے ساتھ ایک طرح کی انسان پسندی (Humanism) بھی منسلک ہو گئی تھی، لہٰذا ایک نظامِ فکر سے نکلنے کے بعد اُن کو دوسرا نظامِ فکر فوری طور پر میسّر آ گیا، اُن کی مثال اُن مہاجرین کی سی تھی، جنھیں پاکستان میں داخل ہوتے ہی گھر بھی مل گیا اور کاروبارِ زندگی کی سہولتیں بھی فراہم ہو گئیں۔ مگر جو لوگ بوجوہ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، اُن کے پاس فوری راستہ جدید نفسیات کی طرف جاتا تھا، چند برس پہلے انسان کے بارے میں نفسیات نے کچھ چونکا دینے والے انکشافات کیے تھے، اور اُن کے تاثرات اُردو افسانے میں خاص تیزی سے در آئے تھے، لہٰذا پہلے ردِ عمل کے طور پر ممنوعات کو توڑنے کی کوشش کی گئی، چناں چہ ظفر اقبال نے کہا:

پھرتا ہوں بازار میں رُک جاؤں لیتا چلوں
اس کی خاطر بریزیز، اپنے لیے دوائیاں

☆

سخت بیوی کو شکایت ہے جہانِ نو سے
گاڑی چلتی نہیں گر جاتا ہے پہلے سگنل

(سلیم احمد)

شہزاد جس شکار کا میں منتظر رہا
دیکھا اُسے تو تیر نہ نکلا کمان سے

(شہزاد احمد)

اس سلسلے میں ظفر اقبال کی کتاب 'گلافتاب' کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، اس کتاب میں نہ صرف بعض نفسیاتی عوامل کی طرف اشارے موجود ہیں، بلکہ لفظیات کے اندر بھی توڑ پھوڑ دیکھی جا سکتی ہے، اس میں کچھ ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو پہلے سیدھے سادھے انداز میں شائع ہوئیں اور بعد میں اُن کے اندر لسانی ردّوبدل کیا گیا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لسانی تجربہ ایک شعوری کوشش ہے، پھر ظفر اقبال نے یہ کوشش بھی کی کہ مُلک کی علاقائی زبانوں (جنھیں اب قومی زبانیں کہنے پر اصرار کیا جاتا ہے) کے الفاظ بھی اُردو غزل میں استعمال کیے جائیں، اس کا اظہار ظفر اقبال نے 'گلافتاب' کے فلیپ میں بھی کیا تھا، مگر اس سلسلے میں مُشکل یہ ہے کہ اس کام کو صرف ادیب یا شاعر ہی سرانجام نہیں دے سکتے، خود مُعاشرے کے اندر اس طرح کا لین دین ہونا چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کی زبان کو قبول کرتے چلے جائیں، شاید اُردو زبان کے وجود میں آنے کی ایک وجہ محمد تغلق کا دکن کی طرف سفر کرنا بھی تھا، مگر موجودہ صورتِ حال میں ہم کسی اجتماعی لسانی تجربے کی طرف سفر کرنے کے بجائے اپنی اپنی زبانوں میں سکڑتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ یہ مُعاشرتی عمل تیز تر بھی ہو اور تخلیقی بنیادوں پر بھی ہو، مگر خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ جہاں تک ظفر اقبال کا تعلق ہے، جو اپنی نیک خواہشات کے باوجود اس مثالیت کو عملی جامہ نہ پہنا سکا، البتہ 'گلافتاب' کے بعد اُس کے لسانی تجربات ابھی ختم نہیں ہوئے "رطب و یابس" میں ان کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے، اور حال ہی میں ظفر اقبال نے اس سلسلے میں کچھ تازہ کلام بھی لکھا ہے۔

ظفر اقبال اُن گنے چنے شعرا میں سے ہے، جن کا پہلا مسئلہ شاعری ہے، یہ دُرست ہے، وہ کالم بھی لکھتا ہے، روٹی کمانے کے لیے بھی اُسے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے، مگر یہ سب چیزیں ثانوی ہیں، وہ سرتاپا شاعری میں ڈوبا ہُوا شخص ہے، اور جہاں تک میرا اندازہ ہے اُسے شاعری کے علاوہ کچھ پڑھنا بھی پسند نہیں۔ جہاں تک اُس کی لطیفہ گوئی اور لطیفہ نگاری کا مُعاملہ ہے، وہ بھی شاعری ہی کا ایک حصّہ ہے، کیوں کہ اس میں ایسے ہی نازک اشارے موجود ہوتے ہیں، چناں چہ ظفر اقبال جب یہ کہتا ہے کہ اُس کی کالم نویسی اُس کی شاعری کی توسیع (Extension) ہے، تو مجھے اس بیان پر حیرت نہیں ہوتی، فرائیڈ نے بھی خوابوں اور روزمرہ کی زندگی کے مُطالعات کے دوران یہ دریافت کیا تھا، علامت بننے کا عمل مزاح اور خواب میں ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے لیے کسی طرح کی مقصدیت یا ہدف قبول نہیں کیا۔ وہ اپنی شعری فضا کو پہلے سے مُتعین نہیں کرتا، اور پہلے سے یہ فیصلہ بھی نہیں کرتا کہ اُس نے شاعری سے شاعری کے علاوہ کوئی اور مقصد بھی حاصل کرنا ہے، اقبال کے ہاں جو مقصدیت در آئی ہے، وہ اس لیے اعلیٰ ترین شاعری کے زُمرے میں آتی ہے کہ اقبال نے اُسے دریافت کیا ہے، مگر بہت سے ترقی پسند شاعروں نے اپنی مقصدیت کو صرف قبول کیا، اُن کی مقصدیت نہ اُن کے لیے تجربہ ہے، نہ دریافت ہے۔ شاعری کے اندر کوئی بھی ایسی شے اپنے لیے جگہ پیدا نہیں کر سکتی جو باطنی تجربے یا دریافت کے عمل سے نہ گزری ہو۔ دریافت کا یہ عمل باطنی بھی ہو سکتا ہے اور اس کا تعلق اردگرد کی دُنیا سے بھی گہرا ہو سکتا ہے، مگر دونوں صُورتوں میں اسے شاعر کی سائیکی میں سے گزرنا ہوتا ہے۔

ویسے تو یہ اتفاق نوجوان (Genuine) شاعروں میں بھی کم کم ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے کو بیان کریں، دُوسروں تک بات پہنچانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ دُوسروں کے کہے ہُوئے سے استفادہ کیا جائے، ابلاغ کے لیے کسی نہ کسی حد تک کلیشے کا ہونا ناگزیر ہے، مگر کلیشے کو کلیشے کی سطح سے اُٹھانا اور اُسے نئے معانی پہنانا، شاعری کے لیے ایک بنیادی لازمہ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غزل نے اپنی روایت کو برقرار رکھا ہے، تو ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُس کے اندر کلیشے موجود ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کلیشے کا تخلیقی استعمال نہیں کیا گیا۔ بعض لوگ غزل پر یہ اعتراض کرتے ہیں، مگر نظم کو اس سے مُبرّا جانتے ہیں۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہے، نظم اپنے تمام تر مغربی اثرات کے باوجود ہماری روایتی شاعری ہی کی ایک توسیع ہے۔ پھر اس توسیع کے حوالے سے ہم نے ایک بار پھر غزل کے مواد کو تبدیل کیا ہے اور جدید غزل کے حوالے سے نئے سوال اُٹھائے ہیں۔

غزل کے حوالے سے یہ گفتگو میں ظفر اقبال کے دیباچے میں اس لیے کر رہا ہوں، کہ ان تمام مسائل کے بلاواسطہ حوالے اُس کے ہاں موجود ہیں۔ وہ تمام امکانات بھی موجود ہیں جن پر غزل مُستقبل میں سفر کر سکتی ہے۔ ظفر اقبال اس لیے بھی غزل کا نمائندہ ہے کہ اُس نے

کسی دُوسری صنفِ سخن کو سنجیدگی سے قبُول نہیں کیا۔ نظم اُس نے کم کم ہی لکھی ہے، اور جو لکھی بھی ہے، وہ غزل کے بیان گفتگو سے باہر نہیں آ سکی، بلکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ تو اپنی کالم نگاری کو شاعری کی ہی توسیع سمجھتا ہے، لہٰذا غزل ہی اُس کا اوڑھنا بچھونا ہے، اور شاید پہلا اور آخری عشق بھی غزل ہی ہے، لہٰذا ہم عصر عہد میں اُس کو غزل کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ جتنے امکان غزل کے اندر موجُود ہیں، وُہی سب امکانات ظفر اقبال کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ البتہ ایک اضافی امکان جو غزل کے اندر ابھی در نہیں آیا، ظفر اقبال کے ہاں بھی موجُود نہیں۔ وہ ہے غزل کی نئی طبیعات، مابعد الطبیعات جو پُرانی مابعد الطبیعات کی بنیاد پر اُستوار ہو گی۔ یہ مَیں اس لیے کہہ رہا ہُوں کہ طبیعات اور مابعد الطبیعات میں نظریاتی سطح پر اب کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مگر اس کے سوال نئی زندگی اور نئے علم سے اُٹھائے جائیں۔ مگر جہاں تک ظفر اقبال کا تعلق ہے وہ کہہ سکتا ہے:

کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

ظفر اقبال اُن زندہ شاعروں میں ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اچھے اشعار بھی لکھے ہیں، ایسے ہی اشعار زیرِ نظر کتاب میں بھی موجُود ہیں۔ چند اشعار کی نشاندہی مَیں کر دیتا ہُوں، باقی آپ خُود تلاش کریں، آخر آپ نے یہ کتاب پڑھنی بھی تو ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ جو کچھ مَیں نے انتخاب کیا ہے یا کہا ہے، اس سے آپ یا ظفر اقبال اتفاق بھی رکھتے ہوں۔ دوستی اختلاف اور برداشت سے عبارت ہے، اتفاق اور تائید سے نہیں۔ ظفر اقبال مرا دوست ہے میرا مُرشد نہیں۔ اب آپ اشعار سُنیے:

یہ بھی ہے موجُودگی کی ایک شکل
ہر طرف جو یہ خلا موجُود ہے

☆

چار سُو کوئی بھی منظر نہیں باقی لیکن
بند آنکھوں سے تماشا نظر آتا ہے مجھے

بیٹھ سے جاتے ہیں دُھول اور دُھواں شام کے بعد
رات کے وقت زیادہ نظر آتا ہے مجھے

☆

خُود بھی کرنا پڑ جاتا ہے کچھ مجھ کو

اکثر تو مَیں کیا کرایا کرتا ہُوں

چاروں سمت چھلکتا رہتا ہُوں ہر دم
کائنات سے میری ذات زیادہ ہے

☆

مجھے چھپ کر بھی کرنے ہیں کئی کام
اُجالے میں اندھیرا کر رہا ہُوں

☆

ایک سیلاب کی زد میں ہُوں بڑی دیر سے مَیں
جو مرے اپنے ہی اندر سے اُٹھا کرتا ہے

☆

ابھی ہُوں اور ابھی کچھ بھی نہیں مَیں
انھیں حالات میں پائندہ بھی ہُوں

مَیں اپنے آپ ہُوں چہرے کی کالک
اسی کے نُور سے تابندہ بھی ہُوں

☆

پانی کی آوازیں آتی ہیں مجھ کو
کیسی کیسی برف پگھلتی رہتی ہے

☆

ہم اپنا گمشدہ چہرہ تلاش کر سکتے
ہمارے ہاتھ میں ایک آئنہ ہی رہ جاتا

☆

لینا دینا اگر نہ ہو کچھ
بازار بھی ایک راستہ ہے

شہزاد احمد
17 ستمبر 1995ء

کیا ہے جو بھی کچھ، اُس سے سوا کرتا رہوں گا
یہ گمراہی وظیفہ ہے، ادا کرتا رہوں گا

مسلسل کامیابی بھی کبھی ہو گی مقدر
میں اپنے آپ سے خود کو جدا کرتا رہوں گا

مری نیت کا تو اس میں نہیں ہے دخل کوئی
بھلا چاہوں گا بھی، لیکن، بُرا کرتا رہوں گا

بھلے ساون کا اندھا ہوں کہ تصویرِ ہوا میں
جہاں چلتا ہے میں اُس کو ہرا کرتا رہوں گا

نکل جاتا رہوں گا جس طرف بھی جی میں آئی
یونہی تبدیلیِ آب و ہوا کرتا رہوں گا

جو سرزد ہو چکا اُس پر کروں گا معذرت بھی
جو ہو پایا نہیں اُس کا گلہ کرتا رہوں گا

ابھی شامل رہوں گا آپ بھی سیلِ سخن میں
سزا دیتے رہیں، میں یہ خطا کرتا رہوں گا

توجہ دے نہ دے کوئی، مجھے اس سے نہیں کام
میں ان کوچوں میں روز و شب صدا کرتا رہوں گا

برابر ہیں، ظفر میرے لیے تحسین و تنقیص
میں اپنا کام ان سے ماورا کرتا رہوں گا

٭

کسی بات سے تھی ہر ایک بات جڑی ہوئی
وہ ہر اک خوشی کسی غم کے ساتھ جڑی ہوئی

کوئی ریزہ ریزہ پڑی ہوئی مرے چار سو
کبھی تھی یہ میری بھی کائنات جڑی ہوئی

کسی انتظار میں فرشِ سبزہ کے ہر طرف
وہ گلوں کی سُرخ و سیہ قنات جڑی ہوئی

انہی جنگلوں کے جہان میں کسی شاخ سے
کہیں برگِ خشک سی میری ذات جڑی ہوئی

میں ہمیشہ روشنی اور اندھیرے کی زد میں ہوں
مرے دن کے ساتھ ہے کوئی رات جڑی ہوئی

وہ بساطِ خواب اگر کبھی بھی رہی تو کیا
تھی ہر ایک جیت سے کوئی مات جڑی ہوئی

کوئی ہے اگر تو مجھے دکھائی بھی دے کہیں
کسی کم نما سے مری برات جڑی ہوئی

وہی بے نشاں وہی بے سُراغ ہیں روز و شب
وہی واردات سے واردات جڑی ہوئی

میں کسی کا حاشیہ ہوں، ظفر، کہ ہو جس طرح
کسی گانو سے کوئی شاملات جڑی ہوئی

٭

نیلے پیلے رنگ بدلتی رہتی ہے
اندر کوئی چیز مچلتی رہتی ہے

دل کے ناموجود کنج میں کہیں کوئی
ایک شاخ سی پھولتی پھلتی رہتی ہے

تاریکی میں راہ دکھاتی ہے مجھ کو
اک تصویر آنکھوں میں جلتی رہتی ہے

پانی کی آوازیں آتی ہیں مجھ کو
کیسی کیسی برف پگھلتی رہتی ہے

دھوپ دھڑکتی رہتی ہے کہیں ایک طرف
کہیں بدن میں شام سی ڈھلتی رہتی ہے

میرے اوپر نیچے سے جیسے اب تو
کوئی شے ہر وقت پھسلتی رہتی ہے

آگ بھی کہیں نہیں موجود ، مگر ، دن رات
دھوئیں کی ایک لکیر نکلتی رہتی ہے

وقت بتاتی ہے رونے اور سونے کا
گھڑی سی میرے اندر چلتی رہتی ہے

موت اجنبی نہیں ہے میرے لیے ظفر
آتی رہتی ہے ، اور ، ٹلتی رہتی ہے

-☆-

لگا نہیں جو تماشا ، لگا ہی رہ جاتا
میں ، دیکھتا تو یونہی دیکھتا ہی رہ جاتا

تلاش میں کوئی آتا نہ فرق بھی ، لیکن
کوئی تو ہو جسے میں ڈھونڈتا ہی رہ جاتا

یہ ٹوٹتی ہوئی زنجیر بھی غنیمت ہے
بچا کھچا کہیں یہ سلسلہ ہی رہ جاتا

وہ شہر خواب ہوا ہے ، مگر ، کہیں کوئی
اُدھر کو جاتا ہوا راستہ ہی رہ جاتا

لہو کی لہر میں ایک آدھ اُمنگ تو اُٹھتی
کہیں دلوں میں کوئی حوصلہ ہی رہ جاتا

ہم اپنا گم شدہ چہرہ تلاش کر سکتے
ہمارے ہاتھ میں ایک آئنہ ہی رہ جاتا

خدا نہیں تھا اگر دستیاب چاروں طرف
تو اس نواح میں خوفِ خدا ہی رہ جاتا

نہیں ہے برگ و شجر میں وہ دھوپ کی دھڑکن
تو راستوں پہ ہجوم ہوا ہی رہ جاتا

ظفر ، کچھ اور نہیں ہے اگر تصرف میں
تو اپنے پاس وہ دستِ دعا ہی رہ جاتا

-☆-

تنکا سا کوئی ایک پڑا ایک طرف ہے
اور، سارے زمانے کی ہوا ایک طرف ہے

اطراف ہیں اتنی کہ پتا ہی نہیں چلتا
کچھ بھی نہ سمجھنے کی سزا ایک طرف ہے

کچھ مجھ کو بتائیں گے تو ہو گا مجھے معلوم
کیا دُوسری جانب ہے تو کیا ایک طرف ہے

طوفانِ بلا ایک طرف ہے کئی دن سے
جلتا ہُوا سانسوں میں دیا ایک طرف ہے

ہے وسعتِ صحرا مرے آگے، مرے پیچھے
اور، اس میں کہیں تنگیِ جا ایک طرف ہے

بجلی سی چمکتی ہے کہیں خاک میں ہر دم
یہ گھاس کی سرسبز گھٹا ایک طرف ہے

میں دیکھتا ہُوں، اور، نظر کچھ نہیں آتا
کہنے کو مرا دیکھا ہُوا ایک طرف ہے

اس ایک طرف میں ابھی سمتیں ہیں کئی اور
ہر سمت کی اپنی ہی جدا ایک طرف ہے

یلغار ہے دُنیا کی، ظفر، ایک طرف، اور
میں ایک ہُوں، اور، میرا کہا ایک طرف ہے

☆

پُورم پُور خزانہ خالی ہو سکتا ہے
کل کا داتا آج سوالی ہو سکتا ہے

کوئی مُصیبت پڑ سکتی ہے گلے بھی آخر
میرا کوئی بیان اقبالی ہو سکتا ہے

ایک حقیقت جیسے اُس کے افسانے میں
میرا ہی کردار خیالی ہو سکتا ہے

تھوڑی کوشش اور کریں تو آسانی سے
اپنا بھی پیشہ قوالی ہو سکتا ہے

کوئی طریقہ ہم بھی اب سیکھیں گے، جس سے
قد اُونچا اور رُتبہ عالی ہو سکتا ہے

پیڑوں اور پودوں کا جو پکا دُشمن ہو
صرف وُہی اس باغ کا مالی ہو سکتا ہے

آپ اگر چاہیں تو یہ بے خواب اندھیرا
آنکھ جھپکنے میں دیوالی ہو سکتا ہے

آپ کہیں ہجرت فرما جائیں تو اب بھی
دو دن میں یہ شہر مثالی ہو سکتا ہے

آپ ایسے بھی، ظفر، ہو سکتے ہیں تو یقیناً
کوئی بھی مُلکِ سخن کا والی ہو سکتا ہے

☆

کہیں پہ ہے نشاں میرا نہ کوئی نام رکھتا ہوں
جو رکھتا ہوں تو اک آغاز بے انجام رکھتا ہوں

مری اس سے زیادہ کامیابی اور کیا ہو گی
کہ میں سامان میں اپنے دلِ ناکام رکھتا ہوں

پرندہ سا کوئی مجھ میں بھی پھنستا پھڑپھڑاتا ہے
جو اپنے آپ میں پھیلا ہوا اک دام رکھتا ہوں

نجانے کون سے سانچے میں کب ڈھلنا پڑے مجھ کو
اسی خاطر ہمیشہ طبع اپنی خام رکھتا ہوں

مجھے یہ آسماں ہے سر چھپانے کے لیے کافی
در و دیوار ہیں میرے نہ کوئی بام رکھتا ہوں

یہ کارِ عاشقی بھی آ پڑا ہے یونہی رستے میں
وگرنہ میں تو اپنے کام سے ہی کام رکھتا ہوں

مرے اوقات بھی سارے کے سارے ہو چکے اس کے
کہ اپنی صبح رکھتا ہوں نہ اپنی شام رکھتا ہوں

میں خود تو مضطرب رہتا ہی آیا ہوں ہمیشہ سے
اُسے بھی آج کل تھوڑا سا بے آرام رکھتا ہوں

کسی شے میں، ظفر، بس کچھ ملا دیتا ہوں چپکے سے
یہ طرزِ خاص ہے میری جسے میں عام رکھتا ہوں

☆

بارِ ہستی اُتار دینا ہے
جیتے جی خود کو مار دینا ہے

عمر جیسے گزار دی ہم نے
یہ بھی لمحہ گزار دینا ہے

خود ہی بے اختیار ہیں، اس کو
ہم نے کیا اختیار دینا ہے

ہے یہی نسبتِ قمار اس سے
ایک لینا، ہزار دینا ہے

ابھی خیرات کر رہا ہے وہ
ابھی اس نے اُدھار دینا ہے

اس کی ہر بات کا جواب اس کو
ہم نے بھی ایک بار دینا ہے

کچھ تو لینا ہے بے حساب اس سے
کچھ اُسے بے شمار دینا ہے

ہم بگاڑا کریں یہاں جو بھی
اس نے آ کر سنوار دینا ہے

کم سے کم لفظ ہیں، ظفر، درکار
شعر کہنا بھی تار دینا ہے

☆

کسی موہوم کا جویندہ بھی ہوں
اور، اس کوشش پہ میں شرمندہ بھی ہوں

ابھی ہوں، اور ابھی کچھ بھی نہیں میں
انہی حالات میں پایندہ بھی ہوں

میں اپنے آپ ہوں چہرے پہ کالک
اسی کے نور سے تابندہ بھی ہوں

مرا ہر حکم چلتا ہے مجھی پر
میں افسر بھی ہوں اور، کارندہ بھی ہوں

غریب شہر بھی مشہور ہوں میں
بھلے اس شہر کا باشندہ بھی ہوں

مرے بس میں نہ تانا ہے نہ پیٹا
میں اپنے وقت کا بافندہ بھی ہوں

فقط اس حال سے نسبت نہیں کچھ
کہ میں ماضی بھی ہوں، آیندہ بھی ہوں

گلوکاری بھی ہے میرے ہی ذمے
اور، اس کے ساتھ ہی سازندہ بھی ہوں

ظفر، کب سے مرا بیٹھا ہوں اس پر
مگر، کہنے کی حد تک زندہ بھی ہوں

☆

خود سے حیوان کو انسان سمجھنے والا
میں ہوں مشکل کو بھی آسان سمجھنے والا

بات مجھ کو مرے اندر کی خبر دیتی ہے
گفتگو کو ہوں گریبان سمجھنے والا

اپنی آوارہ خرامی پہ ہوں شرمندہ بہت
جب سے ہوں دشت کو دالان سمجھنے والا

سچ مرے خون میں شامل نہیں ہوتا جب تک
میں نہیں کفر کو ایمان سمجھنے والا

مطمئن سب سے زیادہ ہے تو کیا کر لوگے
اپنے دشمن کو نگہبان سمجھنے والا

کیا سمجھ بیٹھا ہے اس بے سروسامانی کو
اپنا سارا سر و سامان سمجھنے والا

مجھ سے کیا کہتے ہو موسم کی حکایات، کہ میں
باغ کو بھی ہوں بیابان سمجھنے والا

اس کے ساتھ اب کوئی امکان تجارت کیا ہو
نفع کو بھی ہے جو نقصان سمجھنے والا

نہ سمجھنا بھی تو دانائی ہے اتنی ہی، ظفر
جس قدر ہوتا ہے نادان سمجھنے والا

☆

بات بنتی نہیں ، اتنا تو بتاتا آ کر
شاعری سے مرا پیچھا ہی چھڑاتا آ کر

ماجرا کوئی نیا تو نہیں موجود ، مگر
کوئی افسانہ پُرانا ہی سُناتا آ کر

بہت اچھا ہُوا آیا نہیں آنے والا
آ بھی جاتا تو کوئی خواب دکھاتا آ کر

اس طرف گاہے بگاہے سہی ، آتا رہتا
وہ گیا تھا تو بڑے شوق سے جاتا آ کر

دُور ہی سے وہ بگولا سا نکل جاتا ہے
تھوڑی اپنی بھی کبھی خاک اُڑاتا آ کر

مدّتیں ہو گئیں ، خالی ہیں یہ بنجر آنکھیں
اس زمیں پر وہ کوئی پھول اُگاتا آ کر

باہر اندر کہیں رونق تو لگائے رکھتا
پھر کسی شے میں کوئی چیز ملاتا آ کر

ہم اُسے دُور سے ہی دیکھتے رہتے بے شک
چوکڑی تو کسی گوشے میں جماتا آ کر

اپنا ہی آپ لیے پھرتا ہے مشکل سے ظفر
آپ کا بوجھ بھلا کیسے اُٹھاتا آ کر

☆

کچھ تجھ سے شکایت ہی نہیں ہے مُجھ کو
سچ ہے کہ محبت ہی نہیں ہے مُجھ کو

کیا کام نکالوں گا خوشامد سے یہاں
حاصل یہ مہارت ہی نہیں ہے مُجھ کو

کچھ اور مسائل بھی ہوئے ہیں ظاہر
خالی کوئی وحشت ہی نہیں ہے مُجھ کو

کرتے ہیں مہیا مجھے دن رات وہی
جس شے کی ضرورت ہی نہیں ہے مُجھ کو

ہے قابلِ افسوس بھی اُس کا یہ سلوک
اس بات پہ حیرت ہی نہیں ہے مُجھ کو

ہے کس لیے اب اتنی توجہ مُجھ پر
اب تو کوئی حسرت ہی نہیں ہے مُجھ کو

کیوں خوش نہ پھروں صورتِ حالات پہ میں
اوراک حقیقت ہی نہیں ہے مُجھ کو

یہ جھوٹ بھی اچھا تو نہیں ہے ، لیکن
سچ کہنے کی عادت ہی نہیں ہے مُجھ کو

مجبور ہوں ، لکھتا ہوں زیادہ کہ ظفر
کم لکھنے کی فُرصت ہی نہیں ہے مُجھ کو

☆

خاطر کے واسطے ہوں کہ خدمت کے واسطے
مشکل میں ہوں کسی کی سہولت کے واسطے

کاٹی ہے دھوپ، سایے کے لالچ میں آج تک
سب رنج اُٹھائے ہیں کسی راحت کے واسطے

وہ بے غرض تھا، اور، اُسے پروا نہیں تھی کچھ
مجبور تھے ہم اپنی ضرورت کے واسطے

اُس بلند خُو کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا
ہم تو چلے تھے ساتھ حفاظت کے واسطے

یہ جنس دستیاب ہے بازار میں بھی اب
کیوں مارے مارے پھرتے ہو عزت کے واسطے

وہ خُود نہ ہو کسی کی زیارت کو جا رہا
ہم جا رہے ہیں جس کی زیارت کے واسطے

شرمندہ ہو کے آئے ہیں اُلٹا وہاں سے ہم
پہنچے تھے اُس کے پاس شکایت کے واسطے

اب کے سفر میں ساتھ اُسے بھی نہیں لیا
تنہا ہی چل پڑے ہیں کفایت کے واسطے

نفرت کے دائرے سے وہ نکلا نہیں، ظفر
دیتا رہا میں لاکھ محبت کے واسطے

☆

ثمر بھی ہے بھی قسمت میں، کیا حساب لگانا
ہمیں تو باغ تماشا ہے خواب خواب لگانا

میں اُس کے رُخ کی جھلک دیکھ کر یہ سوچ رہا ہوں
نصابِ دل میں پڑے گی یہی کتاب لگانا

یہ مشغلہ تو ہے بے سُود کارِ عشق سے بڑھ کر
کسی حُباب کے پیچھے کوئی حُباب لگانا

کئی دنوں سے وظیفہ ہے سیلِ دورِ خزاں کا
فصیلِ شہر تک آ کر نشانِ آب لگانا

زمیں کی تہ سے اُچھلتی ہے نشّہ نشّہ نمائش
نہیں ہے سہل کچھ اندازۂ شراب لگانا

بہت سکوں نہ سہی، لیکن، ایک ظلم ہے یہ بھی
ہماری خاک پہ الزامِ اضطراب لگانا

بہت یہ کُہنگی و خستگی بھی غور طلب ہے
مجھے پسند نہیں لفظ کو خضاب لگانا

بُجھا بُجھا سا جو اس طرح سے یہ نقشِ سُخن ہے
کچھ اس میں چاہیے تھی ساری آب و تاب لگانا

میں وہ روش ہوں، ظفر، گُلشنِ خیال و خبر کی
کہ جس پہ بھول گیا ہے کوئی گُلاب لگانا

☆

اگرچہ بحث تو بیکار بھی نہیں کرتا
میں اپنی بات پہ اصرار بھی نہیں کرتا

سفر ہے میرے لہو میں، جہاں کہیں لے جائے
میں اپنے آپ کو تیار بھی نہیں کرتا

یہی کہ اس کو سمجھتا ہے کچھ وہ قبل از وقت
وہ میری بات سے انکار بھی نہیں کرتا

بہم مرے لیے کرتا نہیں جو آسانی
تو میرے کام کو دشوار بھی نہیں کرتا

وہ جان جائے گا خود ہی اگر محبت ہے
اسی لیے تو میں اظہار بھی نہیں کرتا

میں بزمِ ناز میں اُس کی جو باریاب نہیں
تو عرض بر سرِ بازار بھی نہیں کرتا

جو اور کرتے ہیں، اور جس طرح سے کرتے ہیں
میں اُس طرح سے تو زنہار بھی نہیں کرتا

رہائی بھی مجھے دیتا نہیں کسی صورت
کسی طرح سے گرفتار بھی نہیں کرتا

جو رابطہ نہیں رکھتا کسی طرح کا، ظفر
وہ درمیان میں دیوار بھی نہیں کرتا

☆

نتیجہ کچھ بھی ہو، سر میں کوئی سودا تو رکھا ہے
اگر ویسا نہیں رکھا ہوا، ایسا تو رکھا ہے

پسند آئے نہ آئے لیکن، اپنے شوق میں ہم نے
یہ ملبوسِ محبت آپ کو پہنا تو رکھا ہے

بہت ناخواستہ اور ناپسندیدہ بھی ہوں گے ہم
مگر، ہم نے تمھاری بزم کو گرما تو رکھا ہے

ہوائے حُسن کا جھونکا ہو یا موجِ محبت ہو
کسی نے شاخِ دل کو صبح سے لرزا تو رکھا ہے

نہیں ہے میری خاطر، اے ہوائے شام، تو پھر کیا
چلو، باغِ بدن اُس نے کہیں مہکا تو رکھا ہے

نکالی جائیں گی اس کی بھی لاتعداد تعبیریں
بساطِ خواب کو ہم نے یہاں اُلٹا تو رکھا ہے

محبت کا کوئی مقصد تو کیا باقی رہا ہو گا
مگر، ایسے میں بھی ہم نے اِسے زندہ تو رکھا ہے

زمیں پر سایۂ دیوارِ قسمت میں نہیں اپنی
تو اُس نے آسماں پر ابر کا ٹکڑا تو رکھا ہے

ظفر، اس نخوت و پندار کے باوصف بھی ہم نے
کچھ اُس کے سامنے دامانِ دل پھیلا تو رکھا ہے

☆

محبت کر ہی بیٹھے ہیں تو پھر اظہار کیا کرتے
اس اُلجھن سے اُسے بھی جا کے اب دوچار کیا کرتے

پھر اُس کو پوچھنے کو بھی مچل اُٹھتا دلِ رُسوا
وہاں جا کر بھی ہم اُس شوخ کا دیدار کیا کرتے

ہمیں موقع کوئی دینے کی نیت ہی نہ تھی اُس کی
سو، ان حالات میں ہم بھی وہاں اصرار کیا کرتے

شریفوں کی وہاں اب کوئی گنجایش نہیں باقی
ہم اُٹھ کر آ گئے ہیں بزم سے، ناچار کیا کرتے

وہاں جا کر بھی حاصل کچھ نہ ہونا تھا ہمیں، لیکن
بُلا بھیجا ہی تھا اُس نے تو ہم انکار کیا کرتے

بہت احسان تھا پہلے ہی اُن بیمار آنکھوں کا
تو پھر ایسے میں دل کو اور زیرِ بار کیا کرتے

خزاں کا رنگ ہی چھایا رہا ہے خواب آنکھوں میں
ہم اس خاکِ تماشا کو گل و گلزار کیا کرتے

اُٹھا رکھی ہے دل کے ایک گرد آلود گوشے میں
حَیَی گزری محبت کو گلے کا ہار کیا کرتے

ظفر ہوتے ہیں کچھ عرضِ تمنا کے تقاضے بھی
سرِ راہے تو کر لیتے، سرِ بازار کیا کرتے

☆

مرے سامنے جلوۂ سفر نہیں آ رہا
کہ رواں ہوں دیر سے، اور، گھر نہیں آ رہا

کہیں آس پاس وہ ہے ضرور اسی بھیڑ میں
کوئی بات ہے جو ابھی نظر نہیں آ رہا

مری سوچ میں کوئی لہر ہی نہیں اُٹھ رہی
مری بات میں کسی طور اثر نہیں آ رہا

وہ کب آئے گا مری خواب گاہِ نیاز میں
جو مرے لیے سرِ رہگزر نہیں آ رہا

یہ سب اپنے عیب چھپائے رکھتے ہیں کس طرح
فقط ایک مجھ کو ہی یہ ہنر نہیں آ رہا

کسی رُعب سے کوئی بات ہو نہیں پا رہی
کسی خوف سے کوئی کام کر نہیں آ رہا

کوئی موج مجھ کو اُچھالتی نہیں زور سے
مرے راستے میں کوئی بھنور نہیں آ رہا

وہی دُھوپ ہے مرے راستوں پہ رُکی ہوئی
ابھی کوئی سلسلۂ شجر نہیں آ رہا

یہ چہل پہل ہے تمام اُسی کے لیے، ظفر
اُسے آنا چاہیے تھا، مگر، نہیں آ رہا

☆

سفر خشکی پہ ہونا تھا، قدم پانی میں رکھتا ہوں
بہت مشکل سے خود کو ایسی آسانی میں رکھتا ہوں

مجھے اپنی حدوں کا آپ بھی احساس ہے، اور، میں
سکوں بھی اک طرح کا اپنی طغیانی میں رکھتا ہوں

پڑا ہے رخنہ تازہ جو یہ میرے عقیدے میں
سو، اس کو بھی ابھی اجزائے ایمانی میں رکھتا ہوں

یہ وہ رخشِ خیالِ خام ہے جو رُک نہیں سکتا
کہ میں خود بھی اسے دن رات جولانی میں رکھتا ہوں

ضروری کام پڑ جاتا ہے کوئی اور ہی اُس کو
میں اپنے دل کو جس کی بھی نگہبانی میں رکھتا ہوں

نہیں ہوتا تو میرے پاس پھر کچھ بھی نہیں ہوتا
جو رکھتا ہوں تو میں سب کچھ فراوانی میں رکھتا ہوں

یہی کافر بنا سکتا ہے مجھ کو ایک لمحے میں
جو سجدہ آج کل میں اپنی پیشانی میں رکھتا ہوں

وہ خود ہی صورتِ حالات کو بہتر بنائے گا
پریشاں ہوں، سو، اُس کو بھی پریشانی میں رکھتا ہوں

ظفر، ماحول کا مجھ پر اثر ہوتا بھی ہے، لیکن
خیال اُس شہر کا کیسی بیابانی میں رکھتا ہوں

☆

اُس کے مقابلے کو اُٹھا اور کیوں نہیں
کیوں میں ہی ایک، میرے سوا اور کیوں نہیں

میں اور ہوں سو، میری اُڑانیں بھی اور ہیں
میرے لیے یہاں پہ فضا اور کیوں نہیں

اُس کا ہی نام کس لیے مخصوص ہو گیا
گلیاں ہیں اور بھی، تو صدا اور کیوں نہیں

چلتی ہے یہ تو اپنے مخالف ہی روز و شب
اس گوشۂ چمن میں ہوا اور کیوں نہیں

مجبور ہو کے مان ہی لیتا مرا سوال
کہہ بھی دیا تو میں نے کہا اور کیوں نہیں

اُس نے ستم تو اور بھی رکھے کئی روا
اُس بے وفا سے مجھ کو گلہ اور کیوں نہیں

یہ زادِ راہ بھی مرے کس کام آئے گا
میں اُس کے راستوں پہ لٹا اور کیوں نہیں

آنکھیں تو جلتی بجھتی ہی رہتی ہیں رات بھر
دشتِ مسافرت میں دیا اور کیوں نہیں

وہ بھی نہ مل سکا تو کہاں جائیں گے، ظفر
اتنے بڑے جہاں میں خدا اور کیوں نہیں!

☆

اب زمیں سے نہ آسماں سے نکال
راستہ کوئی درمیاں سے نکال

خس و خاشاکِ خواب کی خاطر
ایک شعلہ ہی جسم و جاں سے نکال

میں اشارہ سمجھ چکا ہوں ، مگر
لفظ بھی کوئی اب زباں سے نکال

دوسروں سے نہ کہلوا مجھ کو
آپ آ کر مجھے یہاں سے نکال

آشیاں کی جو خیر مانگتا ہے
اُس پرندے کو آشیاں سے نکال

جسے داخل نہیں کیا میں نے
پاؤں گا اب اُسے کہاں سے نکال

اپنے احوال سے پکڑ عبرت
کچھ سبق میری داستاں سے نکال

جو بھی کہنا تھا کہہ دیا میں نے
معنی اب جو بھی اس بیاں سے نکال

پھر یہ موقع نہیں ملے گا ، ظفر
کام اُس یارِ مہرباں سے نکال

☆

سخن آرائی میں کیوں اور کب کوئی نہیں ہے
رسد رکھتے ہیں وہ جس کی طلب کوئی نہیں ہے

یہاں بے وجہ تو کچھ بھی نہیں ہوتا ہے ، لیکن
ہوا ہے جو بھی کچھ اُس کا سبب کوئی نہیں ہے

ہماری یہ کرن بھر روشنی کس کام آتی
اگر اُس کا حریفِ رنگِ لب کوئی نہیں ہے

کسی بھی وقت رو لیتے ہیں تنہا بیٹھ کر ہم
محبت میں سوالِ روز و شب کوئی نہیں ہے

کوئی اُس کی نظر میں آ سکے تو خیر ، ورنہ
وہاں گنجائشِ نام و نسب کوئی نہیں ہے

اُدھر جانے کا آخر مشورہ کس نے دیا تھا
کہ جس کی بزم میں پاسِ ادب کوئی نہیں ہے

کوئی موجود ہوتا تو کہیں ملتا ہمیں بھی
غلط کہتے رہے ہیں سب کے سب ، کوئی نہیں ہے

سفر سارا یہ ہونے سے نہ ہونے کی طرف تھا
یہاں ہوتا بھی تھا کوئی تو اب کوئی نہیں ہے

ظفر ، یہ دربدر ہونا ہے آخر کس کی خاطر
پریشاں کیوں پھرا کرتے ہو جب کوئی نہیں ہے

☆

زیادہ اثر ہونے والا نہیں
سفر مختصر ہونے والا نہیں

رگوں میں بہت گھومتا ہے لہو
مگر، یہ بھنور ہونے والا نہیں

یہ موسم بدلتا رہے بھی اگر
شگوفہ شرر ہونے والا نہیں

جمی ہے یہاں بھیڑ کیوں اس قدر
تماشا اگر ہونے والا نہیں

وُہی خواب تعبیر آنکھوں میں ہے
مگر، بام و در ہونے والا نہیں

لگایا گیا میرے ذمّے جو کام
وُہی خاص کر ہونے والا نہیں

بہت ہے وُہی جو ہُوا ایک بار
کہ بار دِگر ہونے والا نہیں

دل اُس کا بھی خالی پڑا ہے، مگر
کہیں میرا گھر ہونے والا نہیں

ظفر، عیب کو عیب ہی چاہیے
یہ اپنا ہُنر ہونے والا نہیں

☆

اُس کے گلاب، اُس کے چاند جس کی بھی قسمت میں ہیں
آپ، ظفر، بس لیے اپنی مصیبت میں ہیں

ایک ہی صحرا سے ہے واسطہ اپنا ابھی
کوئی دنوں سے جو ہم ایک ہی وحشت میں ہیں

دینا ہے دھوکا کہاں، چھوڑنا ہے کس جگہ
فکر ہے ساری اُسے جس کی معیّت میں ہیں

چھان پھٹک ہو چکی، غور بہت ہو لیا
کچھ نہیں کھلتا کہ ہم کون سی حالت میں ہیں

طے نہ جنھیں کر سکا زندگی بھر کا سفر
فاصلے ایسے بھی کچھ اپنی طبیعت میں ہیں

اپنے تقاضے الگ، اپنی ضرورت جدا
پھنستے ہی مشکل میں ہم کافی سہولت میں ہیں

اس میں بھی کوئی اگر رہنے ہمیں دے، کہ ہم
وہم بشاشت میں ہیں، خواب مسرت میں ہیں

چپکے ہی چپکے یہاں آ گئے سو انقلاب
ہم بھی رہے بے خبر، آپ بھی غفلت میں ہیں

پھیلا ہُوا بھی سہی شور ہمارا، ظفر
ہیں فقط افسانہ ہم، اور، حقیقت میں ہیں

منکر ہے وہ تو اُس کے سوا اور کون ہے
اُس کا ہی کام ہے یہ، بھلا اور کون ہے

خُود ہی کہے کہ آئنۂ خُوں میں رات دن
اُس کے بغیر عکس نما اور کون ہے

ممکن نہیں ہے تجھ سے تو اتنی شکست و ریخت
اس دل میں تیرے ساتھ، بتا، اور کون ہے

اے دل پڑے گی تجھ پہ نہ اُس کی نگاہ کیوں
اس طرح راستے میں پڑا اور کون ہے

ہے کون مجھ سے بڑھ کے توجّہ کا مستحق
خُود ہی بتاؤ، مجھ سے بُرا اور کون ہے

سیلِ سفر میں شام و سحر کون ہے شریک
یعنی یہ ہمرکاب ہوا اور کون ہے

شک ہی رہا ہمیشہ کہ ہے اور بھی کوئی
لیکن، یہ عمر بھر نہ کھلا اور کون ہے

ماہ مُبیں تو ایک رگوں میں رواں بھی تھا
بامِ خیال پر یہ نیا اور کون ہے

میرا تو اپنا آپ بھی مشکوک تھا، ظفرؔ
مجھ میں، مگر، یہ نغمہ سرا اور کون ہے

☆

عشق میں اظہار ضرُوری نہیں
وصل میں اقرار ضرُوری نہیں

کہتے ہیں کافی ہے مُلاقات بھی
پیار میں بیوپار ضرُوری نہیں

آپ کا انداز ہی ایسا ہے آج
آپ کا اِنکار ضرُوری نہیں

دل میں لڑائی کی ہو نیت اگر
ہاتھ میں تلوار ضرُوری نہیں

فاصلے پہلے ہی بہت ہیں یہاں
بیچ میں دیوار ضرُوری نہیں

اپنی پذیرائی پہ خُوش ہوں بہت
اور، یہ ہر بار ضرُوری نہیں

جو بھی ضرُوری نظر آئے گا اب
عاقبت کار ضرُوری نہیں

برسرِ اخبار ہے ممکن تو پھر
برسرِ دربار ضرُوری نہیں

شعر کی مقدار بہت ہے، ظفرؔ
شعر کا معیار ضرُوری نہیں

☆

اپنا پیچھا نہیں چھوڑا میں نے
کبھی رستہ نہیں چھوڑا میں نے

کیوں بُرے اور بھلے میں آخر
فرق اتنا نہیں چھوڑا میں نے

کبھی پایاب ملے ہیں ، ورنہ
کوئی دریا نہیں چھوڑا میں نے

فکرِ عقبیٰ رہی درپیش بہت
خوابِ دُنیا نہیں چھوڑا میں نے

ہار کر دے گئیں آنکھیں ہی جواب
کیوں تماشا نہیں چھوڑا میں نے

برسرِ کار رہا وہ جب تک
ساتھ اُس کا نہیں چھوڑا میں نے

تھی یہ پہلی ہی ملاقات ، مگر
اثر اچھا نہیں چھوڑا میں نے

کبھی جیسا وہ ملا تھا مجھ کو
اُسے ویسا نہیں چھوڑا میں نے

خود کھلا غنچۂ لب اُس کا ، ظفر
یہ شگوفہ نہیں چھوڑا میں نے

☆

وہ ایسا کرنے والے ہیں کہ ویسا کرنے والے ہیں
ہمارے ساتھ پھر وہ کوئی دھوکا کرنے والے ہیں

ہمیں نے اُن کو بھیجا تھا ، سو ، ہم ہیں بھی اسی قابل
بُرا بھی کرنے والے ہیں تو اچھا کرنے والے ہیں

ہم اُس کو جھیلنے کی کوئی تیاری بھی کر سکتے
ذرا پہلے بتا دیتے وہ کیسا کرنے والے ہیں

نتیجہ کچھ بھی نکلے ، وہ سمجھتے تو ہیں ایسا ہی
کہ خود اُلٹے ہیں ، لیکن ، سب کو سیدھا کرنے والے ہیں

بہت کافی ہے یہ بھی ، وہ اگر کچھ کر گزرنے کا
ارادہ کرنے والے ہیں ، تہیہ کرنے والے ہیں

تسلی ہو نہیں پائی ہے شاید ٹھیک سے اُن کی
جو پہلے کر چکے ہیں وہ دوبارہ کرنے والے ہیں

ہماری بے حسی بھی شاملِ حالات ہے اپنے
بھری محفل میں جو وہ ہم کو تنہا کرنے والے ہیں

ہماری شامتِ اعمال کا حصہ بھی ہے اس میں
اُنھیں کرنے دو جس شے کا وہ سودا کرنے والے ہیں

ظفر ، ہم آپ بھی خود کو نہیں پہچان پائیں گے
وہ کچھ اس طرح کا حلیہ ہمارا کرنے والے ہیں

☆

تغافل اور کیا کچھ ہے، شکایت اور کتنی ہے
پتا چلتا نہیں اب تو محبت اور کتنی ہے

وہ میرا امتحاں لیتا رہے گا اور ابھی کب تک
کہ مجھ میں صبر کتنا ہے، شرافت اور کتنی ہے

فراغت کس قدر ہے دوسروں کے ساتھ رہنے کی
ہمارے پاس آنے میں قباحت اور کتنی ہے

مسائل اور ہیں درپیش کتنے آپ کو، یعنی
ہمیں زنجیر رکھنے کی ضرورت اور کتنی ہے

بہت اب تو پریشاں کر لیا ہے آپ نے ہم کو
ہمارے ساتھ یہ مہر و مروّت اور کتنی ہے

ہمیں پھرنا پڑے گا سر جھکائے اور ابھی کتنا
کہو، اس راستے میں اب ندامت اور کتنی ہے

میں چلتے چلتے گردِ راہ بن جانے کو ہوں، لیکن
خبر کچھ بھی نہیں مجھ کو، مسافت اور کتنی ہے

کسی کو فکر و پروا ہی نہیں سیلِ زمانہ کی
وگرنہ جانتے سب ہیں کہ مہلت اور کتنی ہے

ظفر، کارِ سخن آرائی جاری ہے ابھی اپنا
ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے یہ رخصت اور کتنی ہے

☆

ابھی میں کسی کے برابر نہیں آ سکا
جو اندر کا موسم ہے، باہر نہیں آ سکا

یہیں گھر کے چاروں طرف جیسے آوارہ ہے
ہوا کا وہ جھونکا جو اندر نہیں آ سکا

جسے یاد رکھا نہ میں بھول پایا کہیں
مرے سامنے پھر وہ منظر نہیں آ سکا

یہ موجیں ابھی سنگِ دل سے پٹختی ہیں سر
کبھی آنکھ میں وہ سمندر نہیں آ سکا

ہمیں اُس کی نیت پہ شک بھی نہیں ہے کوئی
جو آنے کی خواہش میں اکثر نہیں آ سکا

زمیں کے چراغوں میں باقی نہیں کوئی دم
فلک پر وہ ماہِ منور نہیں آ سکا

مجھے روک دیتا جو بس درمیاں میں کہیں
مرے راستے میں وہ پتھر نہیں آ سکا

ابھی کھینچنا ہو گا شاید کچھ اور انتظار
ابھی آنے والا مخمور نہیں آ سکا

ظفر، راستہ تو کھلا میں نے رکھا، مگر
یہاں پر کوئی میرا ہمسر نہیں آ سکا

☆

بیچ میں پڑ گیا سمجھنا کیا
اور اب سوچنا سمجھنا کیا

ایک ہی کی خبر نہیں ملتی
ایک سے دوسرا سمجھنا کیا

سمجھ آئے تو آئے کیا آخر
سمجھ اپنی ہے کیا ، سمجھنا کیا

بات کا لطف اُٹھا سکو تو اُٹھاؤ
بات ہے ، بات کا سمجھنا کیا

چل پڑے ہیں تو اب چلے چلیے
راہ میں راستا سمجھنا کیا

پاس آ کر سمجھ سکو گے ہمیں
اس طرح سے ہُوا سمجھنا کیا

سمجھ اپنی میں آ سکا نہیں کچھ
بھی کافی نہ تھا سمجھنا کیا

وہیں سب کچھ سمجھ لیا ہم نے
یعنی اب جابجا سمجھنا کیا

خواہشیں پھڑپھڑا رہی ہیں ، ظفر
قیدیوں کو رہا سمجھنا کیا

-☆-

نہ ہو سکتا جو پہلے تو دوبارہ اور ہو جاتا
عبارت اور ہو جاتی ، اشارہ اور ہو جاتا

محبت بھی وہی ہے ، اور ، موسم بھی وہی ، لیکن
ہمارا اور ہو جاتا ، تمھارا اور ہو جاتا

اب اتنے وقت میں مُہلت کہاں رنگت بدلنے کی
مگر ، اُڑتے ہی آنکھوں میں شرارہ اور ہو جاتا

سفر طے کر چکا ہوتا وہ اپنی ذات کا ، لیکن
کنارے پر پہنچتے ہی کنارہ اور ہو جاتا

محبت میں نہ تھا سُود و زیاں کا اعتبار اب کے
بچت کرنے ہی کرنے میں خسارہ اور ہو جاتا

بتاتے ہی بتاتے راز رکھ لینا کوئی دل میں
چھپاتے ہی چھپاتے آشکارا اور ہو جاتا

بہت جی جان سے کوشش بھی کرنی استقامت کی
اور ، اُس کے سامنے ہی پارہ پارہ اور ہو جاتا

اُمنڈتے آ رہے پھولوں کا وہ سیلاب سا کوئی
نظر تقسیم ہو جاتی ، نظارا اور ہو جاتا

ظفر ، وہ یک بیک پانی کی رنگت ہی بدل جاتی
سفینے اور ہو جاتے ، ستارہ اور ہو جاتا

-☆-

اپنے سمندروں سے جو اٹھتی ہوائیں ہیں
باہم دگر یہ کیسی اُلجھتی ہوائیں ہیں

گرد و غبار ہے نہ کہیں موجِ برشگال
اس بار تو جدھر بھی ہیں ، خالی ہوائیں ہیں

گرتے ہیں ان سے پھول تو جھڑتے ہیں برگ و بار
اس باغ و راغ میں یہ کہاں کی ہوائیں ہیں

اب راستہ بھی ان کو دکھانا پڑے گا آپ
چنگھاڑتی ہوئی جو یہ اندھی ہوائیں ہیں

فی الحال تو یہی نہیں کھلتا کہ ہر طرف
اصلی ہوائیں ہیں کہ یہ نقلی ہوائیں ہیں

دونوں میں کوئی فرق بھی اتنا نہیں رہا
آدھی یہ آندھیاں ہیں ، تو آدھی ہوائیں ہیں

آپس میں دُور دُور ہی رہتی ہیں کس لیے
یہ جو یہاں ہماری تمھاری ہوائیں ہیں

اک ابر میرے سر میں ہے چھایا ہوا ابھی
یا میرے آرپار گزرتی ہوائیں ہیں

اک دوسرے کو چیر کے جاتے ہوئے ، ظفر
جھونکے یہ کس طرح کے ہیں ، کیسی ہوائیں ہیں

☆

بات کہنی ہے جو کہتا بھی نہیں
جھوٹ سچ کہنے سے رہتا بھی نہیں

میں تو پہلے ہی سے ہوں کچھ ایسا
کچھ قصور اس میں تمھارا بھی نہیں

کچھ خوشامد کا نہیں موقع بھی
یہ ہنر کچھ مجھے آتا بھی نہیں

وہ گزر جائے جدھر جی چاہے
میں کوئی راہ میں دریا بھی نہیں

اس زمیں پر نہیں وہ پھول اگر
آسماں پہ وہ ستارہ بھی نہیں

اک بگولا سا جو گزرا ہے ابھی
اصل میں تو ابھی گزرا بھی نہیں

دونوں ہی لازم و ملزوم ہوئے
دل نہیں ہے تو یہ دُنیا بھی نہیں

ملتا جلتا بھی ہوں کچھ کچھ سب سے
مختلف ہوں ، مگر ، اتنا بھی نہیں

رُک گیا ہوں میں کنارے پہ ، ظفر
اور ، پانی کوئی گہرا بھی نہیں

☆

کمرے میں ہو مُنڈ بھیڑ کہ زینے پہ مُلاقات
سہتا ہوں میں اُس شوخ کی سینے پہ مُلاقات

پانی سا جھلکتا ہوا آغاز میں ہر سُو
ہوتی ہے جو انجام پسینے پہ مُلاقات

ملنا ہے یہ کس طرح کا ملنا کہ یہاں پر
ہوتی ہے بچھڑنے کے قرینے پہ مُلاقات

بس اتنا ہی افسانہ ہے اِس ہمسری کا
ساحل پہ جدائی تھی ، سفینے پہ مُلاقات

کچھ ہم بھی رہے اپنے شب و روز میں مصروف
کچھ ٹال دی اُس نے بھی مہینے پہ مُلاقات

ہوتی ہے کسی روز سرِ راہ تو ہو جائے
رکھی ہے نہ مرنے پہ نہ جینے پہ مُلاقات

اب دیکھیے حاصل ہمیں ہوتا ہے تو کیا کچھ
ٹھہری ہے کسی خواب خزینے پہ مُلاقات

خود آ کے تو ملتا ہی نہیں ہے وہ کسی طور
ہے منحصر اب زور سے چھینے پہ مُلاقات۔

اِک عمر ہی گزری ہے، ظفر ہوتی ہے اب تو
کھانے پہ مُلاقات نہ پینے پہ مُلاقات

☆

کیسے نظر آئے کہیں امکان ہمارا
جب ڈولتا ہی رہتا ہو ایمان ہمارا

ناکام رہے ہیں جو ہمیشہ کی طرح ہم
بدلا ہے ارادہ بھی تو ہر آن ہمارا

اوروں کا تو کیا ذکر، کہ اس دربدری میں
ہم تک بھی نہ پہنچا کوئی فیضان ہمارا

پیغام دیا : پھر بھی زحمت نہ کریں ہم
اور ، ساتھ ہی بھجوا دیا سامان ہمارا

ہر بار ہماری ہی ڈبوتا ہوا کشتی
یہ زور پکڑتا ہوا طوفان ہمارا

جو فائدہ ہونا تھا ، اُسی سے ہُوئے محروم
کچھ اس سے زیادہ نہیں نقصان ہمارا

کم ہوتی گئی اپنی توجہ بھی کچھ آخر
کچھ کام بھی ہوتا گیا آسان ہمارا

باقی ابھی پہلے کی طرح سے ہے اِک اُمّید
ہوتا نہیں اِک خواب پریشان ہمارا

اپنی ہی، ظفر، خاک اُڑاتے ہیں شب و روز
ہم پر بھی ہوا تنگ بیابان ہمارا

☆

کمرے میں ہو مُڈبھیڑ کہ زینے پہ مُلاقات
سہتا ہوں میں اُس شوخ کی سینے پہ مُلاقات

پانی سا جھلکتا ہوا آغاز میں ہر سُو
ہوتی ہے جو انجام پسینے پہ مُلاقات

مِلنا ہے یہ کس طرح کا مِلنا کہ یہاں پر
ہوتی ہے بچھڑنے کے قرینے پہ مُلاقات

بس اِتنا ہی افسانہ ہے اِس ہمسری کا
ساحل پہ جُدائی تھی ، سفینے پہ مُلاقات

کچھ ہم بھی رہے اپنے شب و روز میں مصرُوف
کچھ ٹال دی اُس نے بھی مہینے پہ مُلاقات

ہوتی ہے کسی روز سرِ راہ تو ہو جائے
رکھی ہے نہ مرنے پہ نہ جینے پہ مُلاقات

اب دیکھیے حاصل ہمیں ہوتا ہے تو کیا کچھ
ٹھہری ہے کسی خواب خزینے پہ مُلاقات

خود آ کے تو مِلتا ہی نہیں ہے وہ کسی طور
ہے مُنحصر اب زور سے چھینے پہ مُلاقات۔

اِک عُمر ہی گزری ہے، ظفر ہوتی ہے اب تو
کھانے پہ مُلاقات نہ پینے پہ مُلاقات

-☆-

کیسے نظر آئے کہیں اِمکان ہمارا
جب ڈولتا ہی رہتا ہو ایمان ہمارا

ناکام رہے ہیں جو ہمیشہ کی طرح ہم
بدلا ہے اِرادہ بھی تو ہر آن ہمارا

اوروں کا تو کیا ذکر، کہ اِس دربدری میں
ہم تک بھی نہ پہنچا کوئی فیضان ہمارا

پیغام دیا : پھر بھی زحمت نہ کریں ہم
اور ، ساتھ ہی بھجوا دیا سامان ہمارا

ہر بار ہماری ہی ڈبوتا ہوا کشتی
یہ زور پکڑتا ہوا طوفان ہمارا

جو فائدہ ہونا تھا ، اُسی سے ہُوئے محرُوم
کچھ اِس سے زیادہ نہیں نقصان ہمارا

کم ہوتی گئی اپنی توجّہ بھی کچھ آخر
کچھ کام بھی ہوتا گیا آسان ہمارا

باقی ابھی پہلے کی طرح سے ہے اِک اُمّید
ہوتا نہیں اِک خواب پریشان ہمارا

اپنی ہی، ظفر، خاک اُڑاتے ہیں شب و روز
ہم پر بھی ہوا تنگ بیابان ہمارا

-☆-

انکار بھی ایک راستہ ہے
دیوار بھی ایک راستہ ہے

چل کر کبھی دیکھیے گا اس پر
اصرار بھی ایک راستہ ہے

بے سُود بھی اک روش ہے، اے دل
بے کار بھی ایک راستہ ہے

لینا دینا اگر نہ ہو کچھ
بازار بھی ایک راستہ ہے

منزل کا نشاں نہیں وہاں بھی
اُس پار بھی ایک راستہ ہے

ہمت ہو اگر تو اس سفر میں
دشوار بھی ایک راستہ ہے

دیکھا تو ہمیں ہوا یہ معلوم
دیدار بھی ایک راستہ ہے

میں امن کا ہوں نقیب، لیکن
تلوار بھی ایک راستہ ہے

گزرے تو، ظفر، کھلا یہ سب پر
رفتار بھی ایک راستہ ہے

-☆-

بیاباں ہوا آراستہ کوئی نہیں تھا
کہ اس میں سے نکلتا راستہ کوئی نہیں تھا

مسافت کس طرح کی تھی ہمیں درپیش اب کے
کہ آدھا تھا تو آدھا راستہ کوئی نہیں تھا

ہزاروں راستے اک دوسرے کو کاٹتے تھے
کسی جانب بھی تنہا راستہ کوئی نہیں تھا

روانہ ہو رہے تھے ہم تو اپنے آگے پیچھے
غبارِ خواب ہی تھا، راستہ کوئی نہیں تھا

بہت سے راستوں پر چل چکے ہیں آج تک ہم
مگر، ایسا اندھیرا راستہ کوئی نہیں تھا

محبت راس ہی آئی نہیں ہم کو کسی طور
وگرنہ اس سے اچھا راستہ کوئی نہیں تھا

ہماری منزلِ مقصود تو موجود ہو گی
مگر، شاید ہمارا راستہ کوئی نہیں تھا

سفر محفوظ ہو جس پر کسی بھی زاویے سے
مرے صحرا میں ایسا راستہ کوئی نہیں تھا

ظفر، مجھ کو پسند آتا بھی کیا اُن میں سے آخر
سبھی سیدھے تھے، اُلٹا راستہ کوئی نہیں تھا

-☆-

کبھی سیدھا کبھی اُلٹا نظر آتا ہے مجھے
سب دکھا دیتا ہوں جیسا نظر آتا ہے مجھے

یا بخارے میں سمندر کی جھلک دیکھتا ہوں
یا سمندر میں بخارہ نظر آتا ہے مجھے

چار سُو کوئی بھی منظر نہیں باقی ، لیکن
بند آنکھوں سے تماشا نظر آتا ہے مجھے

بیٹھ سے جاتے ہیں دُھول اور دُھواں شام کے بعد
رات کے وقت زیادہ نظر آتا ہے مجھے

ایک ہی بار جسے دیکھنا مشکل تھا بہت
وہ کہیں اور دوبارہ نظر آتا ہے مجھے

سانس لینے کو بھی رُکتی نہیں دُنیا دم بھر
کہیں آتا ، کہیں جاتا نظر آتا ہے مجھے

مَیں جلا دوں گا ، اِسے آج بھی چوراہے پر
یہ جو اِک خواب کا پُتلا نظر آتا ہے مجھے

خُود کوئی ایسی خرابی ہوں کہ توبہ ہی بھلی
آپ میں تو کبھی اچھا نظر آتا ہے مجھے

دائرہ سوچ لیے پھرتا ہوں مُدّت سے ، ظفرؔ
آخری شخص ہی پہلا نظر آتا ہے مجھے

☆

پہلے جیسا اب نہیں
اب جیسا بھی تب نہیں

زُلفیں ہیں سر کے بغیر
چہرہ ہے تو لب نہیں

بے مقصد خواب و خیال
باتوں کا مطلب نہیں

دیکھا بھالا غور سے
کُچھ اچھا ہے ، سب نہیں

کرنے کا تو ذکر کیا
کہنے کا بھی ڈھب نہیں

بھُوکے کا بھگوان ہے
روٹی ہے تو رب نہیں

خُود چل کر آ جائے گا
ہم جائیں گے جب نہیں

ہم اُس دن سے مر گئے
جب سے کوئی طلب نہیں

ہمیں ظفرؔ کا کیا پتا
کب ہو گا ، اور ، کب نہیں

☆

جو بھی تھا، بس فالتو تھا، جو بھی ہے، بیکار ہے
ایک سیڑھی چڑھ گیا ہوں ، دُوسری تیار ہے

مُجھ سے ہو سکتیں نہیں اِس جسم کی پابندیاں
یہ وہ گھر ہے جس میں رہنے سے مجھے انکار ہے

اب نہیں تو پھر کبھی تسلیم کر جائیں گے آپ
میں جو کہتا ہوں ، مجھے جس بات پہ اصرار ہے

کہہ نہیں پایا ہے شاید ٹھیک سے اس کو کوئی
اب بھی سب کے درمیاں جس بات کی تکرار ہے

دھوپ لگتی ہے تو جا کر بیٹھ جاتا ہوں وہاں
میرے اندر ہی کچھ اتنا سایۂ اشجار ہے

کچھ تو اُس دشوار صحرا کے مسافر کی کہو
درمیاں میں ہی کھڑا ہے، آر ہے یا پار ہے

میں کسی بھی دوسرے کا بوجھ اُٹھا سکتا ہوں کیا
میرے سر پہ میرے اپنے آپ کا انبار ہے

ہو گئے اُوپر سے ہم جیسے بھی اُس کے ساتھ ساتھ
شہر سارا جس سے پہلے ہی بہت بیزار ہے

پار جو ہوتا نہیں دریا ہے وہ میرا ، ظفر
در نہیں جس میں وہ میرے نام کی دیوار ہے

-☆-

بات کرتا ہوں کہ گفتار کی گنجائش ہے
یعنی اس میں ابھی اظہار کی گنجائش ہے

آخری ، اور ، اٹل ہے ترے انکار کی بات
یا کسی طرح سے اصرار کی گنجائش ہے

ایک ہی بار کو روتے ہیں یہاں پر ہم تو
جہاں پہلے ہی کئی بار کی گنجائش ہے

یہ نیام اتنی کشادہ ہے کہ شاید اس میں
ایک آدھ اور بھی تلوار کی گنجائش ہے

ایک تھوڑا سا اگر ذہن لڑا سکتے ہوں
گھر کے اِک گوشے میں بازار کی گنجائش ہے

یہ سفر وہ ہے کہ اس میں کسی صورت کوئی
راستے کی ہے نہ رفتار کی گنجائش ہے

کسی بھولے ہُوئے نغمے کی ضرورت ہے کہیں
کہیں مٹتے ہُوئے آثار کی گنجائش ہے

مُجھے سر ہی نظر آتا نہیں کاندھوں پہ کہیں
وہ سمجھتے ہیں کہ دستار کی گنجائش ہے

قافلہ تو یُونہی تیار ہے مُدّت سے ظفر
اک ذرا قافلہ سالار کی گنجائش ہے

-☆-

رہ جاتی ہے بس بیچ میں ہی بات ہماری
کچھ اس سے زیادہ نہیں اوقات ہماری

باہر تو کسی طور بدلتا نہیں موسم
اندر ہی بُرا کرتی ہے برسات ہماری

ہم اپنی ہی زد سے کبھی نکلے نہیں باہر
ہوتی رہیں خود پہ ہی عنایات ہماری

بکھراو جو ہے چاروں طرف دُور تک اپنا
جھلکی سی دکھاتے ہیں مضافات ہماری

اُترا تھا ابھی ایک اندھیرا سا لہُو میں
اور، چاروں طرف پھیل گئی رات ہماری

تنہائی کے ہاتھوں کبھی ہو جاتے ہیں دل تنگ
رکھتی ہے پریشاں کہیں نُجات ہماری

حالات پہ اپنی بھی نظر ہے کسی حد تک
رکھتے ہیں خبر آپ بھی حالات ہماری

اب تو اسی اُمّید پہ جیتے ہیں کہ اِک دن
یکلخت بدل جائیں گی عادات ہماری

پوشیدہ، ظفر، آپ سے بھی کیا ہے یہاں پہ
جس طرح کی ہوتی ہے مُدارات ہماری

-☆-

یہاں کے ساتھ نہیں یا وہاں کے ساتھ نہیں
دراصل کون ہُوں مَیں، اور، کہاں کے ساتھ نہیں

ابھی یہ خواب کی تصویر نامکمل ہے
بہُت سے نقش ہیں جو اس نشاں کے ساتھ نہیں

مَیں سچ کہوں تو وہ ٹکڑا ہی اصل تھا اس میں
جو میری بکھری ہُوئی داستاں کے ساتھ نہیں

یہیں رہے گی ابھی پانیوں میں کشتیِ خواب
ہوا بہُت ہے، مگر، بادباں کے ساتھ نہیں

یہاں کچھ ایسے پرندے بھی ہیں بفضلِ خُدا
جو آشیاں میں ہیں، اور، آشیاں کے ساتھ نہیں

ہم ایسے عقل کے اندھے بھی دستیاب ہیں، جو
جہاں میں رہ کے بھی اہلِ جہاں کے ساتھ نہیں

ہماری صُورتِ احوال دیدنی ہے کہ ہم
زمیں کا بوجھ ہیں، اور، آسماں کے ساتھ نہیں

کمی سی کچھ تو کہیں رہ رہی ہے لفظ بہ لفظ
کوئی تو شے مرے حُسنِ بیاں کے ساتھ نہیں

ظفر، یہ دشتِ سخن کی مُسافری ہے عجب
مَیں کارواں میں ہُوں، اور، کارواں کے ساتھ نہیں

-☆-

جب طبیعت ہُوئی دلگیر دوبارہ میری
لگی اچھی مُجھے تاخیر دوبارہ میری

ایک ہی بار کے برتاؤ سے کیا ہوتا ہے
دیکھنی چاہیے تاثیر دوبارہ میری

جھوٹ بھی اب تو ملایا ہے اثر کی خاطر
کاش سُنتا کوئی تقریر دوبارہ میری

میں وہی خواب خنک زار محبت ہُوں، مگر
اب نکالے کوئی تعبیر دوبارہ میری

ہونے لگتا ہوں جو پھر قیدِ وفا سے مانوس
کھول دیتا ہے وہ زنجیر دوبارہ میری

آنچ اُس تازہ بدن کی جو ملے پھر مُجھ کو
خاک ہو سکتی ہے اکسیر دوبارہ میری

میرے چنگل سے نکل جائے گا وہ دُوسری بار
اُلٹی پڑ جائے گی تدبیر دوبارہ میری

کُہنگی کا یہ تقاضا ہے کہ اب ہو جائے
نئے انداز سے تعمیر دوبارہ میری

جن کے پلّے نہیں پڑتا تھا، ظفر کُچھ نہ پڑا
لاکھ پڑھتے رہے تحریر دوبارہ میری

☆

ہنگامے کہیں ہیں پسِ دیوار ہمارے
ہم رہ گئے، اور، کھو گئے آثار ہمارے

اپنی بھی ہماری ہے یہی منزلِ مقصود
رہتے ہو عبث درپئے آزار ہمارے

کُچھ مُنہ نہ لگاتے تھے جنہیں ہم سرِ محفل
مُنہ آتے ہیں وہ برسرِ بازار ہمارے

جھونکا سا یہاں پر تو رواں رکھتے ہیں اپنا
اُٹھتے ہیں بگولے کئی اُس پار ہمارے

وہ اتنا صف آرا بھی نہیں تھا، مگر، اس بار
حملے ہُوئے ناکام لگاتار ہمارے

ہو جائیں گے اک روز پریشاں یہ خیالات
اور، خواب چلے جائیں گے بیکار ہمارے

رہ جائیں گے پانی کے ہی اب رحم و کرم پر
ہاتھوں سے نکل جائیں گے پتوار ہمارے

اس اپنی خزاں سے نہیں شکوہ ہمیں اتنا
کھلتے ہیں کہیں تو گل و گلزار ہمارے

کُچھ مانگ بھی لیتے ہیں، ظفر، حسبِ ضرورت
کُچھ ساتھ بھی رہتے ہیں یہ انکار ہمارے

☆

رُکا ہُوا سہی ، لیکن ، اگر گزر جائے
سفر پڑا رہے ، خواب سفر گزر جائے

مرا غبار کسی گلشن تماشا پہ
ٹھہر ٹھہر نہ سکے ، اور ، گزر گزر جائے

یہ کیا کہ جس کے لیے اتنا اہتمام کروں
وہ میرے سامنے سے بے خبر گزر جائے

پھر اُس کے بعد کسی اور کی ہے گنجایش
مرے وجُود سے پہلے یہ ڈر گزر جائے

چھپے ہُوئے جو مناظر ہیں ، مجھ پہ ہوں ظاہر
ہے جو بھی کچھ مرے پیشِ نظر ، گزر جائے

یہ واپسی کا سفر وقت وہ نہ لائے کہ میں
رواں دواں ہی رہوں ، اور ، گھر گزر جائے

میں اپنے عیب دکھاتا رہا زمانے کو
کہ میرے سر سے ہوائے ہنر گزر جائے

وہ شہسوارِ سخن جس کے انتظار میں ہوں
کب آئے ، اور ، مجھے روند کر گزر جائے

ظفر ، زیادہ تر اِمکان اسی کا ہے کہ یہاں
ہمارا شور یونہی بے اثر گزر جائے

☆

پھر آواز لگانا بھولتا جاتا ہوں
شہر میں آنا جانا بھولتا جاتا ہوں

روشن رہتے تھے مجھ سے یہ کوہ و دمن
بجلی ہوں ، لہرانا بھولتا جاتا ہوں

دھاگے سے اُلجھے رہتے ہیں روز بروز
اپنا تانا بانا بھولتا جاتا ہوں

غائب ہوتا جاتا ہوں پس منظر میں
دُنیا کو یاد آنا بھولتا جاتا ہوں

گرد پڑی رہتی ہے یُوں ہی کسی شے پر
کوئی چیز چمکانا بھولتا جاتا ہوں

نئے مناظر دیکھتا ہوں جُھوٹے سچے
اپنا خواب پُرانا بھولتا جاتا ہوں

چلتے چلتے مٹتا جاتا ہوں آخر
راہوں میں سستانا بھولتا جاتا ہوں

موسم کی ہر سختی سہتا ہوں خود پر
اپنا آپ بچانا بھولتا جاتا ہوں

اُس کے ساتھ ہی جا کر سو رہتا ہوں ، ظفر
اپنا ٹھور ٹھکانا بھولتا جاتا ہوں

☆

میں آسانی میں ہوتا ہوں کہ دشواری میں رہتا ہوں
ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرنے کی تیاری میں رہتا ہوں

نہیں ہوتا تو میرے چار سو کچھ بھی نہیں ہوتا
جو ہوتا ہوں تو اس ہونے کی سرشاری میں رہتا ہوں

تجاوز بھی کیے رکھتا ہوں اپنے ہر طرف کیا کیا
بظاہر تو میں اپنی چاردیواری میں رہتا ہوں

مجھے فرصت کہاں ہو اور کوئی کام کرنے کی
اگر میں اس قدر مصروف بیکاری میں رہتا ہوں

کچھ اوروں کی گرانباری پہ رشک آتا بھی ہے مجھ کو
زیادہ خوش میں اپنی ہی سبک ساری میں رہتا ہوں

جواز اس کے علاوہ اور کیا ہو میرے ہونے کا
کہ سوتے جاگتے اُس کی طلب گاری میں رہتا ہوں

میں ہو جاتا ہوں اُس کو دیکھ کر آپے سے باہر سا
کئی دن سے کسی ایسی ہی بیماری میں رہتا ہوں

کھلے کس طرح اُس کی دشمنی کا ماجرا مجھ پہ
کہ میں تو رات دن اُس کی طرف داری میں رہتا ہوں

ظفر، ہوتا ہوں میں بھی جلوہ گاہِ ناز میں اُس کے
کہ مجبوری سے جاتا ہوں تو لاچاری میں رہتا ہوں

☆

میں دشمنی میں ہوا سرخرو نہ یاری میں
کہیں کا بھی نہ رہا اپنی خامکاری میں

اسی سبب سے کہ ہمسایہ کیوں قرار میں ہے
میں رات سو نہیں سکتا ہوں بے قراری میں

اصول توڑتے گزری ہے، اور، باقی عمر
گزارنی ہے اصولوں کی پاسداری میں

سنبھالنے سے سنبھل تو سکوں کسی صورت
میں خوش نہیں ہوں بہت اپنی بے کناری میں

وہ جھوٹ بول گیا سب کے سامنے، اور، میں
خموش بیٹھا رہا اپنی شرمساری میں

سوال پیاس کی مقدار کا بھی ہے، ورنہ
زیادہ فرق نہیں میٹھے اور کھاری میں

کبھی کبھی کا یہ مل بیٹھنا بھی شامل ہے
خراب حال محبت کی خوشگواری میں

ہم اپنی عمر بقایا کی فکر کیا کرتے
گزر گئی ہے زیادہ تو رہگزاری میں

اب اور مجھ سے توقع نہ باندھیے، کہ ظفر
نکال بیٹھا ہوں جو تھا مری پٹاری میں

☆

کبھی ہجوم صفت صد ہزار سا مَیں تھا
کبھی بس ایک تھا، اور، اِنتظار سا مَیں تھا

گزرتے رہتے تھے مجھ میں سے ماورا موسم
کچھ اس طرح کا یہاں رہگزار سا مَیں تھا

مَیں سدِّ راہ تھا دیوار کی طرح اپنے
اور، اُس کے ساتھ ہی کچھ آرپار سا مَیں تھا

جھلس رہے تھے مری دھوپ سے کہیں جنگل
کہیں پہ سایۂ دیوارِ یار سا مَیں تھا

چھپی ہوئی تھی کوئی خاص چیز دُنیا سے
اگرچہ سب کے لیے آشکار سا مَیں تھا

چراغِ گل وہی روشن تھا باغ میں اُس کے
نواح میں کہیں اُڑتا غبار سا مَیں تھا

کچھ ایک بار سے ہوتی نہ تھی تسلی بھی
اِسی سبب سے وہاں بار بار سا مَیں تھا

یہ مُنہ پہ کہنے لگا کیسے حرفِ حق سب کے
کہ اِس سے پہلے تو کچھ وضعدار سا مَیں تھا

اُجڑ رہا تھا کوئی شہر کوچہ کوچہ، ظفرؔ
اور، اُس کے چاروں طرف خواب زار سا مَیں تھا

-☆-

سفر کی اِک نئی تشکیل کرنا چاہتا ہُوں
مَیں اپنا راستہ تبدیل کرنا چاہتا ہُوں

کبھی چھوڑا تھا جس کو اپنی مرضی سے اَدھورا
مَیں اب اُس کام کی تکمیل کرنا چاہتا ہُوں

محبت ماجرا ہی کوئی ایسا تھا کہ جس کو
بیاں تفصیل در تفصیل کرنا چاہتا ہُوں

کوئی دریا ہے کوزے میں کروں گا بند جس کو
کوئی جھرنا ہے جس کو جھیل کرنا چاہتا ہُوں

بالآخر مان ہی جاؤں گا مَیں شرطیں سب اُس کی
ابھی تو صرف قال و قیل کرنا چاہتا ہُوں

حقیقت سے مُجھے اِنکار تو ہرگز نہیں ہے
اگر اِس کی نئی تاویل کرنا چاہتا ہُوں

یہ موقع پھر کبھی شاید نہیں ملنے کا مُجھ کو
اِسی خاطر ذرا تعجیل کرنا چاہتا ہُوں

رہا ہُوں کار بے کاری ہی میں سرگرم اِتنا
سو، کچھ دن کے لیے تعطیل کرنا چاہتا ہُوں

سِکھا دی ہے، ظفرؔ، دل کو بہُت ابلہ فریبی
اب اِس کو فارغ التحصیل کرنا چاہتا ہُوں

-☆-

ہوا کے رُخ پر کیسا بہتا جاتا ہُوں
چلتا جاتا ہُوں یا بہتا جاتا ہُوں

لڑتا ہی رہتا ہُوں مَیں ان موجوں سے
اور ، کبھی پِٹتا سا بہتا جاتا ہُوں

مُجھ میں اب شاید ہی بچا ہو کُچھ باقی
رفتہ رفتہ سارا بہتا جاتا ہُوں

بے بس ہو ہی چُکا ہُوں پانی کے آگے
کِتنا تھا ، اور ، کتنا بہتا جاتا ہُوں

اِتنا تو مَیں خُود بھی کہیں نہیں تھا آپ
ساحل ساحل چلتا بہتا جاتا ہُوں

بچّے ، بُوڑھے دیکھتے ہیں ، خُوش ہوتے ہیں
کیسا کھیل تماشا بہتا جاتا ہُوں

وہ بھی بادل بادل پھیلا ہے ہر سُو
مَیں بھی دریا دریا بہتا جاتا ہُوں

منزل اور مسافت دونوں ایک ہُوئے
شام سویرے رُکتا بہتا جاتا ہُوں

میرے مُخالف ہے پانی کا بہاو ، ظفر
اور مَیں اس میں اُلٹا بہتا جاتا ہُوں

شور شرابے کی بہتات زیادہ ہے
فُرصت کم رہتی ہے ، بات زیادہ ہے

چاروں سمت چھلکتا رہتا ہُوں ہر دم
کائنات سے میری ذات زیادہ ہے

سوچتا رہتا ہُوں لوگوں اور لفظوں میں
میرا رشتہ کِس کے ساتھ زیادہ ہے

رنج بہُت معمولی لگتا ہے ، لیکن
ہوتا یہ اکثر اوقات زیادہ ہے

باہر چلتا رہتا ہے جھکّڑ خالی
اندر ہی اندر برسات زیادہ ہے

ایک مسافت ایسی ہے مُجھ کو درپیش
جس میں دن تھوڑا ہے ، رات زیادہ ہے

ذاتی سا جھگڑا ہے میرا اور دل کا
اور ، اِس میں بھی اُس کا ہات زیادہ ہے

میٹھی بات بھی کافی ہوتی ہے اکثر
بھوکے کو اتنا ہی بھات زیادہ ہے

ایک اکیلی ہو تو نمٹ سکتا ہُوں ظفر
آفت سے پھر بھی آفات زیادہ ہے

☆

مشکل ہوں تو آسان بھی ہو سکتا ہوں
انسان سے حیوان بھی ہو سکتا ہوں

شیشے کا ہوں ، ٹھوکر سے بچاتا مجھ کو
میں مفت میں نقصان بھی ہو سکتا ہوں

خوش خوش نہ پھرو میرے نہ ہونے سے بہت
موجود کسی آن بھی ہو سکتا ہوں

معقول کے ہے عین مطابق جو بات
اس بات پہ حیران بھی ہو سکتا ہوں

آباد تو رہنا ہے مجھے آخر تک
کچھ دیر کو ویران بھی ہو سکتا ہوں

جس کی مجھے پروا بھی نہیں ہے اتنی
اس شخص پہ قربان بھی ہو سکتا ہوں

ہر روز بھی ہو سکتا ہے اس سے ملنا
ہر روز پریشان بھی ہو سکتا ہوں

اس شورشرابے پہ نہ جانا ہرگز
میں اصل میں سنسان بھی ہو سکتا ہوں

پہچان مری کوئی تو ممکن ہو ، ظفر
داناؤں میں نادان بھی ہو سکتا ہوں

☆

برا ہے یا کہ اچھا کر رہا ہوں
مجھے معلوم ہے کیا کر رہا ہوں

کیا تھا جس طرح پہلے سو ، اب بھی
اسی سے ملتا جلتا کر رہا ہوں

کوئی مجھ کو بتاتا بھی نہیں ہے
کہ میں ایسے میں کیسا کر رہا ہوں

ابھی اُلٹے کو سیدھا کر رہا تھا
ابھی سیدھے کو اُلٹا کر رہا ہوں

کمی بھی کر رہا ہوں کوئی پوری
زیادہ کو بھی تھوڑا کر رہا ہوں

مجھے چھپ کر بھی کرنا ہیں کئی کام
اُجالے میں اندھیرا کر رہا ہوں

کہیں ہلچل مچا رکھی ہے میں نے
کسی پانی کو گدلا کر رہا ہوں

غنیمت جانتا ہے کون اس کو
میں جیسا اور جتنا کر رہا ہوں

توجہ ہے ظفر ، ساری ، اسی پر
سو ، یہ بھی کام اپنا کر رہا ہوں

☆

اندر سے ہے دُرست ، بظاہر غلط سہی
جو خُود غلط نہیں ، مری خاطر غلط سہی

مَیں پھر سے کہہ رہا ہُوں وُہی بات ایک بار
پھر آپ کو پسند نہیں ، پھر غلط سہی

یہ دام تو کسی نے بچھایا نہیں غلط
پھنستا نہیں ہے آپ ، سو ، طائر غلط سہی

کُچھ درمیان میں ہی نظر ڈالیے کہیں
ہونے کو میرے اوّل و آخر غلط سہی

کرتے ہیں میرے بعد جو تعریف میری آپ
مُنہ پر بُرا کہیں گے تو حاضر غلط سہی

معذوریاں اگر مری پیشِ نظر رکھیں
مَیں آپ کی نِگاہ میں قاصر غلط سہی

دیدار خاص و عام میں کُچھ فرق ہو اگر
نظارہ تو غلط نہیں ، ناظر غلط سہی

لیتا ہُوں اپنی عقل سے بھی کام بیش و کم
مَیں پیرویِ خلق سے مُنکر غلط سہی

کُچھ تو ظفرؔ کے ساتھ رعایت بھی کیجیے
بندہ تو ٹھیک ٹھاک ہے ، شاعر غلط سہی

☆

بھیک مطلوب ہے جس کو نہ صدا کرتا ہے
اک گدا شہر میں ایسا بھی پھرا کرتا ہے

مَیں ذرا بھی نہیں لوگوں کی روش پر حیران
ایسے حالات میں ایسا تو ہُوا کرتا ہے

ایک سیلاب کی زد میں ہُوں بڑی دیر سے مَیں
جو مرے اپنے ہی اندر سے اُٹھا کرتا ہے

بیچ ہی میں مُجھے لٹکائے رکھے گا یُوں ہی
کہ گرفتار کرے گا نہ رِہا کرتا ہے

رات کو ساتھ رواں رہتا ہے اک پارۂ ابر
اک سِتارہ یُونہی بے خواب رہا کرتا ہے

اک بگولا سا پھرا کرتا ہے سڑکوں پہ یہاں
اور ، اُس میں کوئی پتّا سا اُڑا کرتا ہے

کِسی تجویز سے ملتے ہیں سفید اور سیاہ
کِسی ترکیب سے پیلے کو ہرا کرتا ہے

یہی پیرایۂ اظہار ہے جو آخرِ کار
اپنے جادُو سے پُرانے کو نیا کرتا ہے

یا تو مصرُوف ہی رہتا ہے مِلاوٹ میں ظفرؔ
یا کِسی شے سے کوئی چیز جُدا کرتا ہے

☆

ہے دُور قواعد سے ، نزدیک بھی لگتا ہے
جو ٹھیک نہیں بھی ہے اور ٹھیک بھی لگتا ہے

بھٹکے ہُوئے راہی کو کیا راہ دِکھائے گا
یہ شام کا تارا جو تاریک بھی لگتا ہے

پُوچھا مرا حال اُس نے ، ہے عام سی بات آخر
لیکن مجھے یہ نکتہ باریک بھی لگتا ہے

بے نام اِشارہ سا مجبور محبت کا
ساکن بھی رہے گا ، اور ، تحریک بھی لگتا ہے

اِس دل کی حقیقت ہی ہم پر نہ کھُلی اب تک
جو خانہ بدوشی میں وسنیک بھی لگتا ہے

اُسلوب ہی ایسا ہے کُچھ میرے لیے اُس کا
تعریف کا پیرایہ تضحیک بھی لگتا ہے

اب جس کی ہمارے ہاں قیمت ہی نہیں کوئی
یہ خاص لہُو بھی ہے ، اور ، پیک بھی لگتا ہے

اندر سے ہو جو کُچھ بھی ، باہر سے تو اندازاً
حمام بھی ہے ممکن ، بوتیک بھی لگتا ہے

حق جان کے لیتا ہُوں میں اُن سے ظفرؔ جو کُچھ
سچ یہ ہے کہ بعض اوقات وہ بھیک بھی لگتا ہے

☆

مسئلہ میرا ہے ، اُٹھے گا نُمایاں ہو کر
آپ کو کُچھ نہیں ملنے کا پریشاں ہو کر

سات ملبُوس بھی مَیں اس کو اگر پہناؤں
بات رہتی ہے کئی رنگ سے عُریاں ہو کر

رکھنا پڑتا ہے اُسے میری ضرورت کا خیال
باغ چلتا ہے مرے ساتھ بیاباں ہو کر

پھڑپھڑاتی ہے مُسلسل کوئی خواہش مُجھ میں
کِس مُصیبت میں گرِفتار ہُوں زنداں ہو کر

گُتھیاں میری کبھی کھولنے آ جاتے ہیں
سخت مُشکل میں پڑا ہُوں بہُت آساں ہو کر

یہی کیا کم ہے کہ اس آئنہ خانے میں کہیں
مَیں بھی دم بھر کو جھلک جاتا ہُوں امکاں ہو کر

پھُول ہوتے ہیں مرے سامنے اِتنے سارے
اور ، رہ جاتا ہُوں مَیں تنگیِ داماں ہو کر

اِنکساری سے کمایا تھا جو اب تک مَیں نے
کھو دیا ہے کسی رُسوائی پہ نازاں ہو کر

میرے آثار چمکتے ہیں ، ظفرؔ ، چاروں طرف
کتنا آباد ہُوا جاتا ہُوں ویراں ہو کر

☆

جو کہیں ہے اور نا موجود ہے
میرے پاس اُس کا پتا موجود ہے

اک طرح کا شائبہ سا ہے کہیں
اک نیا سا ذائقہ موجود ہے

میں رواں بھی کر نہیں سکتا اُسے
جو کہیں رُکتا ہوا موجود ہے

جو کسی پر کھل نہیں سکتا کبھی
ایک ایسا سلسلہ موجود ہے

کچھ تو ہوتا ہے کسی شے کا جواز
ایک ہے تو دوسرا موجود ہے

میں تو خود مشکوک ہوں، میں کیا بتاؤں
کیا نہیں ہے اور کیا موجود ہے

یہ بھی ہے موجودگی کی ایک شکل
ہر طرف جو یہ خلا موجود ہے

خود کرے گا اپنا اعلان ایک دن
میں نہیں کہتا خدا موجود ہے

اُس کا ہے امکان ہی کافی، ظفر
وہ نہیں موجود یا موجود ہے

☆

اصل کس قدر ہوگا، اور، گمان کتنا ہے
یہ زمیں ہے کس حد تک، آسمان کتنا ہے

دھوپ کا بھی اندازہ کیجیے تسلی سے
یہ بھی دیکھتے رہیے سائبان کتنا ہے

کوئی کہہ نہیں سکتا کس طرح فروکش ہیں
کس قدر فروکش ہیں، اور، مکان کتنا ہے

آپ نے کہا جو کچھ اتنی دردمندی سے
اُس میں رنگ ہے کتنا، اور، بیان کتنا ہے

جس کی دوستداری کے دُور دُور ہیں چرچے
اُس کی فکر ہے کیا کچھ، اور، دھیان کتنا ہے

صاف دیکھ سکتے ہیں دیکھنا اگر چاہیں
رُک گئے کہاں پر ہم، وہ ہر آن کتنا ہے

کوئی جا کے دیکھ آئے، بے خبر نہ مارے جائیں
سطحِ آب سے اُوپر اب نشان کتنا ہے

اور ایک دو دن میں ہو رہے گا سب ظاہر
چار سُو کہاں تک ہے، درمیان کتنا ہے

گفتگو لگا کرنے جب ظفر اشاروں میں
تب کہیں کھلا مجھ پر، بے زبان کتنا ہے

☆

کس طرح کا ہے، کس کا ہے، کیوں کر ہتارہ ہے
میرے ہتارے کے جو برابر ہتارہ ہے

رہتا ہے ٹوٹ کر بھی جو اپنے مقام پر
اک اور بھی ہتارے کے اندر ہتارہ ہے

اس کے بھی گلستاں سے الگ پھول ہے کوئی
میرے بھی آسمان سے باہر ہتارہ ہے

ہوتا رہوں گا خرچ ابھی اور عمر بھر
رختِ سفر ہوں میں تو سفر پر ہتارہ ہے

بجھتا ہے کس غبار کی پہنائی میں کہیں
میں خود ہتارہ ہوں کہ مرا گھر ہتارہ ہے

اک سمت سے ہتارہ سمندر ہے بیش و کم
اک زاویے سے خود یہ سمندر ہتارہ ہے

فی الحال تو مجھے بھی کچھ ایسی خبر نہیں
جھلمل یہ آنکھ میں ہے کہ منظر ہتارہ ہے

کچھ اور ہی طرح کا اندھیرا ہے خاک پر
کچھ اور ہی طرح سے منور ہتارہ ہے

یہ دل کہ جلتا بجھتا ہی رہتا ہے، اے ظفر
میرے حساب میں تو سراسر ہتارہ ہے

☆

شہرِ خوابیدہ کے اندر نہیں جانے والی
یہ صدا وہ ہے جو گھر گھر نہیں جانے والی

خود تو میں اور زیادہ نہیں جینے کا، مگر
مجھ میں اک چیز ہے جو مر نہیں جانے والی

آگے پیچھے رہی وہ شام تماشا مجھ سے
کہ ابھی میرے برابر نہیں جانے والی

اک ہوا ہے جو مرے چاروں طرف چلتی ہے
اور، کسی ایک ہی رخ پر نہیں جانے والی

رفتہ رفتہ کوئی مجھ میں سے گزرتی ہوئی شے
جا رہی ہے جو سراسر نہیں جانے والی

لہر سی ایک زمانوں کی، مرے ساتھ ہی ساتھ
جاتی رہتی ہے جو اکثر نہیں جانے والی

کیوں نہ دشوار ہو اس شہر کو جاتی ہوئی راہ
جو مری خاک سے ہو کر نہیں جانے والی

اس طرف ڈرتی، لرزتی ہوئی یہ موجِ نگاہ
جائے گی بھی تو مکرر نہیں جانے والی

میرے اندر جو کھلا کرتا ہے اک پھول، ظفر
اس کی خوشبو کہیں باہر نہیں جانے والی

☆

اپنے سر پر سوار ہوں اتنا
اور ، پھر بے شمار ہوں اتنا

قافلے سے بھی ہوں الگ ہر وقت
ساتھ ہی بے مہار ہوں اتنا

دشمنوں کی مجھے ضرورت کیا
مَیں اگر دوستدار ہوں اتنا

ایک ہی بار پر نہیں موقوف
دیکھ لو ، بار بار ہوں اتنا

خود پہ بھی کوئی دسترس نہیں اب
یعنی بے اختیار ہوں اتنا

اور احسانِ وصل کیا لیتا
پہلے ہی زیرِ بار ہوں اتنا

ہوں گے دُنیا میں اور بھی ناکام
مَیں ہی کیوں شرمسار ہوں اتنا

بیٹھے بیٹھے ہی بیٹھوں گا
چار جانب غبار ہوں اتنا

مانگتا ہوں اُدھار سب سے ، ظفر
اور ، کم اعتبار ہوں اتنا

-☆-

دیکھتا رہتا ہے ، آنکھوں کی مثال آئنہ ہے
نظر آتا ہی نہیں کچھ بھی ، کمال آئنہ ہے

دھجی دھجی کہیں پھیلی ہوئی اک دھیان کی دھوپ
کرچی کرچی کسی خواہش میں خیال آئنہ ہے

سارے منظر سمٹ آتے ہیں اُمنڈ کر اس میں
موسمِ خواب میں پھیلا ہوا تھال آئنہ ہے

جھیلتا رہتا ہے دن رات عجب طرح کے عکس
کچھ اسی وجہ سے دیکھو تو نڈھال آئنہ ہے

چار سُو کچھ بھی نہیں ہالۂ حیرت کے سوا
کہ جواب آئنہ ہے اور نہ سوال آئنہ ہے

مجھ میں ہر شے جھلک اُٹھے گی مجھے دیکھتے ہی
یہ خبر مجھ کو بھی ہے میرا مآل آئنہ ہے

کوئی پرچھائیں گزرتی نہیں بچ کر اس سے
دل کے اطراف پہ بکھرا ہوا جال آئنہ ہے

فیصلہ اس کا بھی اب ہونے ہی والا سمجھو
یہ کمال آئنہ ہے یا کہ زوال آئنہ ہے

روشنی اور بھی کچھ زور سے پڑتی ہے ، ظفر
مَیں سمجھتا رہا شاید مری ڈھال آئنہ ہے

-☆-

انہدام رہتا ہے
سارا کام رہتا ہے

کچھ حلال ہے باقی
کچھ حرام رہتا ہے

شعر ہو بھی جائے تو
ناتمام رہتا ہے

سب سے ہو چکے فارغ
ایک نام رہتا ہے

دانہ چگ چکا ہوں اب
صرف دام رہتا ہے

آہ صبح سر کر لی
شورِ شام رہتا ہے

لطفِ خاص بھی ہو گا
فیضِ عام رہتا ہے

انتظار ہو جس دن
انتظام رہتا ہے

دیکھیے ظفر کب تک
بے لگام رہتا ہے

☆

ڈرتا ہوں بیاباں میں نہ اب گھر نکل آئے
ایسا نہ ہو دیوار میں ہی در نکل آئے

کچھ شوق نہ تھا اتنا ہمیں دل کے سفر کا
باہر سے پڑی مار تو اندر نکل آئے

ڈوبا تھا خدا ہو کے کہیں وہ تو کہیں ہم
اُبھرے ہیں تو کیوں، اُس کے برابر نکل آئے

اتنا بھی غنیمت ہے کہ اس عہدِ زیاں میں
دستارِ فضیلت سے اگر سر نکل آئے

اس شہر میں روشن ہیں اسی زہر سے آنکھیں
مشکل ہے کوئی بندۂ بے زر نکل آئے

مٹ جائے یہ نقشہ بھی تو آنکھیں کھلی رکھنا
ممکن ہے کوئی اور ہی منظر نکل آئے

اس بزم سے اپنا ہے نکلنا ہی مقدر
سُن کر نکل آئے کبھی کہہ کر نکل آئے

چھوڑا جو تغافل تو رکھی ظلم کی بنیاد
پگھلی ہے اگر برف تو پتھر نکل آئے

جیتے کوئی دن اور بھی اس سعیِ سخن میں
کیا کیجیے، چیونٹی کے، ظفر، پر نکل آئے

☆

بجھی ہے آگ تو کیا ہے دُھواں تو رہنے دو
کچھ اور روز ہمیں سرگراں تو رہنے دو

رہے تو اور کسی کام شاید آ جائے
نہیں ہے ذائقہ باقی زباں تو رہنے دو

وفا کا نام نہ لے گا کوئی بجا ہے، مگر
یہاں کہیں کوئی اُس کا نشاں تو رہنے دو

ہمیں بھی شوقِ ملاقات ہے بہت، لیکن
اگر تم آ نہیں سکتے یہاں، تو رہنے دو

تمھارے طرزِ تکلّم کی دُھوم ہے اِتنی
مرے لیے مرا عجزِ بیاں تو رہنے دو

زمین تنگ تو کر ہی چکے ہو تم ہم پر
ہمارے سر پہ ابھی آسماں تو رہنے دو

اگر کرو گے وُہی جو پسند ہے تم کو
تو پھر یہ رونقِ نقصان و زیاں تو رہنے دو

ثواب و سُود سفر ہے اگر تمھارے لیے
مرے بدن میں یہ زہرِ زیاں تو رہنے دو

ظفرؔ کو شہر بدر کر کے بھی ہو افسردہ
جہاں بھی ہے وہ اب اُس کو وہاں تو رہنے دو

-☆-

چھوٹا تھا یا بڑا رہا
اک دریا سا چڑھا رہا

تنی رہی تلوار سی ایک
یا نیزہ سا گڑا رہا

یا لوہے کی لاٹھ رہی
یا مٹی کا گھڑا رہا

کس کے لیے بنا تھا وہ
کس کے ماتھے مڑھا رہا

ہار اُس نے بھی نہیں مانی
میں بھی ضد پہ اڑا رہا

کسی ہجر کی حسرت میں
ساتھ کسی کے پڑا رہا

سجی رہی اک جھلمل سی
موتی سا اک جڑا رہا

گالیاں بکتے وقت بھی میں
ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا

شادی کروا کر بھی ظفرؔ
وُہی چھڑے کا چھڑا رہا

-☆-

مُیسّر جو بھی ہے اُس پر گزارہ کیوں نہیں ہوتا
جب اُن کا ہو رہا ہے تو ہمارا کیوں نہیں ہوتا

وصُولی کیا ہے، اور، خرچہ ہے کِتنا، کُچھ تو ہو ظاہر
وہاں پر پیش اپنا گوشوارہ کیوں نہیں ہوتا

ہُوا ہے ایک ہی بار، اور، ہم کو یاد ہے اب تک
رُکاوٹ پڑ گئی ہے کیا، دوبارہ کیوں نہیں ہوتا

خیال و خواب کی تاریک سرحد پار کرتے ہی
سمُندر کیوں نہیں رہتا، بخارہ کیوں نہیں ہوتا

وہ مستِ ناز لگتا کیوں نہیں ہے اک طرف آ کر
ہمارا کیوں نہیں بنتا، تُمھارا کیوں نہیں ہوتا

کوئی اُس کی طرف ہے، اور، کوئی دُوسری جانب
تعجب ہے کہ یکسُو شہر سارا کیوں نہیں ہوتا

رُکے ہیں کام سب کے اور، دُنیا منتظر ساری
توجُہ کیوں نہیں کرتے، اِشارہ کیوں نہیں ہوتا

اگر وہ بات سُنتا ہی نہیں اپنی تو پھر اُس سے
کنارہ کیوں نہیں کرتے، گزارہ کیوں نہیں ہوتا

محبت کا یہ کاروبار کیسا ہے، ظفر، جس میں
مُنافع ہی مُنافع ہے، خسارہ کیوں نہیں ہوتا

☆

پہلے یہ گلہ تھا کہ محبت نہیں مِلتی
اور، اب یہ شکایت ہے کہ فرصت نہیں مِلتی

سیرت کی الگ بات ہے، جیسا بھی ہے وہ شخص
حق یہ ہے کہ اُس سے کوئی صُورت نہیں مِلتی

ہم اپنے مؤقف پہ بھی قائم نہیں شاید
اور، اُس کی طرف سے بھی حمایت نہیں مِلتی

کُچھ اُس کی مُلاقات کا اِمکاں بھی نہیں ہے
اُس شوخ سے کُچھ اپنی طبیعت نہیں مِلتی

مِل جائے تو مِل لیں گے اُسے، اِس سے زیادہ
اگلی سی تمنّا میں وہ شِدّت نہیں مِلتی

وہ حوصلہ شِکنی بھی بہُت کرتا ہے، لیکن
افسوس ہمیں کوئی نصیحت نہیں مِلتی

بازار تماشا سے نِکل جایئے ناچار
آئینہ تو مِل جائے گا، حیرت نہیں مِلتی

جینے کی سزا یہ ہے کہ اِس میں کِسی صُورت
مرنے کے سِوا کوئی سہولت نہیں مِلتی

بیزار بہُت ہو، ظفر، اِس شام و سحر سے
اِس طرح تو کھوئی ہُوئی جنت نہیں مِلتی

☆

خطا کاری میں سالم چیز کا بٹوارا کرتا ہوں
مُعافی مانگتا ہوں ، اور ، خطا دوبارہ کرتا ہوں

بھروسا کر نہیں سکتا کسی بھی اور پہ اب تو
مَیں اپنے ہاتھ سے آئینہ پارہ پارہ کرتا ہوں

بڑھا دیتا ہوں دل سے درمیانی فاصلہ اتنا
کوئی دیکھے کہ مَیں کیوں کر طلب کو تارا کرتا ہوں

نہیں مِلتا ہے گاہک شہر میں جب میرے ایماں کا
تو اس خاطر مَیں اپنے آپ کو بنجارا کرتا ہوں

سُنائی کچھ نہیں دیتا ہے اور سُنتا ہوں مَیں سب کچھ
نظر آتا نہیں کچھ بھی ، مگر ، نظارہ کرتا ہوں

محبت کچھ اکیلے آدمی کا کام ہی کب ہے
اُسے بھی کہہ رہا ہوں ، اور ، خود بھی چارہ کرتا ہوں

جو مُشتِ خاک سے آندھی اُٹھاتا ہوں کسی لمحے
تو چھوٹی سی لہو کی لہر کو فوارہ کرتا ہوں

نِکل جاتے ہیں جب اس کی بدولت کام سب میرے
تو پھر مَیں اس دلِ درویش کو ناکارہ کرتا ہوں

ظفر ، یہ بھوک بھی سازِ طلب کی ایک صورت ہے
سو ، مَیں ایسے میں خالی پیٹ کو نقارہ کرتا ہوں

-☆-

سرسوں ، خواب ، ہوا ، تصویر
کیسی چھوڑ گیا تصویر

بے منظر ، بے خط ، بے رنگ
ایسی ایک بنا تصویر

پیاسا ہو تو پی اس کو
بھوک لگے تو کھا تصویر

دن بھر شہر کی سیر کرا
رات کو ساتھ سُلا تصویر

آہٹ تھی دروازے پہ
پُوچھا! کون ، کہا تصویر

پڑھا محبت کا مضمون
بے مقصد اور بے تصویر

کچھ تو نظر بھی آنے دے
آگے سے تو ہٹا تصویر

ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں
کیا گلدستہ ، کیا تصویر

کچّی ، باتیں چھوڑ ، ظفر
یُوں بنتی ہے بھلا تصویر

-☆-

کبھی انکار بدل ہے کبھی اقرار بدل
تُو کسی جگہ تو رُک بھی سہی ، اے یار بدل

کبھی اندازے دھرے کے ہی دھرے رہ جائیں
دیکھتے دیکھتے ہی جائیں جو آثار بدل

مَیں بدل سکتا جو بوسہ تو بدل ہی لیتا
یہی بہتر ہے کہ تُو ہی کہیں رُخسار بدل

سر کے دُشمن بھی وہی ٹھہرے ہیں رفتہ رفتہ
یہاں جو دوست ہمارے ہُوئے دستار بدل

یہ سفر وہ ہے کہ ہیں اس کے تقاضے بھی نئے
کبھی رہبر ، کبھی رستہ ، کبھی رفتار بدل

انقلابی ہیں ، بدل لیتے ہیں پل میں خود کو
کوئی گفتار بدل ہے ، کوئی کردار بدل

مَیں نیا طرزِ بیاں کرتا ہُوں ہُوتی ایجاد
اہلِ انکار وہیں دیتے ہیں معیار بدل

اپنی اپنی کبھی کرتے ہیں مساعیِ سُخن
کوئی گفتار بدل ہے کوئی اظہار بدل

بے بیٹھے ہیں ، ظفرؔ ، زینتِ دربار تو آپ
پھر کہاں جایئے گا ، جائے جو سرکار بدل

-☆-

محبت ہے ، مگر اُس کو خبر ہونے سے ڈرتا ہُوں
کہ اس خوشبوئے دل کے مُنتشر ہونے سے ڈرتا ہُوں

اُسی دم آن پہنچیں گے مُجھے نامُعتبر کرنے
کوئی تو بات ہے جو مُعتبر ہونے سے ڈرتا ہُوں

جو ہوتا ہُوں تو کم ہوتا ہُوں ، وہ بھی رفتہ رفتہ سا
نجانے کِس لیے مَیں سربسر ہونے سے ڈرتا ہُوں

زیادہ فرق دونوں میں نہیں کُچھ بھی کِسی صُورت
نہ ہونا بھی یہی کُچھ ہے ، اگر ہونے سے ڈرتا ہُوں

بہُت مُمکن ہے آخر بے ہُنر رہ جاؤں اُتنا ہی
مَیں جتنا بھی زیادہ بے ہُنر ہونے سے ڈرتا ہُوں

مَیں اپنے راستے سے پھر نہیں گُزرا کبھی خُود بھی
اِسی خاطر کِسی کی رہگُزر ہونے سے ڈرتا ہُوں

مری خواہش ہے مَیں اِس کو بچا لے جاؤں دُنیا سے
کہ اپنی عُمر خُود ہُوں اور بسر ہونے سے ڈرتا ہُوں

مُجھے تو اب یہاں کی ہر طرف سے خوف آتا ہے
کِسی کو کیا بتاؤں مَیں کِدھر ہونے سے ڈرتا ہُوں

ظفرؔ اِس بھیڑ میں گُم ہی نہ ہو جاؤں کہیں جا کر
جِدھر سارے کے سارے ہیں اُدھر ہونے سے ڈرتا ہُوں

-☆-

مرے چاروں طرف ہر دم برابر گھومتا ہے
یہ منظر گھومتا ہے یا مرا سر گھومتا ہے

بگولا سا کہیں ہے تو کسی کوئی شب و روز
لہو کی طرح جو اندر ہی اندر گھومتا ہے

اسی میں سے نکلتے ڈوبتے رہنا ہے مجھ کو
بھنور خوابوں خیالوں کا جو اکثر گھومتا ہے

جہاں بھی سانس لینے کو میں رُکتا ہوں گھڑی بھر
وہیں ڈھول اور دھوئیں کا ایک چکر گھومتا ہے

دلِ آوارہ اپنی موج میں پھرتا ہے دن رات
ترے کوچے میں لیکن بچ بچا کر گھومتا ہے

ہمارے پیار کا پہیّا اندھیرے اور سویرے
کبھی ہم رُکنے لگتے ہیں تو بہتر گھومتا ہے

انہی اطراف میں اُڑتے ہیں پتّے راستوں پر
یہیں پر گردباد خواب دن بھر گھومتا ہے

میں خود کب گھومتا ہوں صرف اِتنا ہے کہ اب کے
جہاں میں ایستادہ ہوں وہ محور گھومتا ہے

معانی سے ، ظفر ، رشتہ نہیں کوئی بھی جس کا
مرے سر میں وہی لفظوں کا پیکر گھومتا ہے

-☆-

وہ رنگ نہیں کھلتے ، وہ ذات نہیں آتی
بادل تو برستا ہے ، برسات نہیں آتی

اِک عمر سے پھیلی ہے یہ شام سی کیوں مجھ میں
تاروں کو ترستا ہوں ، کیوں رات نہیں آتی

گاتیں نہیں جنگل میں مُنہ زور ہوائیں بھی
جس روز پرندوں کی بارات نہیں آتی

کچھ رنج بھی اب دل میں آتا ہے کفایت سے
افراط نہیں ہوتی ، بہتات نہیں آتی

بے سُود ہی کرتا ہوں گونگے کی طرح کوشش
بھرپُور ہوں اندر سے ، اور ، بات نہیں آتی

اُس کے لیے گلشن سے جاتے نہیں اب تحفے
میرے لیے صحرا سے سوغات نہیں آتی

اتنی سی شکایت ہے اُس موجِ محبت سے
ہوں بھی اگر آنے کے حالات ، نہیں آتی

میں بھاگتا پھرتا ہوں بے سُود تعاقب میں
یہ شعر کی تتلی ہے جو ہاتھ نہیں آتی

کرتے ہیں ، ظفر ، جا کر اب خود ہی سوال اُن سے
گھر میں تو گداگر کے خیرات نہیں آتی

-☆-

جا چکا ہے وہ مگر شامِ جدائی خوب صورت ہے
اُس سے بھی بڑھ کر غبارِ بے وفائی خوب صورت ہے

جو نظر کے سامنے ہے وہ بھی کچھ کم تو نہیں ، لیکن
جو ابھی دیکھا نہیں ہے انتہائی خوب صورت ہے

ادھ کھلے اطراف میں ہر سُو دھواں سا ہے دھنک جیسا
آخر آخر حسرتوں کی رُونمائی خوب صورت ہے

جب وہ ناممکن نظر آیا تو اُس کا دھیان ہی چھوڑا
قید بھی اچھی رہی لیکن رہائی خوب صورت ہے

اختیاری کے بجائے بات مجبوری کی ہے ، ورنہ
آشنائی سے تو خوابِ آشنائی خوب صورت ہے

شاید اتنی خوب صورت شے نہ ہو گی خود محبت بھی
کیا کہوں کتنا یہ رنجِ نارسائی خوب صورت ہے

یہ مسافت وہ ہے جس کا نام بھی کوئی نہیں ، لیکن
رات بھر یہ خواہشوں کی پرکشائی خوب صورت ہے

کچھ گزر اوقات بھی اس سے نہیں ہوتی کسی صورت
صرف اتنا ہے کہ لفظوں کی کمائی خوب صورت ہے

کیا خبر کس طرح کا ہو گا ترا طرزِ نوا ، لیکن
اے ظفر تیرا یہ رنگِ بے نوائی خوب صورت ہے

-☆-

اُس پہ ہوائے دل کا اثر دیکھنا تو ہے
ہونا تو خیر کیا ہے ، مگر دیکھنا تو ہے

وہ ہے سو ایک منزلِ موہوم ہی سہی
ہم ہیں سو ہم نے خوابِ سفر دیکھنا تو ہے

کر لے گا اعتبار ہمارا بھی ایک دن
کچھ روز اُس نے عیب و ہنر دیکھنا تو ہے

یہ چشمِ وا کشادہ خود اپنی سزا ہے آپ
جو کچھ دکھائے شام و سحر ، دیکھنا تو ہے

اُس کی بھی پیروی ہمیں لازم سہی ، مگر
اپنا بھی ہم نے نفع و ضرر دیکھنا تو ہے

جو بھی وثوقِ وصل تھا سب پہ ہے آشکار
بنتی ہے کس طرح سے خبر ، دیکھنا تو ہے

بے موسمے گلاب کھلاتے رہے جو ہم
اب خواہشوں کو خاک بسر دیکھنا تو ہے

اچھا نہیں ہمارے لیے تو نہ ہو ، مگر
ہم نے بھی ، اے بُرے! ترا گھر دیکھنا تو ہے

آگے کی طرح چلنا ہے بے سمت ہی ، ظفر
پھر بھی ، نشانِ راہ گزر دیکھنا تو ہے

-☆-

شعر کی چھابڑی لگاتا ہوں
اِک صدا ہر گھڑی لگاتا ہوں

سب کو بتلائی ہے دُکان بُلند
اصل میں تو پھڑی لگاتا ہوں

کُچھ نہیں اختیار میں میرے
خالی خولی تڑی لگاتا ہوں

دُوسرے تو میانہ رو ہیں بہُت
ہانک مَیں ہی بڑی لگاتا ہوں

وہ تو کرتا ہے درگزر پھر بھی
مَیں ہی اپنی اڑی لگاتا ہوں

کام ہوتا ہو پاؤ بھر سے جہاں
مَیں وہاں پر دھڑی لگاتا ہوں

ڈھونڈتا ہوں مَیں زخم پر ہلدی
اور کبھی پھٹکڑی لگاتا ہوں

پانی پیتا ہے وقت پر مُجھ کو
مَیں گھڑے پر گھڑی لگاتا ہوں

خود گرفتارِ خواب ہے جو ظفرؔ
مَیں اُسے ہتھکڑی لگاتا ہوں

☆

تیغِ جفا کے سامنے آپ ہی ڈھال ہو گئے
ایسی مثال پیش کی ، ایک مثال ہو گئے

چھائے چلے گئے تمام سلسلہ ہائے زیست پر
پہلے بس ایک خواب تھا، پھر وہ خیال ہو گئے

رُک نہ سکی گرے ہوئے سُرخ لہُو کی روشنی
شامِ غروب ہو کے وہ صبحِ جمال ہو گئے

رسمِ وفا تو سربسر آپ کے گھر سے ہی چلی
جس کا شروع تھے کبھی ، اُس کا مآل ہو گئے

کب سے دلِ فسُردہ میں موجِ فرات اُٹھی نہیں
کتنی ہی عُمر جھڑ گئی ، کتنے ہی سال ہو گئے

گرتے ہُوؤں کو آپ نے حوصلہ دگر دیا
سب کو لیا ہے بڑھ کے تھام، سب کی سنبھال ہو گئے

نامِ حُسینؓ لے کے جب اُٹھنے لگا زمیں سے مَیں
بوجھ مرے وجُود کے سب پر و بال ہو گئے

ایک خرامِ ناز سے صاف ہُوئیں رُکاوٹیں
صِدق و صفا کے راستے سارے بحال ہو گئے

ایسا سبق پڑھا دیا اُس نے کٹا کے سر، ظفرؔ
اہلِ زوال تھے سو ہم اہلِ کمال ہو گئے

☆

ظفر اقبال کی عصرِ حاضر میں موجود گی تخلیقی فضا کے لیے ایک نعمت ہے۔ اُس نے جہاں اُردو ادب کو ایک مُہلک روایت سے نجات دلانے کا آغاز کیا، وہاں اُردو شاعری اور تنقید میں ایسے نئے خوش کُن امکانات کو روشن کیا جو اس سے پہلے موجود نہیں تھے۔

ظفر اقبال کے اِس رویے نے اُردو ادب کے قاری اور لکھنے والوں کو اتنا متاثر کیا:

گویا یہ بھی اُن کے دل میں تھا

بھارت اور پاکستان میں اُس کی مقبولیت حیرت انگیز ہے۔ ظفر اقبال کے اِس اندازِ سُخن کو رد کرنے والے بھی ہیں، مگر اِس کو قبول کرنے اور اِس کے اثر میں آئے ہوئے شعرا اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بھارت میں الٰہ آباد سے شائع ہونے والے رسالے ''شب خون'' کے مُدیر شمس الرحمٰن فاروقی، جو وہاں بہت بڑے نقاد مانے جاتے ہیں، کے مُطابق: اِس وقت برِصغیر میں ظفر اقبال جیسا شاعر اور نقاد دُوسرا اور کوئی نہیں۔

مُنیر نیازی

''روایتی'' کی اِصطلاح ایسے شاعر یا شاعری کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جس میں روایت کے ابدی اور غیر فانی عناصر موجود نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر وہاں، جہاں شاعر، ابدی اور فانی عناصر میں تمیز نہیں کر پاتا۔ ظفر اقبال یقیناً روایت کے ابدی اور فانی، دونوں قسم کے عناصر کی شناخت رکھتے ہیں، اور ان معنوں میں روایت شکن ہیں کہ روایت کے غیر ابدی اور فانی عناصر پر وار کرتے ہیں۔ غیر ابدی عناصر کو گرفت میں لا کر آپ وقتی طور پر تو پذیرائی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن پذیرائی کا تسلسل آپ کے نصیب میں نہیں آ سکتا۔ وہ تسلسل، جسے ظفر اقبال نے حاصل کیا ہے۔ ظفر اقبال کے شعری پذیرائی کا تسلسل اُن کے ہم عصر شعرا اور قارئین سے لے کر اُن کے بعد کی نسل کے قارئین اور شعرا تک چلتا ہے۔ دورِ حاضر کے شعرا کی فہرست سازی کا کوئی بھی عمل ظفر اقبال کو نظر انداز کرنے کی استطاعت نہیں کر سکتا، کہ وہ اُردو کی شعری روایت کے تسلسل میں ایک ناقابلِ تنسیخ کڑی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

ظفر اقبال نے اپنی ساری زندگی ''ظرفِ تنگنائے غزل'' کو وسعت بخشنے کی سعی میں گزار دی ہے، سو میں اُنھیں ''روایت شکن'' نہیں، ''روایت کی آبرو'' کہتا ہوں۔

محمد خالد

ظفر اقبال کا "وہم و گماں"

اُردو کی شعری روایت میں ظفر اقبال اپنے جرأت مندانہ اقدام، خوشگوار انحراف اور تجرباتی تنوع کے سبب خاصے معروف ہیں۔ 'رطب و یابس' اور 'گلافتاب' کی اشاعت کے بعد غزل کی مستحکم روایت میں رُجحان ساز تبدیلیوں کا احساس عام ہُوا۔ غزل کی محدود لفظیات اور مخصوص طرزِ فکر میں ظفر اقبال نے یکسر نئے اِمکانات روشن کیے اور ماندگی کے طویل وقفے کے بعد غزل نئی لفظیات اور نئے تجربات سے آشنا ہُوئی۔ فرسودہ مضامین اور بے جان لفظوں میں اپنی تخلیقی فطانت سے نئی قوت اور توانائی پیدا کرنا ظفر اقبال کا عہد ساز کارنامہ ہے۔ غزل کی روایت اور صنفی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہُوئے اِمکانات کی جُستجو جتنی دُشوار تھی اُتنی ہی ناگزیر بھی۔ ظفر اقبال نے روایت اور انحراف کے درمیان توازُن کے اس دُشوار مرحلے کو نہایت فن کاری سے انجام دیا۔

وہ الفاظ جو اپنے مزاج و آہنگ کے اعتبار سے غزل کی روایت سے بظاہر ہم آہنگ نہیں تھے، ظفر اقبال نے نہ صرف یہ کہ اپنی غزلوں میں استعمال کیے، بلکہ اُن کی مدد سے اپنی غزلوں میں تازگی اور نئے پن کی خوشگوار فضا پیدا کی۔ اِسی طرح مضامین اور موضوعات کی روایتی حد بندیوں سے غزل کو آزاد کرنے میں ظفر اقبال نے کمالِ ہُنرمندی کا ثبوت دیا۔ ظفر اقبال کی غزلوں کا مُطالعہ مضامین کے تنوع، طریقۂ کار کی ندرت اور نئی لفظیات کے سبب قاری کے لیے خوشگوار تجربہ ہے۔ پرواز کے لیے تازہ فضاؤں کی جستجو اور سفر کے لیے ہر آن نئی سمتوں کی تلاش ظفر اقبال کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ تازگی اور ندرت کی خاطر وہ ہر نوع کے تجربات روا رکھتا ہے۔ اپنی اس روش کی طرف اُس نے اپنے کلام میں بارہا توجہ دلائی ہے:

یہ سفر وہ ہے کہ ہیں اس کے تقاضے بھی نئے
کبھی رہبر، کبھی رستہ، کبھی رفتار بدل

مَیں نیا طرزِ بیاں کرتا ہُوں یوں ہی ایجاد
اہلِ انکار وہیں دیتے ہیں معیار بدل

☆

بھلے ساون کا اندھا ہُوں کہ تصویرِ ہوا میں
جہاں پیلا ہے مَیں اُس کو ہرا کرتا رہوں گا

نکل جاتا رہُوں گا جس طرف بھی جی میں آئی
یُونہی تبدیلیِ آب و ہوا کرتا رہُوں گا

اپنی شاعری کی بعض صفات اور مخصوص طریقۂ کار کی جانب شاعر نے جابجا اشارے کیے ہیں۔ اگرچہ شاعری کی تفہیم و تعبیر میں خود شاعر کے اپنے بیانات کچھ زیادہ لائقِ اعتبار نہیں کہ یہ قاری کا منصب اور اُس کا وظیفہ ہے، لیکن ظفر اقبال کے ان شاعرانہ بیانات کی تصدیق اُن کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔

ظفر اقبال کی غزلیں اس لیے بھی قاری کو متوجہ کرتی ہیں کہ ندرت اور نئے پن کے باوجود یہ روایت سے وابستہ ہیں۔ لفظیات اور طرزِ اظہار کی سطح پر برتے گئے بھی تجربات ایک تسلسل کا حصہ ہیں اور اپنی پشت پر ماضی کے مستحکم وسیع سرمایے کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ظفر اقبال کے اشعار میں تبدیلی اور نئے پن کے احساس کے باوجود اس کی نشان دہی دُشوار ہو جاتی ہے کہ غزل کے یہ مانوس مضامین کس پُراسرار عمل سے اجنبی اور تازہ کار نظر آنے لگے ہیں۔ پُرانے کو نیا کرنے کا یہ عمل یا مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ معقول سے قریب تر ہونے کا احساس اُن کی بیشتر غزلوں میں موجود ہے۔ ظفر اقبال کی یہ شعوری کاوش، پُرانے مضامین و موضوعات کا یکسر نیا پہلو منکشف کر دیتی ہے اور اِسی میں اُن کی فن کاری کا راز مُضمر ہے۔ وہ قاری کو بھی بار بار اس جانب متوجہ کرتے ہیں۔

کسی شے میں ظفر بس کچھ مِلا دیتا ہُوں چپکے سے
یہ طرزِ خاص ہے میری جسے مَیں عام رکھتا ہُوں

☆

یہی پیرایۂ اظہار ہے جو آخرِ کار
اپنے جادُو سے پُرانے کو نیا کرتا ہے

☆

ہلتا جلتا بھی ہوں کچھ کچھ سب سے
مختلف ہوں مگر اتنا بھی نہیں

☆

معقول کے ہے عین مطابق جو بات
اُس بات پہ حیران بھی ہو سکتا ہوں

معقول کی باتوں پر حیرانی اور غیر معقولی صورتِ حال پر عام سا ردِعمل اپنے آپ میں ایک تجربہ ہے۔ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور وسائلِ اظہار پر مکمل دسترس کے باوجود ظفر کے شعری تجربات اتنے پیچیدہ اور اس کے انسلاکات اتنے لطیف تر ہیں کہ اظہار کی نارسائیوں کا اُسے شکوہ بھی رہتا ہے۔ وہ اپنے عجزِ بیاں کا معترف ہے کہ جو باتیں اُسے کہنی تھیں، الفاظ اُن کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ تنگنائے غزل سے نکل کر بیان کے لیے مزید وسعتوں کی خواہش کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ لطیف شاعرانہ ادراک کے ناقابلِ بیان ہونے کا شکوہ ہے۔ شعری تجربے کے کسی پہلو کو نمایاں کرنے میں اس کے بے شمار رنگ شاعر کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں اور فن کار نارسائی کے کرب سے دوچار ہوتا ہے:

میں بھاگتا پھرتا ہوں بے سُود تعاقب میں
یہ شعر کی تتلی ہے جو ہاتھ نہیں آتی
بے سُود ہی کرتا ہوں گونگے کی طرح کوشش
بھرپور ہوں اندر سے اور بات نہیں آتی

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ ظفر اقبال کے مسائل اور اُس کی باطنی واردات دیگر شعرا سے کافی مختلف ہے۔ وہ تخلیق کے لمحوں میں ایک عجیب پُر اسرار صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے، جو غالباً دوسرے شعرا کا مسئلہ نہیں اور وہ مسئلہ ہے لفظ و معنی کے باہمی رشتے کا۔ تعبیر و تشریح سے قطعِ نظر وہ خود الفاظ اور اُن سے وابستہ کیفیات کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ اُس کے پیشِ نظر لفظوں کے ایسے بھی پیکر ہیں، جن کا معنی سے بہ ظاہر کوئی رشتہ نہیں۔ شعری اظہار، معانی و مفاہیم سے قطعِ نظر خود اپنے آپ میں لطف کا پہلو رکھتا ہے، جسے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ ظفر اقبال کے درج ذیل اشعار اُن کی اس کشمکش پر روشنی ڈالتے ہیں:

معانی سے ظفر رشتہ نہیں کوئی بھی جس کا
میرے سر میں وہی لفظوں کا پیڑ گھومتا ہے

☆

بات کا لطف اُٹھا سکو تو اُٹھاؤ
بات ہے بات کا سمجھنا کیا

☆

جو بھی کہنا تھا کہہ دیا میں نے
معنی اب جو بھی اس بیاں سے نکال

غزل کی روایت میں شاعر کی باطنی واردات کو ہمیشہ مرکزیت حاصل رہی ہے اور اسی باطنی کائنات کی بوقلمونی پر شاعر کی انفرادیت کا انحصار بھی ہے کہ وہ کس طرح خارجی تجربات کو باطنی واردات میں منقلب کرتا ہے اور یکسر نئے پیرایۂ اظہار میں بیان کرتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ظفر اقبال کی غزلیں مطالعے کا دلچسپ موضوع ہیں کہ اُس کا شعری ادراک، اشیا اور مظاہر کو کس طرح قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے نگار خانے کی زینت بناتا ہے۔ شب کی کیفیات، لہو کی گردش، غروبِ شام، برسات کا منظر، بامِ خیال، نیلے پیلے رنگ اور بیک وقت متضاد کیفیات کی موجودگی ظفر اقبال کے باطنی منظر نامے کے اہم تشکیلی عناصر ہیں۔ ان اشعار کی استعاراتی توجیہ کے بجائے انھیں لغوی سطح پر قبول کرنے میں بھی چنداں مضائقہ نہیں کہ شاعرانہ ادراک، اشیا و مظاہر کو یکسر مختلف انداز میں دیکھتا اور اپنی شرطوں پر قبول کرتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

کچھ شوق نہ تھا اتنا ہمیں دل کے سفر کا
باہر سے پڑی مار تو اندر نکل آئے

☆

دھوپ لگتی ہے تو جا کر بیٹھ جاتا ہوں وہاں
میرے اندر ہی کچھ اتنا سایۂ اشجار ہے

☆

نیلے پیلے رنگ بدلتی رہتی ہے
اندر کوئی چیز مچلتی رہتی ہے

دھوپ دھڑکتی رہتی ہے کہیں ایک طرف
کہیں بدن میں شام سی ڈھلتی رہتی ہے

☆

اُترا تھا ابھی ایک اندھیرا سا لہو میں
اور چاروں طرف پھیل گئی رات ہماری
باہر تو کسی طور بدلتا نہیں موسم
اندر ہی برا کرتی ہے برسات ہماری

☆

ماؤ میں تو ایک رگوں میں رواں ہی تھا
ہام خیال پہ یہ نیا اور کون ہے

ممکن نہیں ہے مجھ سے تو آتی شکست و ریخت
اس دل میں تیرے ساتھ بنا اور کون ہے

مُعاصر شعرا کے مقابلے میں ظفر اقبال کا اختصاص یہ ہے کہ نئی شاعری کے مسائل اور مضمرات سے وہ بہ خوبی آگاہ ہیں۔ شب خون کے مارچ 1994ء کے شمارہ نمبر 192 میں اُن کا ایک فکر انگیز مضمون "جدید اُردو غزل اور نئی شعریات کی ضرورت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے نئی شاعری سے مُتعلق ہیئت سے نکات سے بحث کی ہے۔ غزل کی نئی شعریات کی ضرورت پر انھوں نے اصرار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "لفظ کے استعمال میں کسی حد تک یا بقدرِ ضرورت من مانی کو روا رکھا جائے، کیوں کہ اس طلسم زار میں داخل ہونے کا دروازہ حرف اور صرف لفظ ہے۔ شعر میں ایک ہی لفظ کا غیر معمولی، غیر متوقع یا غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اُس کی کایا پلٹ سکتا ہے۔ لفظ کبھی بھی اور کسی بھی مقام پر بے معنی نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہو سکتا ہے، بلکہ لفظ کا کوئی بھی عجیب استعمال معانی کے نئے در کھولنے کا باعث بنتا ہے"۔

(شب خون شمارہ نمبر 192 صفحہ 8)

ظفر اقبال کا بنیادی مسئلہ، شاعری کے اُس روایتی حصار سے خود کو آزاد کرنا ہے جس میں بند رہ کر عافیت کے ساتھ، مانوس پیرایۂ اظہار میں، مقبول عام شاعری کی جا سکتی تھی۔ انھوں نے فوری شہرت اور وقتی مقبولیت کے اس مُجرّب نسخے کے بجائے، غیر روایتی اور نامانوس پیرایۂ اظہار کی پُر خطر راہ پر چلنے کا جوکھم اُٹھایا کہ روایتی مضامین اور مانوس اسالیب کی بے جان فضا میں سانس لینا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ گذشتہ لگ بھگ چالیس برسوں کی انتھک کوشش سے ظفر اقبال نے اپنا ایک ایسا اُسلوب دریافت کر لیا ہے، جس سے اب غزل کا عام قاری بھی مانوس ہو چکا ہے۔ یہ شاعر کی بڑی کامیابی ہے کہ شاہراہِ عام پر چلنے کی سہل پسندی سے انحراف کر کے اُس نے ایک نئی راہ دریافت کی اور اپنی شرطوں پر قارئین کو نئے ذوق اور ذائقے کا خوگر بنایا۔ ظفر اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ وہ لسانی تجربہ ہے جس نے شاعری کی فضا میں ایک نیا اور انوکھا رنگ شامل کر دیا ہے۔ ایسے الفاظ، استعارے اور تراکیب، جو اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکے تھے اور جن کے انسلاکات اور تلازمات، کہولت کے سبب اپنی روشنی کھو چکے تھے، ظفر اقبال کی شاعری میں نظر نہیں آتے۔ ظفر اقبال کی غزلوں میں، تو مولود الفاظ یکسر نئے مفاہیم اور انسلاکات کا حلقہ تعمیر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، جن کی طرفگی اور ندرت قاری کے لیے ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ ظفر اقبال نے بے رنگی کو مخصوص سیاق و سباق میں رکھ کر ایک انوکھے رنگ کی حیثیت سے قاری کے سامنے پیش کیا۔ اُن کی خواہش ہے کہ وہ ایک ایسی تصویر بنانے میں کامیاب ہو سکیں جو منظر، خط اور رنگ کی روایتی پابندیوں سے آزاد ہو۔ یہ خواہش دراصل ایسے مناظر، خطوط اور رنگوں کی تلاش سے عبارت ہے جن کی صفات اور خصوصیات مُتعین نہ ہوں اور دیکھنے والوں پر اُس تصویر کا ردِ عمل پہلے سے طے شدہ نہ ہو۔ اس کے لیے ظفر اقبال نے یکسر نئی لفظیات کے علاوہ ایسا سیاق و سباق بھی تیار کیا ہے کہ الفاظ اس نئی ترکیب میں ایک انوکھا منظر خلق کر دیتے ہیں۔ ظفر اقبال کے اس لسانی تجربے کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ذیل کے اشعار سے بھی ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا بنیادی سروکار اُن کے لیے کتنا واضح اور روشن ہے:

بے منظر، بے خط، بے رنگ
ایسی ایک بنا تصویر
یہ بھی ہے موجودگی کی ایک شکل

ہر طرف جو یہ خلا موجود ہے

☆

سوچتا رہتا ہوں لوگوں اور لفظوں میں
میرا رشتہ کس کے ساتھ زیادہ ہے

☆

اک طرح کا شائبہ سا ہے کہیں
اک نیا سا ذائقہ موجود ہے

☆

ظفر اس بھیڑ میں گم ہی نہ ہو جاؤں کہیں جا کر
جدھر سارے کے سارے ہیں اُدھر ہونے سے ڈرتا ہوں

لفظوں کے ذریعہ بے منظر، بے خط اور بے رنگ تصویر بنانے کا حوصلہ عام صلاحیت کا شاعر تو کر ہی نہیں سکتا، بلکہ شاید اپنی ایسی کسی خواہش کو وہ نام بھی نہیں دے سکتا۔ ظفراقبال نے، فرد یا معاشرے کے مخصوص مسائل کے بجائے اپنی شاعری کی بنیاد، لفظوں کے بے نہایت امکانات کی دریافت پر رکھی۔ لفظوں کے نئے انسلاکات کی جستجو کا جیسا شوق اور ملکہ ظفراقبال کے یہاں ملتا ہے، دُوسرے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ آبِ رواں کی اشاعت (1962ء) سے لے کر آج تک ظفراقبال نے شاعری کی زبان کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا ہے، اُس سے زبان کے امکانات بہت کھل کر سامنے آئے ہیں۔ شاعری کی زبان کے ساتھ، سبک اندام یا نرم و نازک آبگینوں جیسا معاملہ کرنے کے بجائے، مردانہ تشدّد اور کھردرے پن سے کام لے کر، ظفراقبال نے زبان کے فطری تقاضوں کو اہمیت دی ہے۔ شاعری کی تاریخ میں اسے ظفراقبال کا عہد ساز کارنامہ تصوّر کرنا چاہیے۔ ''گلافتاب'' کی اشاعت پر (1966ء) اپنی شعری ترجیحات کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا تھا کہ:

''چھوئی مُوئی کے بجائے زبان کو زندہ، متحرک شے گردانتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ یہ آزادیاں لی ہیں، پنکچوایشن یکسر اڑا دی ہے، کہ معنی کو محدود و پابند کرتی ہے۔ اضافت سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ گرامر کی گھٹن بھی اب ویسی نہیں رہی۔ اب میں سانس لے سکتا ہوں۔ (فلیپ: گلافتاب)

عشق ومحبت کے معاملات کو بھی، ہجر و وصال کے محدود دائرے سے نکال کر ظفراقبال نے شگفتگی اور ذہنی انبساط کی یکسر نئی فضا فراہم کی ہے۔ اس نئی فضا میں، محبت عاشق کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہونے کے بجائے زندگی کے دُوسرے تجربات کی طرح فقط ایک تجربہ ہے اور بس! معاملاتِ عشق میں رسمی اور روایتی آداب سے گریز کرتے ہوئے، عاشق کی پیش قدمی بے جھجک مردانہ رویّہ، اور قدرے بے حجابی، لطف کا انوکھا پہلو نمایاں کرتی ہے۔

میں بدل سکتا جو ہوتا تو بدل ہی لیتا
یہی بہتر ہے کہ تُو ہی کہیں رُخسار بدل

☆

اور احسانِ وصل کیا لیتا
پہلے ہی زیرِ بار ہوں اتنا

☆

کچھ ہم بھی رہے اپنے شب و روز میں مصرُوف
کچھ ٹال دی اُس نے بھی مہینے پہ مُلاقات
کمرے میں ہو مُٹھ بھیڑ کہ زینے پہ مُلاقات
سہتا ہوں میں اُس شوخ کی سینے پہ مُلاقات

☆

خُود کھلا غنچۂ لب اُس کا ظفر
یہ شگوفہ نہیں چھوڑا میں نے
تجھی جیسا وہ بھلا تھا مجھ کو
اُسے ویسا نہیں چھوڑا میں نے

☆

اُتار رکھی ہے دل کے ایک گرد آلود گوشے میں
گئی گُزری محبت کو گلے کا ہار کیا کرتے

☆

پسند آئے نہ آئے لیکن اپنے شوق میں ہم نے
یہ ملبوسِ محبت آپ کو پہنا تو رکھا ہے
نہیں ہے میری خاطر اے ہوائے شام تو پھر کیا
چلو باغِ بدن اس نے کہیں مہکا تو رکھا ہے

ظفراقبال نے پچھلے لگ بھگ چالیس برسوں میں لفظوں کے نئے استعمال سے پائمال روایتی الفاظ کو نئے سیاق و سباق میں رکھ کر معنی کی نئی دنیا آباد کرنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ وہ معنی کی ترسیل پر اصرار کرنے کے بجائے، اکثر تو اس کے مروّجہ انسلاکات کو، شعوری طور پر ساقط کرتے ہیں اور اُن کے اَن دیکھے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ معنی کی اس غتربود میں، ظفراقبال نے قواعد کی لسانی پابندیوں کی بھی پروا نہیں کی ہے۔ اس جرأت مندانہ اقدام سے غزل نے بلاشبہ نئی قوت اور توانائی حاصل کی ہے اور اس روایتی صنف کے نئے امکانات روشن ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر قاضی جمال حسین
شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں، ظفر
کہ رہے ایک طرف اور لگے چاروں طرف

اِفتخار عارف کے نام

"میں وہ زبان بولتا ہوں جسے صرف میں سمجھتا ہوں، کوئی اور نہیں،
جیسے کہ ہر کوئی صرف اپنی زبان سمجھتا ہے"
(ٹامس برن ہارٹ)

نئے ذائقوں کے زخم

ظفر اقبال جو کچھ کہ لکھتا ہے اور جیسا وہ لکھتا ہے اُس کے بارے میں ہمارے عہد میں ایک سنگین تشویش کی لہر دوڑی ہُوئی ہے۔ قاری اور نقاد دونوں کے پاس اپنے اپنے سوالات ہیں، جن کی وہ تشفی چاہتے ہیں۔ ایک طرف اُس کی قوتِ متخیلہ اور زورِ بیان دلوں کو کھینچتا ہے، دوسری طرف اُس کی پُرگوئی اور لسانی تجربات سے لوگ ڈرے ہُوئے ہیں۔ ایک ہی وقت میں مُخالف ردِعمل کے مابین ظفر اقبال کی غزل تفتیش اور جواز مانگتی ہے۔ سن 1960ء کی دہائی کوئی دُور کی بات نہیں، جب غزل کے ساتھ پہلی بار اینٹی غزل کا لیبل چسپاں کیا گیا تھا اور یُوں اِس اور ایسی غزل کو تغزّل کے معیار اور روایت کے حصار سے باہر کیا گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اِس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ سن 60ء کی دہائی کے اُبال کے تاریخی معنی کیا ہیں اور اپنے عہد کی تنقیدی زبان میں اُس جذبے اور کوشش کو، اور سب سے بڑھ کر اُس واردات اور شعری کائنات کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس کی تعمیر کے لیے لوگ آندھی کی طرح اُٹھے اور شام اور جھٹ پٹے کی روشنی کی طرح آنکھوں اور دل و دماغ پر چھا گئے۔

اِس بات کو اگر ہم ادبی تاریخ کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں تو کہیں گے کہ کیا ظفر اقبال کی غزل کا آواں گارد (Avant Garde) سے کوئی تعلق ہے اور یہ کہ آواں گارد تاریخی طور پر کیسے ظہور پذیر ہُوا اور اُس کی ممتاز علامات کیا ہیں۔ جنوری 1924ء کو انتونن آرتو (Antonin Artaud) نے ایک نظم بعنوان "آواز" رسالے میں چھپنے کے لیے بھیجی۔ وہ نظم یہ ہے:

ایک انجان آسمانی شاعر
اپنے دل کی کھڑکیاں کھولتا ہے
فلک ٹکراتے ہیں۔ نسیان
اِس گیت کو درہم کر دیتا ہے

خاموشی اور رات، سب
ناخالص چیزوں کو چھپا دیتی ہے
آسمان اپنے قوی زنگل قدموں کے ساتھ
بُلند آوازوں کے چوراہے کی طرف بڑھتا ہے

☆

ستارے ماند ہیں۔ ترچھا آسمان
بُلندی کی طرف مُڑتا ہے
شب ہمارے خوش خوراکی کے
بقایا کو سمیٹ لیتی ہے
سارے سمندر کو بُخارات میں تبدیل کر کے
سُورج دن سے بھی پست ہو گیا
اور ایک خواب عجیب لیکن واضح
اِس پاگل زمین پر پیدا ہُوا

☆

محوِ شاعر، اپنے آسمانی مکان کو
خیرباد کہتا ہے
زمین سے بھی دُور اُفتادہ خیال کو
اپنے بالوں بھرے دل کے ساتھ بھینچتا ہے

☆

ایڈیٹر نے شکریے کے ساتھ نظم واپس کر دی۔

آٹو میٹک تحریروں کا خاصہ ہے کہ یہ ادب کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں ارسطو کے نظریات کو چیلنج کرتی ہیں اور روزمرہ کے استعمال سے گھِسی پِٹی ہُوئی زبان کو اُس کی حرکی قوت واپس دلاتی ہیں۔ فن کار کا وظیفہ یہ نہیں کہ وہ فطرت کی نقالی کرے، یا تعقل اور منطق کی زنجیروں میں قید ہو جائے یا زبان عام گفتگو کی ترسیل کا آلہ بن جائے۔ فن اور زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ ہماری زندگی اور حقیقت کی تعریف میں توسیع پیدا کرتے ہیں۔ آندرے بریتوں

(Andre Breton) اپنے ناول ''ناجا'' (Nadja) کے بارے میں کہتا ہے کہ میری کوشش یہ تھی کہ میں ناول کی فارم کو بنیاد بنا کر ایک ایسے ناول کی عمارت تعمیر کروں، جو سب ''روایتی'' اُصولوں کو درہم برہم کر دے، جو نہ ہی بیانیہ ہو اور نہ ہی کردار کے مطالعہ پر مبنی ہو۔ ایسا ناول جہاں نقاد کسی بنے بنائے فارمولے کو آزمانے سے عاجز آ جائے، جو اپنے روایتی تنقیدی معیار اور اوزار کو استعمال نہ کر سکے۔

افتخار جالب نے ''گلافتاب'' کے دیباچے میں جن اہم اُمور کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ یہ ہیں:

1- ادب میں زبان کا پورا وجود بروئے کار آتا ہے۔ زبان اکائی اکائی جملوں میں، فرد، فرد جملوں میں، پیراگرافوں میں، اور پیراگرافوں کے اتحاد سے مکمل مضمون بنتی ہے، تو فکر کے رشتے سے، شعر کے حوالے سے نہیں کہ شعر بذاتہ وہ اکائی ہے جس کی ٹوٹ پھوٹ میں پیراگراف، فقرے اور الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

2- مختلف الفاظ ایک دوسرے سے فکر، گرامر اور جذباتی اُسلوب سے نہیں بندھتے، بلکہ الفاظ کی مخفی مناسبتیں چہ بلحاظ معنی اور چہ بلحاظ صوت و آہنگ وہ رشتے مُہیا کرتی ہیں۔

اور ظفر اقبال نے خود ہی اس کتاب کے فلیپ میں اس بات کا اقرار کیا ہے اور اسے منظور کے طور پر قبول کر لینا چاہیے کہ ''جن چشموں سے اس زبان نے ابتدا میں توانائی حاصل کی اور جو ایک مدت سے اس پر روک دیے گئے تھے، میں نے انھیں پھر سے رواں کر دیا ہے۔ یہ تازہ خون اُردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دُور کرنے کے لیے ضروری تھا۔ دکل شیز کا یہ پہاڑ کاٹنے کے لیے جہاں میں نے لفظوں کو نئے جوڑ توڑ سے رُوشناس کیا ہے، وہاں کسی قدر توڑ پھوڑ بھی روا رکھی ہے۔ اس ڈسٹورشن سے لفظوں کی شخصیت اندر سے بھی بدلی ہے۔ نئی ساز باز سے لفظوں کے مابین نئے رشتے بھی اُستوار ہوئے ہیں، اور ابلاغ کی نئی سطحیں دریافت ہوئی ہیں۔''

یہی آواں گارد کا وظیفہ تھا۔

چھٹی دہائی کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔

ادبی حلقوں اور رسائل میں ایک غلغلہ سا مچا ہوا تھا۔ آرٹ اور اینٹی آرٹ کے مباحث۔ جہاں آرٹ کے ارتقا کو روایت کے پس منظر میں دیکھا جا رہا تھا، وہاں یار لوگ گھاس کے اوپر آلتی پالتی مار کے اور حشیش کے سگرٹوں کے لیے کش لے کر ننگے پن کو قدر کے طور پر قبول کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف کامیو، سارتر اور سیمون ڈی بووار کی مثلث تھی۔ دُوسری طرف جوائس، بیکٹ اور آئنسکو کی نثر اور ڈراما استدلال کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ وجودیت اور آزاد انتخاب کے مسائل ادب کے بدن سے سانپ کی طرح لپٹ گئے تھے۔ وجودیت نے ہمارے ٹھہرے اور سہمے ہوئے فکر میں ایک نئی کھڑکی کھولی تھی۔ دُنیا کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا نیا انداز ملا تھا۔ وہاں اس سے جلا اور بجھا ہوا ادب زمین کے گوشوں کو منور کر رہا تھا۔ اگر تسلسل اور سلاست روایت کی نشانی تھی، تو انقطاع اور اکھڑپن نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

نئے بورژوا معاشرے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ شاعر، ادیب، افسانہ نگار دُوسروں کے بارے میں لکھنے کے بجائے خود کو ''میں'' کا مفروضہ بنا کر دُنیا کی بادیہ پیمائی کرنے لگے۔ اپنے آپ میں اُتر کر اپنے اندر کی تلاشی لینے لگے ایسی غواصی جس میں زبان کی اُلجھن کو بھی رد کر دیا گیا۔

وجودیت نے ایک نیا ذخیرۂ الفاظ تخلیق کیا۔ موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ تخلیق کا جوش اور رنگا رنگی لوٹ آئی۔ ادب میں ہماری زندہ حقیقتیں ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوئیں۔ جہاں شعور کی حدیں ٹوٹی جانے لگیں، امکانات کے دروازے کھولے جانے لگے، وہاں انسان کے اندر کی تنہائی اور خاموشی بھائیں بھائیں کرتی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جہاں سارتر کے اس فقرے نے کہ شعور ہمیشہ کسی شے کا شعور ہوتا ہے اور بجز بذاتِ خود کچھ بھی نہیں۔ اس نے انسانی باطن کو چیزوں سے اور ناموں سے اور اشیا کے رشتوں سے بھر دیا۔ کہانی چیستان اور نظم معما بن گئی۔ پھر بھی وہ دہائی اچھی تھی۔ تخلیقی اُپج، جوش، اُبال سے بھرے ہوئے تھے۔ دُنیا جوان اور خوب صورت لگتی تھی اور سب سے بڑی بات لکھے ہوئے لفظ کی حرمت تھی اور وہ خود سے قریب محسوس ہوتا تھا۔ دُنیا کو نروان دلانے کے بجائے اپنے لیے نروان کی تلاش۔

اس سے پہلے پیرس میں Gertrude Stein کا گھر اُدبا و شعرا اور پینٹرز کا گڑھ تھا۔ روز شام کو ملاقاتیں ہوتیں۔ زبان میں اُس کی قوتِ نمو کو حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے مفروضے گھڑے جانے لگے۔ عجیب جذباتی رشتے قائم ہوئے۔ پال ایلوا (Paul Eluad) شاعر محبت اور انقلاب کے گھر میں سلوا تور دال (Dali) کا آنا جانا تھا۔ وہ اُس کی بیوی لے کر چلا گیا۔ ایک دن بہت بعد میں جب ایلن گنش برگ (Allan Gindeng) کو مشاعرے کا دعوت نامہ ملا تو وہ ڈرتے جھجکتے شرماتے ہوئے ڈائس پر گیا۔

اور پہلے اپنی قمیص اُتاری پھر بنیان پھر پتلون اور مکمل برہنہ حالت میں اپنی عظیم نظم 'Howl' پڑھی، جس کا مصرع ہے: ''اُس نے اپنے عہد میں بہترین دماغوں کو غارت ہوتے ہُوئے دیکھا۔'' یہ وہ زمانہ تھا، جب تخلیقی قوت کی افزائش کے لیے LSD کا رواج تھا۔ ولیم بروز (William Burroughs) نے ناول کی دُنیا میں 'Naked Lunch' جس کی کتاب تہلکہ مچا دیا تھا، مُستقل ڈرگز کا عادی تھا، جس نے نثر نگاری کا ایک نیا مکینیکل اور انوکھا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ یہ سب کام زبان کی قوّتِ نمو کو واپس لانے کے پس منظر میں تھا۔

Tack Kerovac کے ناولوں سے بیٹ جنریشن کا آغاز ہوتا ہے۔ لمبے بالوں کے خم دار گچھوں میں، جین پہنے ہُوئے نوجوان، گھر سے بھاگے ہُوئے، تھوڑے سے پیسے جیبوں میں لے کر لفٹ لیتے ہُوئے امریکا کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک آزادی، خوشی اور راحت کی تلاش میں نکلے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب بے روزگاری جُرم نہیں، نعمت تھی۔ ساری ساری رات ایک دُوسرے کے ساتھ گفتگو میں بسر کرنے والے اُس طرزِ زندگی کو اپنا آئیڈیل بنا بیٹھے۔ سیاسی طور پر بائیں بازو کے خیالات سے اتفاق کرنے والے، جنسی آزادی کا مفہوم ہی جن کے نزدیک 'بوطیقا' کا درجہ رکھتا تھا۔ اچھے دن تھے۔ ادیب موضوع کے بجائے خُوشی کی تلاش میں نکلے تھے اور شکست و ریخت، کترِ بیونت اور چھینا جھپٹی کے باوجود گھٹن سے مُبرّا اور پژمردگی سے دُور اُمید کے ساتھ جینا چاہتے تھے۔ یہ اُمید ہی سرخوشی کی علامت تھی۔ یہی 60ء کی دہائی کا امتیازی نشان ہے۔

اب جب اُس عہد کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو اُس زمانے میں سوائے چند افسانوں، چند نظموں اور ظفر اقبال کی 'گلافتاب' کے کوئی تحریر اس عہد کی رُوح کی نمایندگی نہیں کرتی۔ اُس کی قوّتِ مُتخیلہ کی شدت، زورِ بیان، تصویر کشی میں چابک دستی، اور کُھل کھیلنے کی جُرأت وہ وصف ہیں جو اُس کی شاعری کو امتیازی شان دیتے ہیں۔ ایک دن گورنمنٹ کالج میں جیلانی کامران، جو انگریزی ڈراما پڑھاتے تھے، کے کمرے میں مرحوم انور ادیب 'گلافتاب' جو ابھی ابھی پریس سے چھپ کر آئی تھی، لائے، پھر کالج کینٹین میں سہ پہر کے ڈوبتے ہُوئے سورج کے رُوبرو کتاب کا مُطالعہ ہوتا رہا۔ کتنے ہی دن اس انوکھی دریافت پر Excitement رہی۔ غزل کی شکل وصورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کہاں لوگ رینگ رینگ کر، ڈر ڈر کر مصرع سازی کر رہے تھے، کہاں یہ ایک سمندر کی سی کیفیت تھی۔ مضامینِ نو کے انبار تھے۔ اندازِ تحریر دلکش اور اچھوتا اور سب سے اہم بات، جہاں کتاب انتہائی سنجیدگی لیے ہُوئے تھی، وہیں پر ایک زیریں لہر غیر سنجیدگی کی، جسے ہم وجودی زبان میں Alienation کہہ سکتے ہیں۔ موضوع اور ''میں'' کے درمیان وہ علیحدگی پسندی اور مغائرت، اپنے آپ پر ہنسنے کی جُرأت اور ایک جارحانہ طریقے سے معاملہ بندی کا بیان، ہلکی ہلکی خوشگوار اور چُبھتی ہُوئی جنسیت، اخلاقی موضوعات کو نرالے طریقے سے ادا کرنے کا ڈھنگ۔ غرض اُس میں Quotable شعروں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اپنے عہد کی اور کوئی کتاب شاید ہی اُس کی مثال پیش کر سکے۔ یہ دریافت جس میں ظفر اقبال نے گرامری گھٹن سے باہر نکلنے کے لیے لسانی تشکیلات کا سہارا لیا تھا، قاری اور ادیب دونوں کے لیے ایک چیلنج کے طور پر سامنے آئی تھی۔

'گلافتاب' نے شعر کو Receive کرنے کے طریقے کو یکسر بدل دیا۔ اُن اُمیدوں اور توقعات میں توسیع پیدا کی، جس سے شعر کا مُطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ محسوسات اور غیر مرئی کی خلیج کو پاٹ کر ایک نئے انداز کی شبیہ سازی کی بنیاد رکھی۔ ایک دُنیا نئے وجود میں منتقل ہوتی ہُوئی ہمارے سامنے تھی۔ اکثر غزلیں غزلِ مُسلسل کے رُوپ میں ایک کہانی کو نظم کرتی ہُوئی نظر آتی تھیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ 'گلافتاب' ایک نئے طرزِ احساس کی آئینہ دار تھی۔ یہ غزل کی مُردہ زمین میں ایک کھُوئی تھی، جو کھلی۔ روایت سے پیوست اور گریز اور روایتی موضوعات سے انحراف اس دلیل کو ثابت کرتا تھا کہ وہ غزل کی عمارتِ کُہنہ کو اس حد تک جانتا اور پہچانتا ہے کہ وہ اُس کی مکمل کایا کلپ کر سکتا ہے۔ غزل ہمارے عہد کے تقاضوں سے آنکھ مِلانا سیکھ چکی تھی۔ اگر یہ کتاب بدنام ہُوئی اور شاعر رسوا ہُوا تو اس لیے بھی کہ اُس کی حرکی قوّتِ مُتخیلہ کے سامنے آدھے پونے شاعروں کی شاعری اور بھی چھوٹی محسوس ہُوئی۔ یہ غزل کی ماہیت اور قالب میں تبدیلی نہیں تھی، انقلاب تھا، اور انقلاب بغیر زور عایت کے اور توڑ پھوڑ اور شکستِ دیوار و در کے نہیں آتا۔ سب لوگ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ کتاب اس طرح ہی چھپی تھی۔ وہ زمانے ہی ایسے تھے، اب اگر اُس میں خامیاں اور شعری Excesses نظر آتی ہیں، تو یہ اُس عہد کے تقاضوں کے مُطابق تھیں۔ اب اگر محسوس ہوتا ہے کہ زبان کے تجربات کچھ مُعتدل ہوتے تو زیادہ قاریوں کو اپنی جانب راغب کیا جا سکتا تھا، زیادہ لوگوں کو دوست بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ عہد ہی ایسا تھا، اُس کا امتیازی وصف ہی حدوں کو توڑ کر اور کناروں سے اُچھل کر بہہ جانے کا تھا۔ سو وہ 'گلافتاب' میں ہُوا۔ اس کے

باوجود یہ اپنے عہد کی نمائندہ ترین کتاب ہے۔ بڑے عرصے کے بعد اُردو غزل کو ایسا چاہنے والا میسّر ہُوا جو اُس کو اپنے سینے سے لپٹانے کے علاوہ بھینچ بھی سکتا تھا۔

آواں گارد کی تعمیر میں ایک اور پہلو جس کی اہمیت ہے، وہ یہ ہے کہ ادب اور ادیب کی آزاد اور مُطلق خُود مختاری کے باوجود ادب پاروں نے معاشرے کے حق کردار کو اکثر ہدفِ تنقید بنایا ہے اور سوشل ہارمون کو نفسیاتی ہارمون میں تبدیل کر کے اس کڑواہٹ کو کھو دیا ہے۔ یُوں اثبات اور نفی کے درمیان جو تضاد ہے وہ گہرا ہو گیا ہے اور ادب کی خُود مختاری کے باوجود یہ شعور ادیبوں میں گہری جڑ پکڑ گیا ہے کہ ادب پاروں کے متن کا تاثّر یا Effectiveness ختم ہو گئی ہے۔ دُنیا کتاب لکھنے سے تبدیل نہیں ہوتی۔ یُوں بورژوا معاشرے کے ساتھ ادب کا کردار مُخاصمانہ اور جدّت پسندی کا بن گیا ہے اور اُن کا سارا زور اُس احساسِ شکست کو مٹانے کے لیے ایسے حربے اور انداز تخلیق کرنے میں لگ گیا ہے، جس سے ادب سوشل عمل سے دُور، اور اپنے اندر قید ہو گیا ہے۔ اُس نے ادبی زبان، اس کی اقدار اور بیانیہ کے بارے میں شک کا بیج بو دیا ہے کہ یہ اپنی پُوری تفہیم اور ابلاغ کے باوجود معاشرے کے ذہن پر مؤثر طریقے سے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس نے شاعروں، ادیبوں کو پٹڑی سے اُتار کر ایسے موضوعات اور حربوں کے انتخاب کی طرف دھکیل دیا ہے جو اس روزمرہ کی زبان اور معروف ادب کے درمیان جنگ و جدل کا سماں پیدا کرتا ہے۔ جس جس طرح آرٹ اپنی اہمیت خُود ہی کھوتا جاتا ہے، اُسی قدر یہ فن کار کے لیے شدید مسئلے کے طور پر اور بذاتِ خُود ایک موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ معاشرے سے انقطاع کے بعد اُس کا فن خُود اپنے فن سے مُخاطب ہے۔ یُوں جُوں جُوں معاشرہ ادب و فن سے اپنے آپ کو دُور کر کے خُود کو سمیٹ رہا ہے، ادب اُسی قدر جدّت سے اپنی آزادی اور خُود مختاری اور معاشرتی سرگرمیوں سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ اور یُوں لاشعوری طور پر اس نے خُود کو صرف اور صرف جمالیاتی احساس اور تجربے کے حصار کے اندر مقیّد کر لیا ہے، اور سوشل Relevance سے دست بردار ہو گیا ہے۔

بقول Aporno تعقّل کی بنیاد ایک آزاد، انسانی اور سوشل لائف کی تعمیر میں ہے، لیکن جب اُس کو حسابی مُعاملات اور فطرت پر غلبے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اُس کی دو شکلیں بن جاتی ہیں: اوّل Instrumental Reason جو ٹیکنالوجیکل تعقّل کو ترقی دے کر فطرت پر غلبہ اور اس کے استحصال کے لیے استعمال ہوتی ہے، اور دُوم سوشل Reason جس کا مقصد زندگی اور وجود کے تحفّظ کے علاوہ سوشل پاور کے لیے جدّ و جہد کرنا اور بالآخر غلبہ پانا ہے۔ اُس نے اوّلاً فطرت کی ہر خصوصیت اور وصف کو اپنی ٹیکنیک اور مہارت سے ایکسپلائٹ کیا اور بالآخر اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہی تعقّل معاشرے میں وجود کے تحفّظ کے لیے استعمال ہُوا تو معاشرے میں اجتماعی بہبود کے بجائے ایک دُوسرے کی ضروریات کی آڑ میں مُکمّل ایکسپلائیٹیشن کے لیے استعمال ہُوا۔ نتیجہ کے طور پر بورژوا معاشرے کی پہچان ہی Exchange-Value ہے۔ اس طرح عام آدمی کے لیے معاشرہ ایک سیاق و سباق نہیں رہا، جہاں وہ اپنی آزادیٔ عمل کو بروئے کار لائے، بلکہ ضروریات اور چھینا جھپٹی کی جنگ میں ایک چہرہ بن جاتا ہے اور یُوں آرٹ بھی اُس کی زد میں آتا ہے، جس کا مشن سوشل معنی رکھنے کے باوجود معاشرے پر حتمی طور پر کسی تبدیلی کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا، اور ادیب و شاعر بالآخر اس شکست اور مایوسی سے Pure Art کی طرف چلا جاتا ہے، جس میں ہر طرح کے سماجی تعلّقات اور انسانی رشتوں سے قطع تعلّق کر لیا جاتا ہے اور اس طرح ادیب اُس کی پٹی زبان سے رشتہ توڑ کر نئی زبان کی تخلیق کرتا ہے اور اُن ذہنی کلیشیز سے پہلو بچاتا ہے اور بقول Aporno آرٹ نے موافق زمانوں میں ایک لمبی عید میں اپنی نجات ڈھونڈ لی ہے۔ اس کا Asocial ہونا اُن معاشرتی اقدار کی نفی کے مترادف ہوتا ہے۔ یُوں وہ معاشرے سے رشتہ جوڑنے کے بجائے اس کو Resist کرتا ہے، یعنی آرٹ کی منفی طریقے سے کنٹری بیوشن ہے، یہ ایک سٹرٹیجی (Strategy) ہے احتجاج کی۔ اگر آج یہ خیالات Outdated (دُور ازکار) اور پُرانے محسوس ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی اپنے آپ کو اس نفی کے شعور سے دُور لے جاتا ہے اور اس کے مثبت متن سے دُور رہتا ہے۔

اس کی اور وجہ یہ ہے کہ آج کل ماس میڈیا (یعنی ریڈیو، اخبار، ٹیلی وژن) ہمارے اعصابی نظام پر اس طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور ایسی زبان کو خلق کر کے ہم سے گفتگو کرتے ہیں کہ ہم سے حسِ تنقید اور الفاظ کی لغت چھن جاتی ہے۔ یہ آلۂ غلبہ ہے، بورژوا معاشرے کا سرکاری غلبہ۔ نتیجتاً جو ہم سمعی بصری مواد رکھتے ہیں، اس کو Interpret کرنے کی صلاحیت سے بتدریج محروم ہوتے جاتے ہیں، اور ایک Apersonal معاشرے کی تعمیر کرتے ہیں، جن کے باطن اشتہاری تصاویر سے، سرکاری اعلان ناموں سے بھرے ہُوئے ہیں۔ ہماری زبان اُن کی زبان ہے، ہمارا فکر مُکمّل طور پر مُستعار ہے، ہم روبوٹ بن چکے ہیں۔ ایسے میں

ادیب کے لیے اور کچھ گنجائش نہیں رہتی کہ وہ تیشہ اُٹھائے اور ضرب لگائے اور اپنی گفتگو اور تخلیق کو اس مسموم فضا سے بچائے۔ یہ سارا بیان ظفر اقبال کی شاعری، خاص طور پر اُس فکری دھارے کے پس منظر کا حصّہ ہے جس کی 'گلافتاب' میں جڑیں ہیں، اور جو حالیہ مجموعہ تک سفر کرتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تفہیم کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہم اس فکری شعور کے اجزا کو ملا کر ایک مربُوط کہانی کی کڑیوں میں اس کو جوڑ اور جمع کر کے لائیں۔ وہ حصّے جو مُبہم ہیں، مُشکل ہیں، اینٹی سوشل ہیں۔ جنس پر زور اور اصرار کی وجہ بھی یہی ہے کہ شاعر اپنے لیے واردات کا کوئی حصّہ بچا کر رکھنا چاہتا ہے، جہاں وہ اپنی تنہائی اور Privacy کو ٹول سکے۔ ہمیں چیزوں کا پہلے سے مُکمّل شعور نہیں آتا، بلکہ چیزوں کے رشتوں اور تعلّقات کی بنیاد پر شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ بے بُنیاد نہیں۔ اگرچہ ہم لاکھ کہتے پھریں، ہم ہر چیز کو جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ہم آزادی سے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے زبان کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن زبان ہم سے پہلے موجود ہے اور یہی زبان کے مُرکّبات دُوسروں کے تصرّف میں رہ چکے ہیں۔ شاعر کا وظیفہ ہے کہ انھیں مانجھ کر اور نئے جوڑ توڑ سے وہ شعور پیدا کرے، جس سے ہم شعور کی اِصطلاح میں واقف ہیں۔ زبان کا وہ عنصر جو بار بار دُہرایا نہیں جاتا، بلکہ ایک ہی دفعہ وُجود میں آتا ہے۔ زندگی کی نمایندگی نقالی کر کے نہیں، بلکہ تخلیق کر کے قائم کی جاتی ہے۔۔۔ 'گلافتاب'، 'رطب و یابس'، 'عیب و ہُنر' اور 'اطراف' اِسی سِلسلے کی کڑیاں ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ سے چند اشعار:

کاغذ پہ اک باغ بنایا کرتا ہُوں
اُلٹے سیدھے پھُول کھلایا کرتا ہُوں
جو معلوم نہیں اُس کی دیتا ہُوں خبر
جو دیکھا ہی نہیں ، دکھایا کرتا ہُوں

☆

بات سمجھانے کی خاطر کوئی دن سے
بات اُلجھانے لگا ہوئے لگا ہُوں
بھُوک معنی کی ظفر لگتی ہے ایسی
لفظ ہی کھانے لگا ہوئے لگا ہُوں

☆

سرے الفاظ سب کچھ ہیں معانی کے بجائے
تو جّہ چاہتا ہُوں مہربانی کے بجائے
نکل ہی آئے گا کوئی تو اَن سُنا اُسلُوب
کہی جو بات کسی اَن کہے طریقے سے

☆

یہ وہ سفر ہے جو نظر آتا نہیں کہیں
آنکھیں ہیں دُور دُور ، تماشا ہے ساتھ ساتھ

☆

شاعری اور طرح کی اسے کہتے ہو ، ظفر
مَیں پریشاں ہُوں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں

1895ء میں جب ملارمے کو کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں نے نئے فرانسیسی شعر اور اُس شعری انقلاب کے بارے میں جو فرانسیسی شاعری میں رُونما ہو چکا تھا، خطبہ دینے کے لیے مدعو کیا تو ملارمے نے اپنے انگریزی سامعین کو بتایا:

''مَیں آپ کے لیے خبر لایا ہُوں، ایک انتہائی حیران کُن خبر، ایسی خبر جو پہلے دیکھی نہ سُنی گئی۔''

''اُنھوں نے فرانس پر شعر کے ساتھ تشدّد کر دیا ہے۔''

''میرے لیے بہتر ہے کہ مَیں فوری طور پر آپ کو آگاہ کر دوں، ایک ایسے مدعو مہمان کی طرح، جو اس حادثے کا عینی شاہد ہے''۔

یہ فرانسیسی شاعری میں فری ورس کا تعارف تھا، جس نے صدیوں کی روایتی اور سرکاری ورس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔

ظفر اقبال کی شاعری کا کچھ حصّہ تغزّل اور روایتی موضوعات کے خلاف ایک کاری ضرب بھی ہے اور زور دار وار بھی۔ وہ لسانی تجربے کی ٹوٹ پھُوٹ کا عینی شاہد ہے، جہاں یہ موضوع صرف جمالیاتی اور نارمل ہے، وہاں اس کا ایک سرا سیاسی بھی ہے۔ بقول ملارمے غلوتیں تبدیل ہو جاتی ہیں، لیکن اوزان اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جب رویّے تبدیل ہوں گے، لامحالہ موضوعات بھی تبدیل ہوں گے۔۔۔ شاعری میں آزادی کا بہاو سوشل شعور میں وسیع

تر آزادی کی اُمنگ اور خواہش کا آئینہ دار ہوتا ہے اور سوشل فیبرک میں اُن تبدیلیوں کا غماز ہے جو روایت سے الگ تھلگ اَن کہا اور اَن سُنا کی مثال بن کر اپنا اظہار چاہتی ہیں۔ یہ وہ جذبات ہیں، جو روایت کے حاشیے میں پروان چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ جو ہمارے کلچر کے باطن میں مخفی ہیں، جن کو کسی نہ کسی حد تک یہ کہہ کر دبا دیا جاتا ہے کہ یہ اظہار کے قابل نہیں ہیں، ابھی منجھے نہیں اور خام اور ناتراشیدہ ہیں۔ یہ ایک مستقل رویّہ بن کر سامنے آتے ہیں، اور اظہار کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ وہ سیاسی رویّے جو معاشرے میں افراتفری کا موجب ہیں، جن سے دُہرے معیار کی بُو آتی ہے، جو حق تلفی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ ایسی زیادتیوں کو زبان دینے کے لیے ایک مختلف لغت ترتیب دی گئی ہے۔

اس شہر آشوب کے بیان کے لیے شاعر اپنے آپ کو ایک میڈیم قرار دیتا ہے۔ بقول ژاک دریدا (Jacque Derrida) ہمارا شعور حادثاتی نہیں، بلکہ نتیجہ ہے اشیا کے ردِعمل اور رشتوں کے مابین، اور کڑی ہے جو خیال کو خیال سے جوڑتی ہے۔ زبان خود فکر کی مخرج ہے۔ بالآخر کاغذ پر لکھے ہُوئے الفاظ ہی روشنی کا دھارا بن کر اُبھرتے ہیں۔ حقیقی اشیا کے درمیان امکانی رشتے قائم کر کے شعور کی آخری حد تک سفر کی خواہش ہی شاعر کو مستقل اُبھارتی رہتی ہے کہ وہ سفر ختم نہ کرے اور چلتا رہے۔ بداعتمادی کی فضا اُس کو مستقل شک کی حالت میں رکھتی ہے، شاعر اپنے اور معاشرے کے مخفی گوشوں کو ٹٹولتا رہتا ہے۔ وہ ایسے لفظی رشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اس سے پہلے ناپید تھے، جو بدلے ہُوئے حالات میں تازہ تر شعور کا ثمر ہیں۔

اور یہ ظفر اقبال کی شاعری میں آزاد تلازمے کا نقطۂ آغاز ہے، آزاد تلازمہ شاعر کو وہ آزادی دیتا ہے، جس سے وہ زیادہ کھلی ہوا میں سانس لے سکتا ہے، اُس کی تشبیہ اور استعارہ میں وہ بھرپور انداز سمٹ آتا ہے، جو روایتی گرامری جکڑ بندی میں ممکن نہیں۔ تشبیہ کا میدان وسیع ہے اور اس سے رابطے اور رشتوں کے باہم ایسے علاقے دریافت کیے جا سکتے ہیں جو محض تعقّل اور منطقی ربط سے جُڑے ہوئے نہ ہوں، بلکہ محسوسات کے حوالے اور تجرید کے رشتے سے بھی جڑے ہُوئے ہوں۔ یُوں ایک نئی اور تازہ تر کائنات کی تخلیق کی بنیاد میسّر آ جاتی ہے۔ جتنا توانا تخیّل ہو گا، اُتنا ہی بھرپور اظہار ہو گا اور ظفر اقبال کی شاعری میں یہ سب کچھ بڑے Aggressive انداز میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا بیان موضوع پر حاوی ہے اور کسی لمحے بھی اُس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔ چوں کہ اُس کی دُنیا روایتی شعرا کی دُنیا سے الگ ہے، اس لیے اُس کا چلن بھی الگ ہے۔ اس لیے اُس کے ڈھب کڈھب دونوں میں اپنی شان ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کا موضوع اور مخصوص فضا کیا ہے، اس کا تجزیہ کرنے اور اُن کا ذکر کرنے اور اُنھیں جمع کرنے کے لیے ہمیں ایک مثال کا سہارا لینا پڑے گا۔ 1970ء میں ایک شخص پیرس میں دریائے سین میں خودکشی کر لیتا ہے۔ یہ شاعر پال سیلان (Paul Celan) ہے۔ اُس کی داستان عجیب ہے، اُس کے والدین کو Concentration کیمپ میں 1942ء میں ڈالا گیا تھا۔ اُس نے خود فرار کی کوشش کی، لیکن پکڑا گیا اور اٹھارہ ماہ تک چٹانوں کے ٹکڑے اور گندگی ہٹانے کی سزا بھگتتا رہا۔ اپنی ماں سے اُس واحد خط میں جو اُسے ملا، پتا چلا کہ اُس کا باپ انتہائی کمزوری اور کسمپرسی کی حالت میں قتل کر دیا گیا۔ اپنے ایک کزن سے کچھ ماہ بعد اُس کو خبر ملی کہ اُس کی ماں کی گردن میں گولی مار دی گئی ہے اور خود اُسے اُس لائن سے جن کو قتل کے لیے منتخب کیا گیا تھا، نکل کر دُوسری جبری مزدوری والی لائن میں چھپنا پڑا، جہاں وہ زندہ رہ گیا۔ اُس کی ایک نظم ہے، اُس واقعے کے بارے میں "موت کا نغمہ":

"صبحِ کاذب کا کالا دُودھ جو ہم غروب کے وقت پیتے ہیں
صبح کو دوپہر کو اور شام کو ہم پیتے ہیں
ہوا میں قبر کھودتے ہیں، جہاں ہم کھلے میں رہتے ہیں
ایک آدمی گھر میں رہتا ہے، وہ سانپوں سے کھیلتا ہے، وہ لکھتا ہے
وہ لکھتا ہے کہ جب شام کا اندھیرا جرمنی میں پھیلتا ہے، تمھارے سُنہرے بال مارگریٹ
وہ لکھتا ہے اور گھر سے باہر قدم رکھتا ہے اور ستارے پلکیں جھپک رہے ہیں
وہ اپنے کتّوں کو باہر نکالتا ہے
وہ اپنے یہودیوں کو سیٹی مار کے باہر نکالتا ہے، قبر کھودنے کا حکم دیتا ہے
وہ سب کو رقص کا حکم دیتا ہے
وہ حکم دیتا ہے زمین کو نیچے تک کھودو، اور تم سب رقص کرو
وہ پیار سے حکم دیتا ہے، موت کا رقص کرو،
وہ تنبیہا کہتا ہے، اپنے ساز کے تار چھیڑو، پھر تم ہوا میں دُھوئیں کی طرح پھیل جاؤ گے
تمھاری قبر بادلوں میں ہو گی، جہاں آدمی بغیر سرحد کے رہتا ہے"

شاعری اتنے بڑے المیے کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا پاتی ہے، زمین و ذہن کی شکست پر آدمی پارہ پارہ نان کی طرح اپنے آپ کو کاٹا اور بانٹا ہوا پاتا ہے۔ انجانے ہاتھ اُس کی گردن و گریباں کی طرف بڑھتے ہیں، موت کا پنجہ سینے کی جھاڑی میں پیوست ہونے کے لیے بے تاب ہے۔ اُس کے محسوسات اپنے آپ کو کسی ایک نقطۂ خیال یا جہت میں باندھ نہیں سکتے۔ وہ اپنے گریبان کے ساتھ شعر کا گریبان بھی کھینچ لیتا ہے، اپنی چیخ میں شعری سِسکی کی آواز بھی گم کر دیتا ہے۔ تباہی و بربادی کا خیال کسی ناسٹالجیا سے جنم نہیں لیتا، بلکہ وہ مستقل حضوری کی حالت میں ہے، زمانہ حال، جو پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔

شاعر جب سب کچھ کھو دیتا ہے تو ایک چیز اُس کے پاس باقی رہ جاتی ہے، اور وہ ہے زبان، جس کا وظیفہ صورتِ حال کی گواہی ہے۔ شاعر ان واقعات کا عینی شاہد ہے، جسم پر بیتی ہوئی واردات اُس کی حقیقت ہے۔ اُس کا بچاؤ اور تحفظ ہی اُس کی زندگی ہے، زبان جب اس تاریکی سے گزر کر آتی ہے تو اپنے ساتھ وہ سب نشانات بھی لاتی ہے، جن سے شاعر گزرا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری ایک ایسے معاشرے میں جو عدم تحفظ کا شکار ہے، جہاں لفظ اپنے روایتی معنی کھو چکے ہیں اور عصری حقیقتیں قبول کرنے کو تیار نہیں، اپنی واردات بیان کرنے کی سعی کرتی ہے۔ اندرونی شکستگی اور بنجر پن معاشرے کے جسم کو دیمک کی طرح چاٹ چکا ہے۔ لوگ اپنی شناخت سے محروم، عصبیت اور جبلی بربریت کے درمیان قید ہیں۔ ایک غیر انسانی تماشا جس کو آنکھیں دیکھتی اور دُکھ سہتی ہیں۔ ایسے میں شاعر اپنے ہمزاد کو تخلیق کرتا ہے، جس سے وہ دل کی کہانی کہہ سکے۔ بے معنویت کی دُنیا میں معنی کی ترسیل کی کوشش۔ دُنیا اپنے نامیاتی اجزا میں بکھری ہوئی سنگین اور سنگلاخ۔ شاعر بار بار لفظوں کی پیچیدہ شاخوں سے خود کو ڈھانپتا ہے اور دُنیا کی عریانی اور ویرانی کا نظارہ کرتا ہے، ایک طاقتور حیاتی تخیّل جو زمین و زماں میں ایک بھرپور اور توانا آواز کے ساتھ برآمد ہوا ہے۔ ظفر اقبال کی شعری آواز اور اُس کا مثبت لہجہ اس درماندگی اور ابتری میں رجائیت سے بھرپور ہے۔ وہ انسان کی آرزو میں اور انتظار سے مایوس نہیں۔ یہ غزل ایک جگمگاتی ہوئی قندیل ہے جو تاریکی میں روشنی کا فوارہ بننے کی قوت رکھتی ہے۔

عبدالرشید

11، اپریل 1995، لاہور

یہاں کم و بیش ہوں کہ اکثر نکل رہا ہوں
دھواں سا اک سمت سے برابر نکل رہا ہوں

جہاں کبھی پھول سا کھل اُٹھتا تھا راستوں پر
وہیں کہیں راہ روک پتھر نکل رہا ہوں

طلوع ہونا بذاتِ خود ہی بہت ہے، ورنہ
ابھی میں اپنی طرف سے کم تر نکل رہا ہوں

اِدھر اُدھر محض رایگاں ہے تلاش میری
کہ میں کئی دن سے اپنے اندر نکل رہا ہوں

کہیں سمٹتے سمٹتے معدوم ہونے والا
کہیں میں اپنی حدوں سے باہر نکل رہا ہوں

اُڑان میرے حساب میں ہے، سو، وہ بھی ہوگی
ابھی تو اپنا ہی میں کوئی پر نکل رہا ہوں

رہا ہوں پہلے تو آتا جاتا ہی گاہے ماہے
میں آج بزمِ بتاں سے یکسر نکل رہا ہوں

جو ایک دیوار چار سُو اُٹھ رہا ہوں اپنے
تو ایک جانب سے میں کوئی در نکل رہا ہوں

ظفر، میں کمزور جس قدر بھی ہوں دیکھنے میں
اسی قدر اہلِ شہر کا ڈر نکل رہا ہوں

-☆-

لاحقے اور لاؤ میرے لیے
ضابطے اور لاؤ میرے لیے

واردات اور طرح کی ہے مری
فیصلے اور لاؤ میرے لیے

میرا انصاف یُوں نہیں ہو گا
قاعدے اور لاؤ میرے لیے

مُجھ پہ نافذ نہیں اُصولِ کُہن
کلیے اور لاؤ میرے لیے

قُربتیں اور چاہیے ہیں مُجھے
فاصلے اور لاؤ میرے لیے

منزلیں اور ہیں مرے درپیش
راستے اور لاؤ میرے لیے

حیرتیں یہ نہیں مُجھے درکار
آئنے اور لاؤ میرے لیے

یہ ملامت مرے لیے کم ہے
اس لیے اور لاؤ میرے لیے

ابھی آزاد پھر رہا ہُوں ، ظفر
سلسلے اور لاؤ میرے لیے

☆

خواب کی روش پر ، پتھر کے راستے سے
کیا کیا سفر کیا ہے کیوں کر کے راستے سے

کُچھ دیکھ بھی سکوں میں دُھندلی جھلک تُمھاری
اب آؤ گے تو آنا باہر کے راستے سے

معمول کے مُطابق ہوتا نہیں ہے کُچھ بھی
موجِ بہار آئی بنجر کے راستے سے

کرنا پڑا ہے نافذ کُچھ اور بھی طریقہ
نکلا نہ لفظ کوئی مصدر کے راستے سے

اپنی ہی راہ چل کر پہنچا ہُوں گرتا پڑتا
مَیں آ نہیں سکا ہُوں اکثر کے راستے سے

اُٹھ کر یہاں سے مَیں نے ڈالا کہیں پہ ڈیرا
طے کی ہے یہ مسافت محور کے راستے سے

پہنچے کہ ہم نہ پہنچے یہ بات اور ہے اب
ہٹ کر رہے ہمیشہ دیگر کے راستے سے

اس خانۂ سیہ سے اِک شور اُبھر کے نکلا
ہوتا ہُوا روانہ گھر گھر کے راستے سے

پھر دیر تک ظفر ، مَیں باہر نکل نہ پایا
جانا پڑا ہے جب بھی اندر کے راستے سے

☆

پھولوں سی کیاریاں ہیں تو سبزہ ہے ساتھ ساتھ
وہ آ رہا ہے ، اور ، سراپا ہے ساتھ ساتھ

چیزوں کے درمیان یہ رشتے عجیب ہیں
دل ہے تو اُس کے ساتھ ہی دُنیا ہے ساتھ ساتھ

یہ وہ سفر ہے جو نظر آتا نہیں کہیں
آنکھیں ہیں دُور دُور ، تماشا ہے ساتھ ساتھ

بادل کے بادبان سے ہر سُو تنے ہُوئے
رستے ہیں دائیں بائیں ، روانہ ہے ساتھ ساتھ

رنگوں میں ہوتی جاتی ہے تقسیم روشنی
اور ، ہم سمجھ رہے ہیں اُجالا ہے ساتھ ساتھ

اُس کی بھی اتفاق سے کچھ رائے ہے یہی
اپنا بھی ہے خیال کہ اچھا ہے ساتھ ساتھ

مجھ کو تو یہ مسافتِ صحرا بھی راس ہے
اس دُھوپ اور پیاس میں دریا ہے ساتھ ساتھ

حق میں کبھی ہمارے ہوا بھی نہیں چلی
اب ہم نہیں رہے تو زمانہ ہے ساتھ ساتھ

کس طرح کی ہیں تیری وفاداریاں ، ظفر
جیتا ہے ساتھ ساتھ نہ مرتا ہے ساتھ ساتھ

☆

گودا عشق ہمارے کو
پروا نہیں تمھارے کو

پھرتے آگے پیچھے پر
بیٹھے پانو پسارے کو

آیا کرو ہمارے پاس
سمجھا کرو اشارے کو

لے گئے وہ بنیاد اُکھاڑ
روتا مٹی گارے کو

ویسی مہنگائی کے بیچ
ایسے قسمت مارے کو

کیا سُنیے مختارے کی
کیا کہیے بے چارے کو

پُوچھ کبھی سرداراں سے
چھیڑ کبھی سردارے کو

سوچوں موج منافعے میں
دیکھوں خرچ خسارے کو

کہو ، ظفر ، لینے جاؤں
آدھے کو ، یا سارے کو

☆

ڈرتا رہتا ہوں ضرر سے اتنا
میں نکلتا نہیں گھر سے اتنا

ابھی قابو نہیں اتنا دل پر
ابھی گزرو نہ ادھر سے اتنا

ہے اگر رختِ سفر بھی کافی
کیوں گریزاں ہوں سفر سے اتنا

اتنی رکھتے ہیں سبھی میری خبر
میں ہوں محروم خبر سے اتنا

چلتی رہتی تھی ہوا سی کوئی
اور، میں راہگزر سے اتنا

گھومتا رہتا ہوں دنیا اُس کی
کام لیتا ہوں نظر سے اتنا

کھینچ کر پھر مجھے نیچے لے جائے
اُبھر آتا ہوں بھنور سے اتنا

عیب میرے بھی ظاہر ہو جائیں
کام ہے عرضِ ہنر سے اتنا

میں اُسی سمت سے آؤں گا، ظفر
دور پڑتا ہے جدھر سے اتنا

-☆-

جو لپٹتا نہیں اسی کو لپیٹ
موت سے پہلے زندگی کو لپیٹ

پھر یہ موقع نہیں ملے گا کبھی
ہر طریقے سے ہر کسی کو لپیٹ

کر ہوا کا تو بندوبست کوئی
اس ہر شے لپیٹتی کو لپیٹ

خود لپٹتی رہے گی پہلی بھی
سب سے پہلے اس آخری کو لپیٹ

ہر گھڑی کو لپیٹنے کے بجائے
ہو سکے تو کبھی کبھی کو لپیٹ

مستقل بھی لپٹ ہی جائے گا
کچھ کسی طرح سرسری کو لپیٹ

اتنی ساری لپیٹنے کے بجائے
بس کافی ہے، ایک ہی کو لپیٹ

دوسروں کی زیادہ فکر نہ کر
اٹھ کے اپنی کسی کمی کو لپیٹ

پانو پھیلائے جا رہی ہے بہت
اے ظفر، کچھ تو شاعری کو لپیٹ

-☆-

کیا جاؤں گا، تصویرِ تماشا کی طرف سے
دُنیا بھی میسّر نہیں دُنیا کی طرف سے

اس شہر میں سب آپ معزز ہیں کم و بیش
عزت مجھے ملتی ہے تو رُسوا کی طرف سے

تعبیر کی تلوار سی چلتی ہے پس و پیش
لہر اُٹھتی ہے جب خواب تمنا کی طرف سے

موصول ہُوا عکس کبھی ایک بھی کوئی
دیکھا کی طرف سے کہ دکھایا کی طرف سے

سو رنگ بہے جائیں گے بے رنگ کی جانب
اک بھیڑ چلی آئے گی تنہا کی طرف سے

کیا ریت کا اک پھول سا کِھل اُٹھتا ہے دل میں
جب موج ہوا آتی ہے صحرا کی طرف سے

دُشوارگزاری مجھے منظور ہے، لیکن
جاتا نہیں مَیں نقشِ کفِ پا کی طرف سے

اک شور سا اُٹھتا تو ہُوں چاروں طرف اپنے
پلٹوں گا کبھی اس غُل و غوغا کی طرف سے

دیوانہ ہُوں، اور، کام میں اپنے ہُوں مَیں ہشیار
جاتا ہُوں، ظفرؔ، دشت کو دریا کی طرف سے

☆

قاعدہ توڑ کیوں نہیں سکتے
فالتو چھوڑ کیوں نہیں سکتے

ضابطے ہیں چڑھا ہُوا دریا
اس کا مُنہ موڑ کیوں نہیں سکتے

کیوں نہیں اعتماد موجوں پر
بیڑیاں بوڑ کیوں نہیں سکتے

یہ سفر میں اگر رُکاوٹ ہیں
آبلے پھوڑ کیوں نہیں سکتے

لفظ لٹکا رہے گا یُوں کب تک
لاش کو روڑھ کیوں نہیں سکتے

یہ کسر بھی نِکل رہے گی کبھی
چھوڑ یہ تھوڑ کیوں نہیں سکتے

ہاں اگر رہ گیا تو پھر کیا ہے
آئنہ جوڑ کیوں نہیں سکتے

گوشت کو بھون کر پکانا کیا
آپ اِسے سوڑ کیوں نہیں سکتے

کپکپاتے ہی پھر رہے ہو، ظفرؔ
شاعری اوڑھ کیوں نہیں سکتے

☆

خلجہ سا رہتا ہے، یہ زندگی ہے بھی کہ نہیں
کوئی تھا بھی کہ نہیں تھا، کوئی ہے بھی کہ نہیں

رنگ سا پھیلتا جاتا وہ ہوا کا ہر سمت
وہم سا پھر بھی ہے، یہ تھرتھری ہے بھی کہ نہیں

یہ اندھیرا ہی غنیمت ہے کہ یہ ہے تو سہی
روشنی ڈھونڈتے ہیں، روشنی ہے بھی کہ نہیں

کوئی چیز آس بندھاتی ہوئی مطلوب ہے کیا
کوئی شے خواب دکھاتی ہوئی ہے بھی کہ نہیں

دوستی کے یہاں چرچے تو بہت ہیں، لیکن
جانتا کوئی نہیں، دوستی ہے بھی کہ نہیں

دل نے خود پہلی محبت کو سبوتاژ کیا
دوسری کے لیے، اور، دوسری ہے بھی کہ نہیں

دوسروں کی جو خبر پوچھتا پھرتا ہے بہت
کیا پتا آپ کو وہ آپ بھی ہے بھی کہ نہیں

اہلِ دنیا مجھے زنجیر تو کرتے ہیں، مگر
کیا خبر سر میں وہ دیوانگی ہے بھی کہ نہیں

شاعری اور طرح کی اسے کہتے ہو، ظفر
میں پریشاں ہوں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں

-☆-

یوں اگر دیکھو تو ظاہر میں غبار امکان ہے
ورنہ امکاں سفر میں صد ہزار امکان ہے

گوشۂ دل میں سمٹ کر بیٹھنے والی یہ چیز
جتنی پوشیدہ ہے اتنی آشکار امکان ہے

اپنا یہ دعویٰ کہ دل پر ہے ہمیں بھی اختیار
وقت پڑنے پر بہت بے اختیار امکان ہے

رائگاں خاکسترِ خواہش پہ ہے وہ مطمئن
کیا خبر اس کو کہ یہ اب بھی شرار امکان ہے

پھر خدا وصلِ بتاں کا وقت لائے گا کبھی
ایک بار امکان ہے تو بار بار امکان ہے

آسماں کے در دریچے کھلنے والے ہیں اگر
یہ زمیں شاید کسی کا انتظار امکان ہے

اہلِ دل اس کو بھلا پائیں گے مشکل ہی سے اب
سہی نامشکور اپنی یادگار امکان ہے

منظرِ معنی سے ہٹ کر بھی اگر دیکھے کوئی
اپنی یہ طبعِ رواں ہی بے شمار امکان ہے

میں بغاوت کر رہا ہوں عاجزی سے، اے ظفر
میری شورش بھی سراسر انکسار امکان ہے

-☆-

کمتر کے سامنے ہے نہ برتر کے سامنے
یہ رنجِ رایگاں ہے برابر کے سامنے

یہ رنگ میرے یہ نہیں رہتے ہیں اُس گھڑی
کچھ اور ہونے لگتا ہوں باہر کے سامنے

دھندلا سا گرد گرد اندھیرا یہ شام کا
چمکے گا اور اور منوّر کے سامنے

اک وصل وادیوں کی طرح پھیلتا گیا
اک خواب سا کھلا ہوا اندر کے سامنے

اپنے ہی راستوں پہ کبھی چل رہے ہوئے
آیا نہیں ہے کوئی بھی محور کے سامنے

سب اپنے اپنے کام کی جلدی میں تھے بہت
رُکتا نہیں تھا کوئی دلدر کے سامنے

ایسے ہی تو یہ بھیڑ نہیں لگ رہی وہاں
ہو گا ضرور کچھ پسِ منظر کے سامنے

مجھ میں ہی کوئی اور کمی آ گئی نہ ہو
میں جم نہیں سکا جو سراسر کے سامنے

سب کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا، ظفر
حیران سے کھڑے ہوئے چکّر کے سامنے

-☆-

کسی دن انتظارِ کارواں رکھتا ہوا ہوں
کبھی میں حرفِ رنجِ رفتگاں رکھتا ہوا ہوں

ابھی مطلوب مجھ کو روشنی خود بھی نہیں ہے
ابھی میں ان چراغوں پر دھواں رکھتا ہوا ہوں

کہیں راتوں میں صبحوں کا سفر کرتا ہوا سا
کہیں راہوں پہ قدموں کے نشاں رکھتا ہوا ہوں

خبر اُس بے خبر کی ہے یہاں بے سُود مجھ کو
نشاں اُس بے نشاں کا رایگاں رکھتا ہوا ہوں

کچھ اُس کا سامنا کرنے کا دل میں حوصلہ سا
میں ہوں رکھتا ہوا، لیکن، کہاں رکھتا ہوا ہوں

زمیں ہے دوسری ہی پانو کے نیچے جو میرے
تو سر پر اور کوئی آسماں رکھتا ہوا ہوں

کوئی دھڑکا نہیں ناگاہ جل بجھنے کا اب تو
میں شاخِ برق پر ہی آشیاں رکھتا ہوا ہوں

سر و ساماں یہی میرے لیے کافی ہے جب میں
ہزاروں طرح کے وہم و گماں رکھتا ہوا ہوں

یہ اپنے ساتھ مجھ کو بھی بہا لے جانے والا
ظفر، کس طرح کا زورِ بیاں رکھتا ہوا ہوں

-☆-

بڑھ گئی اور کہانی آگے
لفظ پیچھے ہیں معانی آگے

مجھے خاموش ہی رہنا ہے یہاں
جا کے ہونا ہے بیانی آگے

سربسر دھوپ چمکتی ہے ابھی
راہ میں آئے گا پانی آگے

درمیاں میں کہیں رہ جاتا ہوں
اور، مری نقل مکانی آگے

داستاں پر کوئی قابو نہ رہا
جب چلی میری زبانی آگے

تھی، مگر، غالباً ایسی تو نہ تھی
یہ رکاوٹ میں روانی آگے

میں بڑھاپا تو گزار آیا ہوں
ہے ابھی عہدِ جوانی آگے

یاد کرنا ہوا مشکل اس کو
بھول بیٹھا ہوں نشانی آگے

مجھے جلدی ہے پہنچنے کی، ظفر
ہے کوئی بات بتانی آگے

☆

مت سمجھو زمین ہماری ہے
خالی خورجین ہماری ہے

یہ بھینس تو ہے ہمسایے کی
البتہ بین ہماری ہے

ناپاک بہت ہیں خود تو ہم
یہ پاک زمین ہماری ہے

سچ کے نزدیک بھی مت جانا
سب کو تلقین ہماری ہے

اُس چیز کا نہیں وجود کوئی
جس میں تسکین ہماری ہے

بکھرائے ہوئے ہیں دل کا لہو
محفل رنگین ہماری ہے

رہتے ہیں بہت ہلکے پھلکے
حالت سنگین ہماری ہے

کرتوت کچھ اور ہیں، البتہ
صورت مسکین ہماری ہے

پھنستا ہے جو اس میں شعر، ظفر
بے کار مشین ہماری ہے

☆

نئے سرے سے اُس کو بسانا چاہتا ہوں
آدھا جنگل شہر میں لانا چاہتا ہوں

کوئی نہ کرنے والا ہو جس کی تائید
ایک ایسی آواز لگانا چاہتا ہوں

کسی چیز سے ہونا چاہتا ہوں مَیں جدا
کسی اور شے میں جل جانا چاہتا ہوں

جو خود بھی مَیں نہیں سمجھ پایا ہوں ابھی
ساری دُنیا کو سمجھانا چاہتا ہوں

روشنی کرنے کو ، ان گھروں محلّوں پر
بجلی سی بن کر لہرانا چاہتا ہوں

نیند نہیں پڑتی ، اور ، سونا ہے مجھ کو
شرم نہیں آتی ، شرمانا چاہتا ہوں

بیٹھ گیا ہوں مُقفّل ہو کر کمرے میں
شاید مَیں کہیں آنا جانا چاہتا ہوں

کُچھ بھی نہیں ہے میرے پاس بتانے کو
بس اِتنی سی بات بتانا چاہتا ہوں

پردے بہت اُٹھا بیٹھا ہوں ، اور ، ظفر
آخری پردہ نہیں اُٹھانا چاہتا ہوں

☆

تماشا ہو رہا ہوں یا تماشا کر رہا ہوں
ابھی کُچھ بھی نہیں کھلتا کہ مَیں کیا کر رہا ہوں

مجھے اِس کام کا اِتنا تو اندازہ ہے خُود بھی
غلط کر رہا ہوں یا انوکھا کر رہا ہوں

ابھی تو میرے کرنے پر بھی کوئی خوش نہیں ہے
ابھی کیسے کوئی کہہ دے کہ اچھا کر رہا ہوں

مجھے اس عمر میں تو کوئی فارغ بیٹھنے دے
کہ مَیں یہ کام سارا دُوسروں کا کر رہا ہوں

کوئی اپنی خُوشی سے تو نہیں آتا یہاں تک
کسی تکلیف کے باعث ہی ایسا کر رہا ہوں

مَیں اک گوشے میں بیٹھا کہہ رہا ہوں بات اپنی
کسی سے بحث کرتا ہوں نہ جھگڑا کر رہا ہوں

بباطن اس میں شامل ہیں کئی اک دُوسرے بھی
بظاہر یہ تردّد مَیں ہی تنہا کر رہا ہوں

کسی کے فائدوں پر تو نظر میری نہیں ہے
اگر نقصان کرتا ہوں تو اپنا کر رہا ہوں

ظفر، سب کر رہے ہیں اپنی مرضی سے بھی کُچھ
مجھے بھی جو پسند آتا ہے ویسا کر رہا ہوں

☆

بجتی ہوئی چاروں طرف آواز پگھل کر
کیا رہ گیا ، دیکھو ، مرا انداز پگھل کر

میں تاکہ اسے دے سکوں اک اور نئی شکل
آئی مرے آگے یہ تگ و تاز پگھل کر

گرمی کی وہ حِدت بھی نہیں ہے، مگر اب کے
پہنچے ہیں مرے پاس کچھ اعزاز پگھل کر

کھل کر ابھی دیکھی ہے کہاں دھوپ دلوں کی
کاٹے گی محبت کی یہ مقراض پگھل کر

بیٹھا ہوں جو پہچان لے اس حال میں کوئی
میں بر سرِ آتش کدۂ ناز پگھل کر

اب اور کوئی میرے قریب آئے تو کیا آئے
رہ جاتے ہیں اپنے مرے دمساز پگھل کر

ہوتا نہیں پھر اُس کا نتیجہ بھی کوئی اور
کرتا ہو اگر بات کا آغاز پگھل کر

غازے کی طرح پھیل گیا چہرے پہ اُس کے
کیا آتشِ اُلفت سے کوئی راز پگھل کر

ناچار ، ظفر ، گرمیِ گفتار کے ہاتھوں
کچھ اور ہوئے جاتے ہیں الفاظ پگھل کر

-☆-

لہر سی ٹوٹ گئی ہے مُجھ میں
کوئی ایسی ہی کمی ہے مُجھ میں

جس نے بکھرا دیا پتّا پتّا
اک ہوا ایسی چلی ہے مُجھ میں

چلتی رہتی ہیں یہ تلواریں کیوں
کیا کوئی لام لگی ہے مُجھ میں

روشنی تو کیے رکھتا ہوں مگر
کچھ اندھیرا سا ابھی ہے مُجھ میں

کوئی ہوتا نہیں سُورج کا اثر
رات ویسی ہی پڑی ہے مُجھ میں

آگ باہر سے تو آتی ہے نظر
برف بھی کوئی دبی ہے مُجھ میں

کوئی دروازہ کھلا ہو جیسے
ایک چھت جیسے گری ہے مُجھ میں

کوئی سُنتا نہیں اب بھی مری بات
بُزدلی بھی تو وہی ہے مُجھ میں

باری باری سے اُچھلتے ہیں ، ظفر
گریہ ہے ، اور ہنسی ہے مُجھ میں

-☆-

بیٹھے بیٹھے کھو گیا
عجب تماشا ہو گیا

میں تھا پیچھے اور کے
میرے پیچھے وہ گیا

وہ بھی ضد میں تھا بہت
میں بھی تھک کر سو گیا

پھول کھلاتے ہوئے وہ
کتنے کانٹے بو گیا

رگ رگ، نس نس میں مری
زہر سمان سو گیا

بارش جیسا تھا کوئی
سب سامان بھگو گیا

دُوسرے کا ہوں منتظر
پہلا موقع تو گیا

پکے پانی سے کوئی
کچی مٹی گو گیا

پُرسے کو آ کر ظفر
اپنا رونا رو گیا

☆

ہاتھوں ہاتھ اب تو ہے لیتی دُنیا
تنگ آ جائے گی کھینچتی دُنیا

ٹھیک اس کا نہیں کوئی موسم
ہے اُگتی نہ پنپتی دُنیا

کوئی بارش نہیں بری کب سے
سُوکھتی جاتی ہے کھیتی دُنیا

چھین لے جاتے ہیں مجھ سے ہر شے
کرتی رہتی ہے دیکھتی دُنیا

مجھے ہموار کرے گی شاید
مارتی رہتی ہے ریتی دُنیا

کہیں برداشت کرے مجھ کو بھی
کچھ تمھاری یہ چہیتی دُنیا

جا نہ لگتی کسی ساحل سے اگر
کشتیِ خواب نہ کھیتی دُنیا

نقشِ پا پھر بھی نہیں چھوڑے گی
آئے گی ریت برتی دُنیا

میں، ظفر، کب سے بھرا بیٹھا ہوں
شعر کہنے نہیں دیتی دُنیا

☆

لفظ پتوں کی طرح اُڑنے لگے چاروں طرف
کیا ہوا چلتی رہی آج مرے چاروں طرف

مَیں نے خود کو جو سمیٹا تو اُسی لمحے میں
اور بھی چاروں طرف پھیل گئے چاروں طرف

رُک گئے ہیں تو یہ دریا مرے اندر ہی رُکے
چل پڑے ہیں تو اِسی طرح چلے چاروں طرف

اب کہ ہوتا ہی نہیں میرا گزارہ ان پہ
چاہیے ہیں مجھے اس بار نئے چاروں طرف

ہیں بھی ایسے کہ فقط مجھ کو نظر آتے ہیں
ایک ہی دُوسرے میں اُلجھے ہُوئے چاروں طرف

مَیں ہی معدوم سا ہوتا گیا رفتہ رفتہ
ورنہ منظر تو فلک بوس رہے چاروں طرف

آپ تو ایک طرف بیٹھ گیا وہ آ کر
اور، پھر ایک طرف اُس نے کیے چاروں طرف

کوئی اطراف کی اب فکر اُسے کیا ہو گی
ساتھ ہی ساتھ جو پھرتا ہے لیے چاروں طرف

آسماں پہ کوئی تصویر بناتا ہوں، ظفرؔ
کہ رہے ایک طرف، اور، لگے چاروں طرف

☆

سوئے سوئے ہُوئے الفاظ
جیسے روئے ہُوئے الفاظ

دانہ دانہ بکھرائے
کہیں پروئے ہُوئے الفاظ

زندہ نہیں نکل سکتے
بیچ ڈبوئے ہُوئے الفاظ

معنی سے آزاد آزاد
خود میں کھوئے ہُوئے الفاظ

پک جانے پہ کانٹوں کا
اپنے بوئے ہُوئے الفاظ

ہائے ہائے ہُوا مطلب
اوئے اوئے ہُوئے الفاظ

زندہ کرنا ہیں مجھ کو
سارے موئے ہُوئے الفاظ

بکھرے بکھرے، نئے نئے
سر مُنہ دھوئے ہُوئے الفاظ

کہیں نکالے ہُوئے، ظفرؔ
کہیں سموئے ہُوئے الفاظ

☆

اک اور شور سہی اُس کے جی میں آیا ہُوا
مَیں اُس کو یاد دلاتا ہُوں کچھ بھلایا ہُوا

اُسے مَیں دُوسری بار آزماؤں گا ، ورنہ
ہے ایک بار تو وہ میرا آزمایا ہُوا

گزر گئی ہے مری عمر آستیں کے بغیر
یہ سانپ مُجھ کو مِلا ہے پَلا پَلایا ہُوا

حساب کر کے بہُت خُوش ہُوا ہُوں آخری وقت
کہ مَیں نے پایا ہُوا ہے نہ کُچھ گنوایا ہُوا

مَیں چھوڑ کر اُسے خُود ہی نِکل گیا اِک رات
جو آس پاس تھا اِک شہر سا بسایا ہُوا

بس ایک لَے ہی ذرا مختلف رہے گی کہ مَیں
سُناؤں گا وُہی نغمہ سُنا سُنایا ہُوا

مَیں اِس پہ خُود نہیں چلتا ہُوں اب تو بات ہے اور
یہ راستہ ہے ، وگرنہ ، مرا بتایا ہُوا

یہ شاعری تو کبھی میرے بس کا روگ نہ تھی
کِسی نے ہے مُجھے کِس کام پر لگایا ہُوا

مَیں ایک بوجھ ہُوں خُود اپنے آپ پر بھی ، ظفر
کبھی اُٹھایا ہُوا ہے کبھی گرایا ہُوا

-☆-

جہاں لمحہ شام بکھیر دیا
وہاں اک پیغام بکھیر دیا

ہم نے اُس کے ہی چاروں طرف
اُس کا انعام بکھیر دیا

اُوپر خاموشی تان رکھی
نیچے کُہرام بکھیر دیا

خُود اُس کے قدموں میں اپنا
سب پُختہ و خام بکھیر دیا

دروازہ کھولا جلدی سے
اور ، سارا کام بکھیر دیا

اپنی تو صفائی کیا دیتے
اُس پر الزام بکھیر دیا

چالاک پرندہ تھا وہ بھی
ہم نے بھی دام بکھیر دیا

جتنی تکلیف اکٹھا کی
اُتنا آرام بکھیر دیا

بکھرانے پہ جب آئے ، ظفر
ہر خاص و عام بکھیر دیا

-☆-

کیا کچھ بھی نہیں ہے ، اور ، معافی چاہتا ہوں
یہی چاہا تھا جب بھی ، اب اضافی چاہتا ہوں

محبت کے مدارج ہو گئے ہیں اور مشکل
سہولت کم ہوئی جاتی ہے ، کافی چاہتا ہوں

میں اُن شیریں لبوں کو دیکھ کر مچلا ہوں برحق
چلو ، ضد ہی سہی ، بچہ ہوں ، ٹافی چاہتا ہوں

محبت میں لیا ہے کام اب تک ٹوٹکوں سے
علاج اب اس مرض کا کوئی شافی چاہتا ہوں

محبت اور جاڑا زور کر آئے ہیں دونوں
سو ، اس رُت میں کوئی صورت لحافی چاہتا ہوں

کچھ اس میں اہلِ دُنیا کا کوئی جھگڑا نہیں ہے
جو میں اپنے اُصولوں کے منافی چاہتا ہوں

بہت تائید بھی میں نے کیے رکھی ہے اس کی
سو ، اب کے بحث کوئی اختلافی چاہتا ہوں

اگر وعدہ وفا کرنے پہ وہ آیا ہے آخر
تو اب میں آپ ہی وعدہ خلافی چاہتا ہوں

سنواری ہے ، ظفر ، زلفِ سخن میں نے ہمیشہ
اور ، اب اس میں ذرا سی مُوشگافی چاہتا ہوں

☆

انکار زمیں ہے کہیں اقرار زمیں ہے
پھیلی ہوئی چاروں طرف اظہار زمیں ہے

میں امن کا پرچم لیے پھرتا رہوں کب تک
جاتا ہوں جہاں بھی ، وُہی پیکار زمیں ہے

مایوس نہیں لوٹتا ہوں خواب سفر سے
ہر بار فلک ہے کبھی ہر بار زمیں ہے

یہ چھاؤں ہے یا چھاؤں کا شک سا ہے پس و پیش
کھنچنے کو مرے سامنے اشجار زمیں ہے

امکان کئی اور بھی نکلیں گے اسی طرح
اتنا ہی بہت ہے اگر آثار زمیں ہے

میں ایک اندھیرا سا کھڑا ہوں کسی جانب
یہ چاروں طرف کون سی انوار زمیں ہے

باہر بھی کمی کچھ نہیں فرسنگ بہ فرسنگ
اندر بھی اسی طرح سے بھرمار زمیں ہے

ممکن ہے اشارہ سا ہواؤں کا بھی اس میں
کوئی تو سبب ہے جو یہ اصرار زمیں ہے

باقی نہیں آنکھوں کی ضرورت ، ظفر ، اتنی
اندر ہی لہو میں کوئی دیدار زمیں ہے

☆

کاغذ پر اک باغ بنایا کرتا ہوں
اُلٹے سیدھے پھول کھلایا کرتا ہوں

جو معلوم نہیں اُس کی دیتا ہوں خبر
جو دیکھا ہی نہیں ، دکھایا کرتا ہوں

جُرأت سے کرتا ہوں بظاہر سارا کام
اندر سے لیکن گھبرایا کرتا ہوں

موقعے پر بھی اک دن پکڑا جاؤں گا
جس شے میں جو چیز ملایا کرتا ہوں

خود بھی کرنا پڑ جاتا ہے کچھ مجھ کو
اکثر تو میں کیا کرایا کرتا ہوں

لوگوں نے بہکایا تھا پہلے مجھ کو
اب لوگوں کو میں بہکایا کرتا ہوں

خود تو کہہ نہیں سکتا کوئی بات اُسے
سب کچھ اوروں سے کہلایا کرتا ہوں

وہ بھی اگرچہ شامل ہوتا ہے مجھ میں
میں خود اپنا بوجھ اُٹھایا کرتا ہوں

جن گلیوں سے گزرا تھا وہ بھی ، ظفر
اب تک اُن میں آیا جایا کرتا ہوں

☆

لیے ہوئے لاچاری کو
کوس رہا بے کاری کو

مجمع مہلت مانگتا ہے
فرصت نہیں مداری کو

تھیلیاں خالی پھرتی ہیں
ترسی ہوئیں ، سواری کو

جھگڑا تھا گرداور سے
پیٹ دیا پٹواری کو

آخر کو اقبالی نے
ڈھونڈ لیا انکاری کو

نیلا تو ویسا ہی رہا
فرق پڑا نسواری کو

جان چھڑوائی گرامر سے
ختم کیا دشواری کو

ہم اپنے ہی ساتھ ابھی
گنتے ہیں گردھاری کو

بیٹھا بھٹی جھونک ، ظفر
شعر سنا بھٹیاری کو

☆

پتا چلتا خبر ہونے سے پہلے
محبت تھی اگر ہونے سے پہلے

توقع ہے کہ سب کچھ دیکھ لوں گا
تماشا مختصر ہونے سے پہلے

کہیں صَرف نظر کے بعد ہوں میں
کہیں صَرف نظر ہونے سے پہلے

نہیں ہے فرق تو اب بھی کوئی خاص
یہی کچھ تھا اُدھر ہونے سے پہلے

بہت خاک اُڑ چکی ہو گی سر شام
ہمارے دربدر ہونے سے پہلے

تھکن سے چُور ہو جاتے ہیں کیوں پانو
یہاں عزم سفر ہونے سے پہلے

گزرتا تھا کہاں سے یہ زمانہ
ہمارے رہگزر ہونے سے پہلے

اثر کوئی تو ہونا چاہیے تھا
کچھ اپنے بے اثر ہونے سے پہلے

ظفر، ٹھوکر بھی کھائی ہے وہیں پر
بہت سوچا جدھر ہونے سے پہلے

-☆-

ہر سُو کیا جھولتا ہے مصرع
چلتے ہُوئے ڈولتا ہے مصرع

شاید کہیں نرم ہو سکیں کچھ
لفظوں کو پپوتا ہے مصرع

دیوار سی ایک اُٹھا کے اُس میں
در سا کوئی کھولتا ہے مصرع

جلتی ہُوئی ایک دوپہر میں
اِک شام سی گھولتا ہے مصرع

ڈنڈی بھی تو مارتا ہے، بے شک
ہر حرف کو تولتا ہے مصرع

معنی کے سوا ہے اور کچھ بھی
مصرعے کو ٹٹولتا ہے مصرع

چلتا نہیں بس جہاں کِسی پر
خُود کو ہی مدھولتا ہے مصرع

کہنا مرا مانتا ہے، لیکن
کچھ ٹال مٹولتا ہے مصرع

کہتا ہے، ظفر، خُود اپنے مُنہ سے
مُونگا ہے کہ بولتا ہے مصرع

-☆-

میں تو ہوں آواز کرنے کے لیے
تم نظرانداز کرنے کے لیے

کیا کوئی ہمراز کرنا ہے ضرور
کیا کوئی دمساز کرنے کے لیے

سوچنے ہی کے لیے ہوتے ہیں کچھ
کام، لیکن بعض کرنے کے لیے

خود تو وہ رُکتا کسی صورت نہیں
چاہیے اُس کو باز کرنے کے لیے

اک نئی ترکیب سُوجھی ہے ابھی
جسم کو پشواز کرنے کے لیے

خود کو رُسوا کر رہا ہوں شہر میں
اک ذرا ممتاز کرنے کے لیے

ڈھونڈتے پھرتے ہیں فرصت کی گھڑی
کچھ نیاز و راز کرنے کے لیے

اک چھیری سی لگا رکھتا ہوں میں
لفظ کو الفاظ کرنے کے لیے

جا رہا ہوں کس قدر خوش خوش، ظفر
میں اُسے ناراض کرنے کے لیے

☆

یہ گفتگو کا تکلف اُٹھانے والا ہوں
میں اپنے خاص اشارے بنانے والا ہوں

کمی سی پھر مری عزت میں آ رہی ہے بہت
چناں چہ پھر وہی تہمت اُٹھانے والا ہوں

غرض نہیں مجھے تعبیر سے کوئی ایسی
بس ایک خواب یہاں پر دکھانے والا ہوں

جو کہہ رہا ہوں، اہم وہ ہے، یہ نہیں ہے کہ میں
نیا نکور ہوں یا وہ پُرانے والا ہوں

زیادہ فرق نہیں رہ گیا ہے دونوں میں
رُلانے والا ہوں میں یا ہنسانے والا ہوں

سفر ہی زادِ سفر ہے جہاں بڑی حد تک
میں ایک ایسی مسافت پہ جانے والا ہوں

پھر اُس کے بعد مری ڈور کاٹ دے گا کوئی
ذرا سی دیر کو میں سرسرانے والا ہوں

خبر نہیں یہ مری موج ہے کہ مجبوری
کہ اپنے بعد بھی میں خود ہی آنے والا ہوں

میں بار بار کی ناکامیوں کے بعد، ظفر
نیا ہی کوئی ہنر آزمانے والا ہوں

☆

ڈر رہا تھا کہیں جاتا ہوا ہو جانے سے
میں کوئی بوجھ اٹھاتا ہوا ہو جانے سے

ایک ہی خواب دکھاتا کہیں بہتر ہوتا
ایک ہی بات بتاتا ہوا ہو جانے سے

ہوتے ہوتے کہیں جاتا ہوا رہ جانے پر
رفتہ رفتہ کہیں آتا ہوا ہو جانے سے

اپنے اندر سے نکالی ہوئی تاریکی کو
اپنے ہر سمت گھماتا ہوا ہو جانے سے

محترم ٹھہرا ہوں دنیا کی نظر میں کیا کیا
میں کوئی بات چھپاتا ہوا ہو جانے سے

وہ اگر آپ ہی آ جائے تو کیا اچھا ہو
شرم آتی ہے بلاتا ہوا ہو جانے سے

اپنا ہی خون بہاتا ہوا ہو جانا کیا
اپنی ہی خاک اڑاتا ہوا ہو جانے سے

چھت میں تارے سے اگر ٹانکتا رہتا شب بھر
فرش پر پھول کھلاتا ہوا ہو جانے سے

مجھ میں اک نقش سا جمتا ہوا ہوتا ہے ، ظفر
لکھ کے ہر لفظ مٹاتا ہوا ہو جانے سے

☆

چھوڑی حلوہ پوڑی میں نے
ڈالی نئی بھسوڑی میں نے

جب اُس نے سوفہ لگوایا
ساتھ بچھائی بھوجڑی میں نے

اور اب کیسے کرتا قابو
ہاتھ پانو سے جوڑی میں نے

بوڑھا ہونے سے پہلے ہی
شکل بنائی بوڑھی میں نے

گھر کی روشن دیواروں پر
ملی سیاہی گوڑھی میں نے

دانت بجے تو ایک رضائی
اُٹھ کر اوڑھی میں نے

اور ، اُس کے آگے لا رکھا
سب کچھ تلہ توڑی میں نے

شعر ہوا تیار تو اُس پر
اور اک چیز بھی ڈھوڑی میں نے

سچی بات ، ظفر ، اتنی ہے
کتھا سنائی کوڑی میں نے

☆

کن چیزوں کے لیے ترستا رہتا ہوں
آپ اپنی حالت پر ہنستا رہتا ہوں

سارے پار نکل جاتے ہیں پانی سے
اور ، میں پاینچے ہی اُڑستا رہتا ہوں

ایک جال ہوں اوپر نیچے بچھا ہوا
جس میں روز نکلتا پھنستا رہتا ہوں

کام آتا ہے اپنا ہی ملبا میرے
یونہی اُجڑتا رہتا بستا رہتا ہوں

آپ تو ہے وہ شاخِ شجر سے کٹی ہوئی
میں جس سے ہر دم پیوستہ رہتا ہوں

اُس نے جن لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا
میں جن لوگوں سے وابستہ رہتا ہوں

میری مانگ نہ کیوں کر سب سے بڑھ کر ہو
مہنگائی ہے ، اور ، میں سستا رہتا ہوں

سائبان سا تنا ہوا ہوں دُنیا پر
کسی دھوپ میں آپ جھلستا رہتا ہوں

سارے امکانات ہو گئے ختم ، ظفر
رہا سہا اک میں ہی رِستا رہتا ہوں

☆

روز میں اپنے کنارے تک چلا جاتا ہوا
اور ، اِسی حالت میں پھر واپس بھی لوٹ آتا ہوا

شام کا چھوٹا سا اک ٹکڑا بچا رکھنے کے بعد
رات بھر رہتا ہوں میں ہنستا ہوا ، گاتا ہوا

راہ کے روڑے بھی میرے کام آئے ہیں بہت
میں کہاں تک آ گیا ہوں ٹھوکریں کھاتا ہوا

کس طرف سے آ کے جاتا ہے یہاں سے کس طرف
ایک جھونکا سا مرے جنگل کو مہکاتا ہوا

کوئی سنتا ہے نہ مجھ کو دیکھتا ہے ، جس گھڑی
شور سا ، گلیوں میں چل پڑتا ہوں ، لہراتا ہوا

وہ مجھے میرے ہی تک محدود سا کرتے ہوئے
اور ، میں چادر سے باہر پانو پھیلاتا ہوا

دوسروں کو میں بھلا سمجھا سکوں گا کس طرح
میں کہ اپنے ہی کو ہوں دن رات سمجھاتا ہوا

میں جو کہتا ہوں وہ سب کی ملکیت ہے ، اور ، میں
ایک جانب کو کے ہو جاتا ہوں شرماتا ہوا

کس ہوا کی زد پہ رہتا ہوں ، ظفر ، شام و سحر
کوئی کیوں رکھتا ہے مجھ کو یوں ہی تھرّاتا ہوا

☆

جہاں میری کبھی تیری پڑی ہے
وہیں کوڑے کی اک ڈھیری پڑی ہے

جدھر ڈر کر گزرتا تھا اندھیرا
وہیں پر روشنی گھیری پڑی ہے

کہیں چھانگے ہوئے امرود ہیں ، اور
کہیں کاٹی ہوئی بیری پڑی ہے

منوں کے باٹ ہیں اس کے جہاں پر
وہاں اپنی بھی پنسیری پڑی ہے

بہت مدّت سے جو امرتسری تھی
کئی دن سے وہ اجمیری پڑی ہے

وہ سادھو کر گئے ہیں کوچ ، لیکن
کہیں کیری ، کہیں گیری پڑی ہے

مَیں سودا بیچ آیا ہوں بہت سا
ابھی بس آخری پھیری پڑی ہے

کبھی فکرِ سخن کرتا تھا خود مَیں
سخن کو فکر اب میری پڑی ہے

ظفر ، مصرع تو آتا ہے بنانا
مگر ، کچھ حاجتِ شعری پڑی ہے

-☆-

نہ ہمارے نہ تمہارے جھلمل
کب کریں گے یہ بچارے جھلمل

بجھ گئے خاک تک آتے آتے
آسمانوں سے اُتارے جھلمل

کچھ سجھائی نہیں دیتا اب تو
کیا ہوئے سارے کے سارے جھلمل

روز و شب گرد اُڑا کرتی ہے
کیا کوئی نقش نکھارے جھلمل

دھند میں راہ دکھانے کے لیے
اُنگلیوں کے وہ اِشارے جھلمل

چار سُو پھیلا ہُوا خواب دُھواں
وسط میں چند شرارے جھلمل

رات ہی رات ہے اندر باہر
شاید آ کر وہ پکارے جھلمل

کر گئے اور بھی تاریک یہ عُمر
چند لمحے جو گزارے جھلمل

ہر طرف زور اندھیرا ہے ، ظفر
اور ، اندھیرے کے کنارے جھلمل

-☆-

لفظوں کو لٹکا دیتا ہوں
معنی سا پھیلا دیتا ہوں

ایک شکل کو موڑ توڑ کر
صورت نئی بنا دیتا ہوں

پردہ اُٹھنے اور گرنے میں
منظر کوئی دکھا دیتا ہوں

کسی چیز میں ڈرتے ڈرتے
کوئی چیز مِلا دیتا ہوں

آگ لگاتا ہوں جنگل میں
خود ہی اُسے بُجھا دیتا ہوں

کچھ بھی نہیں ہے پلّے میرے
سب کو صاف بتا دیتا ہوں

آگے پیچھے دیکھ بھال کر
یہاں وہاں بکھرا دیتا ہوں

پڑ کر نئی کسی اُلجھن میں
پچھلی بات بھُلا دیتا ہوں

بات، ظفر ایک ایسی ہے جو
بار بار دُہرا دیتا ہوں

☆

چار سُو پھیلا ہُوا چوکور ہے
مَیں نہیں کہتا خُدا چوکور ہے

جانچ کر دیکھی ہے مَیں نے سُو بہ سُو
میرے کمرے کی ہوا چوکور ہے

کیا جڑی ہے اس میں تصویرِ طلب
کس طرح کی یہ صدا چوکور ہے

ہیں محبت کی تکونیں ہر طرف
گفتگو کا سِلسلہ چوکور ہے

دائرے کی شکل میں لیٹا تھا جو
صبح کو سو کر اُٹھا چوکور ہے

کچھ وہ لگتا بھی ہے خاصا مُستطیل
کچھ ہمارا دیکھنا چوکور ہے

اور ہی اُس نے کہا ہو گا، مگر
کیا کروں، مَیں نے سُنا چوکور ہے

کچھ دنوں سے میرے گھر آتا ہُوا
جلوۂ سیلِ بلا چوکور ہے

راز کھُل جائے گا یہ جلدی، ظفر
کیا نہیں ہے، اور، کیا چوکور ہے

☆

یہ کس اینٹ پتھر سے پیراستہ ہوں
کوئی بند ہوتا ہوا راستہ ہوں

کئی دن سے ہوتا ہوں گھر میں ہی اپنے
کہیں آستا ہوں نہ اب جاستا ہوں

مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے ہے
میں جس دن سے اُس کی تمناستا ہوں

نہ مصروفیت اُس کو ہے کچھ یہاں پر
نہ میں ہی کوئی کام کرتاستا ہوں

کوئی شرم ہے جو مجھے گھیرتی ہے
کوئی شور ہے جو میں سُنتاستا ہوں

جہاں سے مجھے کر گئے تھے روانہ
میں اب بھی اُسی جگہ بیٹھاستا ہوں

مری کیفیت ہے عجب کچھ دنوں سے
نہ ہنستاستا ہوں نہ روتاستا ہوں

میں سُنتا ہوں سب دُوسروں کی جو باتیں
تو اپنی بھی ہر بات کہتاستا ہوں

ظفر، قافیوں سے بنی ہے یہ صورت
کہ ایساستا ہوں نہ ویساستا ہوں

☆

کسی نقش کی ہے خبر نشان کے درمیاں
کوئی وہم اور بھی ہے گمان کے درمیاں

میں نکل ہی جاؤں گا اپنے آپ اُسی گھڑی
اگر آ بھی جاؤں گا داستان کے درمیاں

مجھے فکرمند سا کر گیا ہے کچھ اور بھی
مرا ذکر ہے جو ترے بیان کے درمیاں

وہیں رہ گئے تھے قفس میں ہی مرے بال و پر
مجھے یاد آئی یہ بات اُڑان کے درمیاں

سرِ آب سیل ہوا ہوں اور ہی طرح کا
جو رُکا ہوا ہوں میں بادبان کے درمیاں

جو رہے تو ایک ہی رابطہ ہے بچا کھچا
یہ ستارہ میرے اور آسمان کے درمیاں

کوئی راستہ نہیں اس بھنور سے رہائی کا
وہ پھنسا ہوا ہے جو میرے دھیان کے درمیاں

مرا منتظر ہے کوئی ہدف بڑی دیر سے
میں ابھی کھنچا ہی نہیں کمان کے درمیاں

میں اُسی کا کھوج لگا رہا ہوں ابھی، ظفر
وہ جو شے ہے ذائقے اور زبان کے درمیاں

☆

سماں دُھوپ کی دھار کا
چہرہ سُورج مار کا

دُوسری بار آغاز ہو
اُس دُشوار گُزار کا

کٹے پھٹے ابلاغ سے
پیرایہ اظہار کا

مٹی ہُوئی تصویر کی
گری ہُوئی دیوار کا

بارش کہیں بسنت میں
بادل کِسی غُبار کا

کبھی کبھی اقرار میں
کبھی کبھی انکار کا

باہر کے باہر وُہی
آر کے اندر پار کا

دھجی دھجی دُھواں ہے
کیسا زار و زار کا

حُسن حویلی پہ ، ظفر
پھول کھلا مسمار کا

☆

پہلا نہیں ، دوبارے والا
بوسہ وُہی کرارے والا

مقصد ہے کُچھ اُوپر نیچے
مطلب نہیں اشارے والا

تھوڑی گھاس کے تختے والی
کُچھ پھولوں کے کیارے والا

آنکھیں بند کیے رکھتا ہے
اَن دیکھے نظارے والا

رستے بھول بھلیاں والے
راہی شام کنارے والا

کنُواں ایک ، اور ، دو ہیں پانی
میٹھے والا ، کھارے والا

خواب کا ٹکڑا سا باقی ہے
تتلی اور ستارے والا

بات مسالے دار چاہیے
شعر کوئی چٹخارے والا

کوئی ظفر مطلوب ہے اُن کو
سرکارے دربارے والا

☆

پکڑے گئے ہاہاکاری میں
کبھی چوری میں ، کبھی یاری میں

یا جھڑکیاں سُنتے رات کٹی
یا گزری عرض گزاری میں

حصّہ رہتا ہے اپنا بھی
کہیں آدھی میں ، کہیں ساری میں

کچھ رہا بھی ہم سے دُور دُور
اچھا بھی لگا پھلکاری میں

اچھے رہے جاگنے والوں سے
سوتے رہے جو بیداری میں

جیسے بھی ہیں ، ساتھ اُس کے ہم بھی
موجود ہیں صدمہ جاری میں

کچھ بھی نہ ہُوا اور لگے رہے
کچھ کرنے کی تیاری میں

کچھ فرق ہی باقی نہیں رہا
خواری اور عزت داری میں

بدلا ہے بڑی مُشکل سے ، ظفر
ہموار کو ناہمواری میں

-☆-

بالآخر حال سے بے حال کر کے
مجھے پھینکا ہے استعمال کر کے

کہیں گُم کر دیا خُود میں ہی مُجھ کو
کبھی ڈھونڈا تھا جس نے بھال کر کے

مَیں اپنے گھر تک آ پہنچا ہُوں آخر
بڑی مُشکل سے اُس کو ٹال کر کے

وہاں پھیلا کے ٹھنڈے فرش پر ہی
یہاں بستر پہ اُس کو ڈال کر کے

گرے شاید کوئی اِس میں ستارہ
پڑا ہُوں رات کو رُومال کر کے

کبھی خاموش ہو رہتا ہے یہ دل
بج اُٹھتا ہے کبھی گھڑیال کر کے

کہیں مَیں پھڑپھڑاتا ہُوں تہِ دام
کہیں بیٹھا ہُوں خُود کو جال کر کے

بہا دُوں گا نشیبِ شاعری میں
مَیں اپنے آپ کو سیّال کر کے

ظفر ، گا کر غزل پڑھنے لگا ہُوں
یہ چھوڑے گی مُجھے قوّال کر کے

-☆-

ذکر اُس کا ہی کِیا کرتا ہوں
کام اپنا ہی کِیا کرتا ہوں

صرف مجھ تک ہو رسائی جس کی
شور اُتنا ہی کِیا کرتا ہوں

فیصلہ کوئی نہیں ہو پاتا
روز جھگڑا ہی کِیا کرتا ہوں

کام اچھا نہیں کرتا ہوں کوئی
یہ بھی اچھا ہی کِیا کرتا ہوں

لوگ سُنتے نہ کیے کرتے ہوں
بات کہتا ہی کِیا کرتا ہوں

سُنتا رہتا بھی ہوں طعنے اُس کے
اور ، بیٹھا ہی کِیا کرتا ہوں

میں اچانک نہیں کرتا کچھ بھی
رفتہ رفتہ ہی کِیا کرتا ہوں

بیٹھ کر کچھ نہیں ہوتا مجھ سے
آتا جاتا ہی کِیا کرتا ہوں

شعر کہنے کے بہانے سے ، ظفر
اک تماشا ہی کِیا کرتا ہوں

☆

کچھ رابطے رہے قریبی سے
کہیں بابے سے ، کہیں بی بی سے

تعمیر جو کرنے آئے ہیں
لگتے ہیں کوئی تخریبی سے

کچھ مار دیے مہنگائی نے
کچھ گور کنارے ٹی بی سے

ہم چھوڑ نہیں سکتے اس کو
رشتہ ہے خاص غریبی سے

کچھ اُس کا ہاتھ بھی ہلکا تھا
کچھ اپنی نیک نصیبی سے

ہم آپ کنُوئیں میں کود گئے
اک شخص کی خوش ترغیبی سے

باتیں کرتے تھے بھلی بھلی
بیٹھے ہوئے بدتہذیبی سے

وہ بنے ہوئے ہیں ، کیا کہیے
کِن اجزائے ترکیبی سے

کچھ اور سجا دیتا ہوں ، ظفر
ترتیب کو بے ترتیبی سے

☆

برا ہوتے کہ اچھا ہوتے ہوتے
اگر رہ جائے جھگڑا ہوتے ہوتے

میں رک جاتا ہوں کرتے کرتے کیا کچھ
بدل جاتا ہوں کیا کیا ہوتے ہوتے

الٹ بازی شتابی سے لگا لوں
لگے گا وقت سیدھا ہوتے ہوتے

مزہ بھی کوئی آتا آخرکار
اگر ہر کام ہوتا ہوتے ہوتے

بھلا اتنی بھی کیا جلدی ہے اس بار
کہ ہونے والا ہو گا ہوتے ہوتے

خسارہ بھی نکل آتا ہے اکثر
محبت میں منافع ہوتے ہوتے

وہ اپنا بھی نہ ہو پایا کسی طور
بہرصورت ہمارا ہوتے ہوتے

کرے گا صورتیں تبدیل کتنی
ابھی یہ شہر صحرا ہوتے ہوتے

ظفر، دکھلانے والا ہوں تماشا
نہ رہ جاؤں تماشا ہوتے ہوتے

☆

دولت خود رہی روانی میں
کبھی آنی میں، کبھی جانی میں

پہنچے ہیں اسی نتیجے پر
مشکل ہے بہت آسانی میں

ڈرتے ڈرتے تبدیل ہوئی
یارانے سے یارانی میں

اک خواب نکالا مٹی سے
اک چیز ملائی پانی میں

محدود کیا اور خوار ہوئے
خوش رہتے تھے طولانی میں

کچھ لہو ہمارا گرنے پر
کچھ خاک ہماری چھانی میں

صدیوں کی مسافت باقی ہے
حیوانی سے انسانی میں

مسکی ہے غزل کی چولی بھی
الفاظ کی کھینچاتانی میں

رہتے ہیں مست الست، ظفر
ہم اپنی ہی نادانی میں

☆

جو اُن کے ہمسایے ہمارے میں رہیں گا
تحقیق کہ وہ خود ہی خسارے میں رہیں گا

لے جائیں گے کاندھے پہ حریف اُس کو اُٹھا کر
اور، دل یونہی مصروف اشارے میں رہیں گا

کھو جائیں گا پھر رات کی گہرائی میں وہ رنگ
کچھ دیر سرِ شام ستارے میں رہیں گا

پھیلے گا بہت دوسرے اطراف میں پانی
یا اپنے بنائے ہوئے دھارے میں رہیں گا

سب ڈوبیں گے اور تہ میں اُتر جائیں گے یکسر
وہ ایک ہی مشغول کنارے میں رہیں گا

تصویر کا موسم ہی بدل جائیں گا اک دن
بکھرا ہوا منظر بھی نظارے میں رہیں گا

اس گھر کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ شوخ
اک بار رہیں گا تو دوبارے میں رہیں گا

اس جسم کا ٹکڑا ہے اک ایسا بھی کم و بیش
جو ہم سے جدا ہو کے تمہارے میں رہیں گا

کیا چادرِ معنی سے نکالے گا ظفر پانو
دانا ہے بہت، اپنے گزارے میں رہیں گا

☆

سارا دانہ پانی لے گئے
میری بھی نشانی لے گئے

چھوڑی میرے پاس، طبیعت
اپنے ساتھ روانی لے گئے

چلے گئے تو جاتے جاتے
ہر شے آنی جانی لے گئے

لکھت پڑھت سے لے گئے کچھ تو
کچھ اشیا وہ زبانی لے گئے

شاید واپس ہی کر جائیں
جو چیزیں انجانی لے گئے

سارا تو سامان نیا تھا
کیوں تصویر پرانی لے گئے

بھینس کو اُس کے حال پہ چھوڑا
گھنگرو لے گئے، گانی لے گئے

ڈال گئے مشکل میں مجھ کو
خود میری آسانی لے گئے

ایک ظفر بچ نکلا، لیکن
اُس کی کارستانی لے گئے

☆

کہے کو چھوڑ دیا ، اَن کہے کو چھوڑ دیا
چلے ہی تھے کہ سفر راستے کو چھوڑ دیا

جو بن نہ آئی تو پھر ہم نے اور لفظوں نے
ہمیشہ کے لیے اک دُوسرے کو چھوڑ دیا

کہیں جو تھا ہی نہیں ہم نے اپنی آنکھوں کو
بھرے جہاں میں اُسے دیکھنے کو چھوڑ دیا

بُرے سے بھی گئے اور مل سکا بھلا بھی کہاں
بھلے کی آس میں ہم نے بُرے کو چھوڑ دیا

یہاں نئے سے نئے کی تلاش تھی ہم کو
پسند کر کے بھی ہر ذائقے کو چھوڑ دیا

ذرا سا ڈولنے کے بعد ہو گئے قائم
کہ چھوڑنا ہی تھا جب ، آسرے کو چھوڑ دیا

ہم اپنے راستے پر چل دیے محبت میں
وہ سوچنا تھا بہت ، سوچنے کو چھوڑ دیا

خدا کی طرح اکیلے ہی رہ گئے آخر
کہ رفتہ رفتہ ہر اک لاحقے کو چھوڑ دیا

کچھ اپنی سعیِ سخن کی مثال یُوں ہے ، ظفر
کہ جیسے پکڑے ہُوئے آئنے کو چھوڑ دیا

-☆-

راستے سے جو گزرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں
دھول کی طرح اُبھرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

کرتا رہتا ہُوں بہت اُس کے مخالف باتیں
سامنے آئے تو ڈرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

اُس گلی میں مُجھے کیا روکنے لگتا ہے کوئی
آپ ہی مَیں تو ٹھہرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

اُس کے ہونے کی پڑی ہے مُجھے عادت ایسی
نہیں ہوتا ہے تو مرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

کون سی بات ہے جس کے لیے مَیں بر سرِ عام
ساری باتوں سے مُکرتا ہُوا ہو، جاتا ہُوں

میرے باہر نہیں ہوتی ہے اگر گنجائش
اپنے اندر ہی بکھرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

سطح پر میری خبر تیر رہی ہوتی ہے
کبھی تہ میں جو اُترتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

حرف سا کوئی پھسل جائے جو ہونٹوں سے مرے
بات سی کوئی بسرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

کبھی تسلیم بھی کرتا ہُوں کُھلے دل سے ، ظفر
کبھی انکار بھی کرتا ہُوا ہو جاتا ہُوں

-☆-

ملے جلے منظر کرنا
کب تک اور سفر کرنا

دینے لگی ظلمت گھر
کیا اب دل میں گھر کرنا

آنچل سا رکھنا وہ یاد
چہرہ سا ازبر کرنا

پانی پانی ہو گئے ہم
تھا دامن کو تر کرنا

پھرتے ہوئے تماشے پر
گرتی ہوئی نظر کرنا

کر ہی دینا ہے ناچار
یعنی پڑے اگر کرنا

خواب تو دیکھا تھا میں نے
بھول گیا ہوں خبر کرنا

عیبوں نے رکھا مصروف
آیا نہیں ہنر کرنا

برساتی شاعر تھے ظفر
بیٹھ گئے ٹر ٹر کرنا

☆

سورج اوپر نیچے سا ہونے لگتا ہے
شام سے پہلے اس کو کیا ہونے لگتا ہے

خاموشی چلتی رہتی ہے گرتی پڑتی
آگے پیچھے شور بپا ہونے لگتا ہے

آنکھیں وہی پرانی ہی رہتی ہیں، لیکن
منظر پھر اک بار نیا ہونے لگتا ہے

تارے کہیں سے آنے والے سے لگتے ہیں
چاند کہیں کو گیا ہوا ہونے لگتا ہے

سونے سونے میں ہوتی ہے آبادی سی
ہلکا ہلکا سا گہرا ہونے لگتا ہے

پھر گڑبڑ سی ہو جاتی ہے کوئی نہ کوئی
حال ہمارا جب اچھا ہونے لگتا ہے

کب سے کیسا ہونا چاہیے اندر باہر
لیکن بالآخر کیسا ہونے لگتا ہے

ہونے میں ہے کوئی خرابی یا پھر مجھ میں
سیدھا چاہتا ہوں، الٹا ہونے لگتا ہے

عادت پڑ جائے گی، ظفر، کچھ ہوتے ہوتے
یہی غنیمت ہے جتنا ہونے لگتا ہے

☆

ابر ہے ٹھنڈی ہوا کے اردگرد
کیا فضا ہے اس فضا کے اردگرد

ہے خُدا جب چار سُو پھیلا ہُوا
کُچھ تو ہو گا ہی خُدا کے اردگرد

مَیں تو بس گنتی میں ہُوں اس خاک پر
ہے بہت میرے ہوا کے اردگرد

دیکھتا ہُوں اپنے کانوں سے ابھی
کتنی تصویریں صدا کے اردگرد

اب نہیں تو کون مانے گا یہاں
مَیں بھی تھا ارض و سما کے اردگرد

آدمی میں اک تجسس چاہیے
کیا نہیں موجود ، کیا کے اردگرد

اور بھی مصرُوفیت رہتی ہے کُچھ
مَیں نہیں ہوتا نوا کے اردگرد

اک جہانِ خواب سا بکھرا ہُوا
ہے کے اندر اور تھا کے اردگرد

کتنی آنکھیں ہیں ، ظفر ، ٹھہرے ہُوئے
ایک جانب دیکھتا کے اردگرد

☆

بے عیب رہ گیا تو ہُنر کیسے آئیں گا
بھولا اگر نہیں ہے تو گھر کیسے آئیں گا

رہتی ہے موسموں کی خرابی یُونہی اگر
خوابِ ہوا پہ رنگِ خبر کیسے آئیں گا

اس دشت و در میں میری مُلاقات کے لیے
کیوں کر رُکے گی شام ، شجر کیسے آئیں گا

لکھ تو دیا ہے مَیں نے بڑے شوق سے ، مگر
میرے لکھے ہُوئے میں اثر کیسے آئیں گا

وہ بیٹھتا نہیں ہے اگر آپ کے سامنے
پھر پیار کیسے آئیں گا ، ڈر کیسے آئیں گا

جاتا تو ہر طرف ہے وہ آپ اپنی موج میں
لیکن ، سوال یہ ہے ادھر کیسے آئیں گا

آنے سے اُس کے دن تو نکل آئیں گا ، مگر
وہ اتنی روشنی میں نظر کیسے آئیں گا

ہیں اُس کی راہ میں بھی ہزاروں رُکاوٹیں
آنا تو چاہتا ہے ، مگر ، کیسے آئیں گا

کچھ مُسافروں کی مُدارات ہی ، ظفر
بیٹھے رہے تو عزمِ سفر کیسے آئیں گا

☆

کچھ میٹھا ، ہنستا ہو جاؤں
اُس سا ، یا اس سا ہو جاؤں

میں روکوں اس طغیانی کو
یا اس کا حصّہ ہو جاؤں

میں یاد نہ آؤں کسی کو بھی
بھولا ہوا قصّہ ہو جاؤں

کہیں کاری ضرب لگانے کو
کوئی ڈھانڈا ، ڈھستا ہو جاؤں

پھر پاؤں نہ خود کو شاعری سے
کچھ تو گل بکتا ہو جاؤں

فرمائش سب کی ہے مجھ سے
میں اب کس کس سا ہو جاؤں

گھر جیسا تو کیا ہونا ہے
اپنے آفس سا ہو جاؤں

پھینک آئے مجھے کوئی کوڑے پر
رطب و یابس سا ہو جاؤں

خود سا ہی ظفرؔ ، رہ جاؤں گا
چاہے جس تس سا ہو جاؤں

☆☆

دکان بڑھا ہی دوں گا اک دن
یہ پردہ گرا ہی دوں گا اک دن

سب ضابطوں اور قاعدوں کو
آپس میں ملا ہی دوں گا اک دن

ہر شے میں اگر خدا نے چاہا
ہر چیز کھپا ہی دوں گا اک دن

نیت بری کیا ہے ، آخرکار
میں صاف بتا ہی دوں گا اک دن

میں چھوڑ ہی دوں گا تھی روایت
یہ رسم اٹھا ہی دوں گا اک دن

یہ دل مرے کام کا نہیں اب
یہ شمع بجھا ہی دوں گا اک دن

خود کو تو کروں گا ہی میں قائل
اس کو بھی سنا ہی دوں گا اک دن

اک عمر سے جو دبا ہے دل میں
وہ شور مچا ہی دوں گا اک دن

موقع جو ، ظفرؔ ، ملا تو یکسر
ظاہر کو چھپا ہی دوں گا اک دن

☆☆

ٹوٹنے پھوٹنے سے پہلے ہی
عکس تھا آئنے سے پہلے ہی

راستے پر گرا ہوا تھا وہاں
پیڑ تو کاٹنے سے پہلے ہی

آسمان و زمیں اگر مِل جائیں
آپ کے جوڑنے سے پہلے ہی

کام اک پیشتر ہی کرنے کے
بات اک سوچنے سے پہلے ہی

چمک اُٹھتا ہوں اپنے آپ بھی میں
جھاڑنے پونچھنے سے پہلے ہی

بُوزنہ کس لیے ہوا وارد
تھے اگر بوزنے سے پہلے ہی

وہ مجھے ڈانٹنے کے بعد ہوا
میں اُسے چومنے سے پہلے ہی

ہم نے اُس کو پسند کر ڈالا
دیکھنے بھالنے سے پہلے ہی

منتشر کر دیا کروں گا، ظفر
خواب کو دیکھنے سے پہلے ہی

☆

مرے الفاظ ہیں سب کچھ معانی کے بجائے
توجہ چاہتا ہوں مہربانی کے بجائے

یہ کیسا راستہ ہے جس میں اکثر میری خاطر
رُکاوٹ ہی رُکاوٹ ہے روانی کے بجائے

اُسی تصویر کی تکرار کرنا چاہتا ہوں
ہے میرا نقشِ اوّل نقشِ ثانی کے بجائے

میں اُس کو رایگاں میں آپ ہی تبدیل کرتا
یہاں جو کچھ بھی ہوتا رایگانی کے بجائے

کوئی پیرایہ ہونا چاہیے تھا طُرفہ تر بھی
کوئی اُسلوب ایسی خوش بیانی کے بجائے

مجھے اپنی حدوں کا خود بھی اندازہ ہو کچھ تو
سمٹنا چاہتا ہوں بے کرانی کے بجائے

محبت کی مسافت میں لگی ہے پیاس کیسی
مجھے کچھ اور ہے مطلوب پانی کے بجائے

زمیں سے ہی اُٹھے میرے لیے اب تو مصیبت
بلائے ناگہانی، آسمانی کے بجائے

ظفر، اب تو اشارے بھی بہت دینے لگے کام
یہی میری زباں ہے بے زبانی کے بجائے

☆

سنیں گے آپ بھی شاید نئے طریقے سے
کروں میں بات اگر دوسرے طریقے سے

میں کر بھی سکتا ہوں بے قاعدہ سا کچھ اظہار
میں سوچ سکتا ہوں جس طرح بے طریقے سے

مگر میں آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا کبھی
سمجھ تو سکتا ہوں میں آپ کے طریقے سے

وہ سن کے سوچ میں پڑ جائیں تو یہی ہے بہت
کروں گا بات ذرا کج سے ، طریقے سے

نکل ہی آئے گا کوئی تو ان کہا اسلوب
کہی جو بات کسی ان کہے طریقے سے

غلط نہیں ہے طریقہ بہت ہمارا بھی
ملا تو ہم اسے سمجھائیں گے طریقے سے

میں رک بھی جاؤں گا ، ایسی تو کوئی بات نہیں
اگر وہ آ کے مجھے روک دے طریقے سے

جسے میں روح کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں
وہ مجھ سے ملتا ہے کیوں فاصلے طریقے سے

وہاں سے کوئی خسارہ ہی لے کے آتا ہوں
گیا نہیں ہوں کبھی فائدے طریقے سے

جہاں سے خود بھی سلامت نکل نہیں سکتا
بچا رہا ہوں اسے ڈوبتے طریقے سے

مجھے تلاش کرو مجھ سے دور دور کہ میں
رکا ہوا ہوں کہیں بھاگتے طریقے سے

کچھ احتیاط ، کہ نازک ہے میرا کام بہت
جڑا ہوا ہوں کسی ٹوٹتے طریقے سے

یہاں تک آیا ہوں میں اپنی معرفت ہی ، مگر
وہاں گیا تھا کسی واسطے طریقے سے

میں سطحِ آب پہ پتا سا رہ گیا موجود
مگر ، لرزتے ہوئے ، ڈولتے طریقے سے

مرے وجود میں ہے ایک استقامت بھی
اگرچہ ہے تو ذرا بکھرے بکھرے طریقے سے

اسے بھلا بھی دیا ، اس کو یاد بھی رکھا
کسی بھی سطح پہ ، کچھ رابطے طریقے سے

کسی حساب سے میرا نہیں شمار کہیں
کسی کتاب میں ہوں ان لکھے طریقے سے

ابھی وہ طفلِ تماشا مرے دماغ میں ہے
میں جی رہا ہوں ابھی کھیلتے طریقے سے

مرا بھی عکس لرزتا ہو سبز آنکھوں میں
چمک دکھاؤ کبھی آئنے طریقے سے

مَیں اُس کے سامنے تھا یُوں تو قائم و دائم
مگر، بس ایک ذرا کانپتے طریقے سے

نگاہِ شک سے مَیں دُنیا کو دیکھتا ہُوں ابھی
کہ سوچتا ہُوں کسی شابے طریقے سے

کسی تلاش میں پھرتا ہُوں مارا مارا وہاں
یہاں بھی ہُوں تو اُسی ڈھونڈتے طریقے سے

مرا طریقہ مجھے بھی بہت عجیب لگا
مَیں یاد کرتا ہُوا بھولتے طریقے سے

مرے لیے ابھی منزل نہیں ہے چیز کوئی
مَیں جا رہا ہُوں ابھی راستے طریقے سے

کچھ اب تو مَیں رُخِ روشن بھی دیکھ لیتا ہُوں
کیا ہے ذکرِ خزاں بھی ہرے طریقے سے

کسی تعلقِ تنہا کی طرح کا کوئی خواب
کوئی خیال کسی سلسلے طریقے سے

کبھی چلا تھا جہاں سے، پہنچ گیا ہُوں وہیں
کسی طرح سے، کسی گھومتے طریقے سے

جہاں ملا وہ مجھے، خود وہاں پہ تھا ہی نہیں
مگر، یہ ہو ہی گیا حادثے طریقے سے

مَیں اس طرح تو کہیں بھی نہیں پہنچ سکتا
اُس ایک شخص کے اِس روکتے طریقے سے

مَیں اک زمانے سے رہتا ہُوں خالی خالی سا
دکھائی دیتا ہُوں، لیکن بھرے طریقے سے

پڑا تو ہے مرے دل پہ کشاں کشاں لیکن
یہ نقش پا ہے ابھی رینگتے طریقے سے

ہوا سی چلتی ہی رہتی ہے میرے سر میں کہیں
ڈرے ڈرے سے، تھکے ہارتے طریقے سے

اُمید رکھتا ہُوں کچھ نااُمیدیوں سے ابھی
یقین کرتا ہُوں، اور، واہمے طریقے سے

مَیں جل رہا ہُوں دیا سا ہوا کی راہوں میں
کچھ اپنے طاقِ سفر پر دھرے طریقے سے

بدلتا رہتا ہُوں مَیں اپنے آپ کو ہر دم
چکھا بھی کرتا ہُوں کچھ ذائقے طریقے سے

جہاں تہاں مجھے بے قاعدہ ہی راس آیا
مجھے پسند نہیں قاعدے طریقے سے

سروں کو ڈھانپ تو رکھا ہے بے طریقہ ہی
اُٹھے ہوئے ہیں مگر، پائینچے طریقے سے

یہاں سے جا کے طریقہ بھلا دیا سارا
وہ تھے اگر تو مرے پاس تھے طریقے سے

وہ جب بھی آئے تو ہڑبونگ ایک ساتھ آیا
مگر، یہاں سے ہمیشہ گئے طریقے سے

کمال آدمی تھا، وہ ہمیں ہی مار گیا
ہمارے سامنے رکھے ہوئے طریقے سے

جب اور کوئی طریقہ نہ کارگر ٹھہرا
تو اُس کو زیر کیا تیسرے طریقے سے

سلوک اُس نے بظاہر تو ٹھیک ٹھاک کیا
ملا بھی وہ ہمیں اچھے بھلے طریقے سے

جو دوستوں نے تردّد کیا ہی تھا اتنا
تو اُس کے ساتھ ہمیں جوڑتے طریقے سے

بھلا رکھا ہے کسی یاد کے تکلف میں
پکڑ رکھا ہے مجھے چھوڑتے طریقے سے

کبھی نگاہ میں نرمی بھی آئے گی اُس کی
جو دیکھتا ہے مجھے گھورتے طریقے سے

بھٹک رہا ہوں میں جو ہے مرے مقدر میں
گزر رہی ہے مری جھیلتے طریقے سے

کہیں ملے تو سہی وہ شگفتہ لب ہم کو
کچھ اُس سے بات کریں چومتے طریقے سے

مری طرح وہ نظر آئے کیا کسی کو یہاں
میں دیکھتا ہوں جسے زاویے طریقے سے

کسی کو لمحۂ آئندہ کا گماں ہی نہیں
رواں دواں ہیں سبھی بُلبُلے طریقے سے

کہاں ملے گا وہاں پر سُراغ منزل کا
سفر ہُوا ہو جہاں دائرے طریقے سے

مجھے بھی گو ہے پرہیز دوسروں کی طرح
مگر، ذرا کی ذرا گُلگُلے طریقے سے

تنا ہُوا تھا مرے سر پہ آسماں جیسا
میں ڈھونڈتا تھا جسے سامنے طریقے سے

کچھ اس میں تھوڑی سی اپنائیت بھی آئے نظر
ملا کرو ہمیں شکوے گلے طریقے سے

اب ایک بار یہ انجان راستہ بھی سہی
پلٹ چلا ہوں جہاں جانتے طریقے سے

مجھے بسانی پڑی اپنی ایک الگ دُنیا
مَیں لُطف اُٹھا نہ سکا پھُسپھُسے طریقے سے

لہو میں پھوٹ رہی پھُلجھڑی کے نقشے پر
نظر میں شام سویرے بجے طریقے سے

دھنسا ہُوا ہُوں کسی بے جواز دلدل میں
پھنسا ہُوا ہُوں کسی مخمصے طریقے سے

اُٹھا رہا ہُوں مزہ بھی لذیذ لفظوں کا
چبا رہا ہُوں اُنھیں مُرمُرے طریقے سے

ثواب کا مُجھے لالچ تو ہے بہت ، لیکن
مَیں نیک کام کروں گا بُرے طریقے سے

کبھی رُکا ہُوں جو اُس چشمہء محبت پر
تو اپنی پیاس بُجھائی گھڑے طریقے سے

کوئی تو کام بھی ہو سوچنے سمجھنے کا
مَیں بوجھ اُٹھا نہیں سکتا گدھے طریقے سے

کسی بھی شے کا نہیں اعتبار کچھ باقی
مَیں رہ رہا ہُوں یہاں وسوسے طریقے سے

اُسے بھی کوئی یہ کہہ دے کہ اس نواح میں اب
چلا پھرا نہ کرے یُوں کھُلے طریقے سے

جو بے طریقہ ہی سب کامیاب تر ہیں یہاں
تو مَیں ہی چلتا ہوں پھر کس لیے طریقے سے

پھر اُس کے بعد ہمیں اعتراض کیا ہو گا
اگر وہ کام ہمارا کرے طریقے سے

ہمیں کوئی بھی نہ بے شک اُٹھانے والا ہو
اُٹھیں گے خود ہی ، اگر ہم گرے طریقے سے

وہ بے طریقہ ہی سب مال کر گیا تقسیم
سوال کرتے رہے ہم اُسے طریقے سے

گزر تو جائے گا یہ وقت بے طریقہ ہی
کبھی کبھار ، مگر ، چاہیے طریقے سے

مَیں روشنی کے لیے اب کروں گا من مانی
جلا چکا ہُوں مَیں کافی دیے طریقے سے

ہمیں بھی اُس کی سمجھ آج تک نہیں آئی
جو بند کرتا ہے ، اور ، کھولتے طریقے سے

وہ سوئے سوئے سے رہتے ہیں ، اور ، ادھر ہم نے
گزار دی ہے یہاں رتجگے طریقے سے

اگر ہمارا طریقہ نہ کامیاب ہُوا
تو پھر کریں گے یہ کوشش ترے طریقے سے

ادب تو خوب روا رکھتا ہوں مگر ، اس کو
پکارتا ہوں ذرا سرپھرے طریقے سے

قیام کرتا ہوا ہوں کبھی تو سب سے الگ
کبھی ہوں اہلِ سفر میں گھرے طریقے سے

کچھ اب کی بار کمی تھی بہت وسائل کی
سو ، میں نے کام نکالا نرے طریقے سے

کسی نے بھی نہیں سنجیدگی کے ساتھ لیا
تمام کام کیا مسخرے طریقے سے

زیادہ زور لگایا تو ٹوٹ پھوٹ گیا
میں خود کو ایک طرف موڑتے طریقے سے

میں چپ ہوا تو بہت دیر گنبدِ دل میں
عجیب شور رہا گونجتے طریقے سے

میں اپنے آپ ہی مسمار ہو رہا ہوں اگر
مجھے گرائیں گے کیوں زلزلے طریقے سے

نہ روشنی نہ اندھیرا ہے میرے چاروں طرف
رکی ہوئی ہے فضا ملگجے طریقے سے

بھلا اب اس پہ توجہ بھی کوئی کیا دیتا
صدا لگائی ہے جس بے سُرے طریقے سے

جو اُڑ بھی سکتا ہے کچھ دیر میں کسی جانب
یہیں پہ ہے ابھی پر تولتے طریقے سے

مرے حریف پریشاں نہ ہوں کہ میرا شروع
ہوا بھی ہے تو یہاں خاتمے طریقے سے

میں گرتا پڑتا یہاں تک جو آن پہنچا ہوں
تو جست کر کے نہیں ، مرحلے طریقے سے

یہ راہِ راست ہے، اور، میرے کام کی نہیں کچھ
کہ میں ہوں ایک طرف کو ہٹے طریقے سے

کوئی سی بات سلیقے سے ہو اگر ممکن
کوئی بھی کام اگر کیجیے طریقے سے

نیا نہیں ہے بزرگوں کا خاص و عام چلن
وہی ہے کھانستے کھنکارتے طریقے سے

کوئی زیادہ اُمیدیں نہ باندھیے مجھ پر
میں زندہ ہوں تو کسی مرتے طریقے سے

میں فیصلہ تو کسی بات پر نہیں دیتا
کہ بات کرتا ہوں اک جائزے طریقے سے

یہیں رہوں کہ کہیں اور کوچ کر جاؤں
میں پوچھتا ہوں فقط مشورے طریقے سے

یہاں تو پوچھ بھی سکتے نہیں کہ ہم سب کو
وہ لے چلے ہیں کہاں ہانکتے طریقے سے

گھروں کی اُن پہ حفاظت بھی فرض ہے، یعنی
لٹے پٹے ہُوئے، اور، ادھ جلے طریقے سے

اب اس سے بڑھ کے اخوت کا اور کیا ہو ثبوت
گلے ملیں جو گلے کاٹتے طریقے سے

بہار آئی ہے، سڑکیں ہوئیں گلاب گلاب
بدن پڑے ہیں کٹے اور پھٹے طریقے سے

سبھی کو ہے بھی، نہیں بھی ہے کچھ خبر اُن کو
ہُوا جو کرتے ہیں ظاہر چھپے طریقے سے

فلک نہیں ہے کوئی نیلگوں وہ پہلا سا
زمیں کا رنگ نہیں بھوسلے طریقے سے

وہ اُڑ کے جائیں تو اب جائیں بھی کہاں آخر
جو رہ رہے ہیں یہاں گھونسلے طریقے سے

مری نگاہ میں ہے ساری واردات ہوا
مَیں سو رہا ہوں، مگر، جاگتے طریقے سے

مُلاحظہ ہوں یہ تک بندیاں ہماری، ظفر
غزل چلائی ہے پھر قافیے طریقے سے

☆

جب بیچ پڑا ناکامی سے
واقف ہوئے اپنی خامی سے

جو وقتی رہا علاج اپنا
سب ٹیکے تھے ہنگامی سے

سب نشہ عشق ہوا غائب
اُس شوخ کی تُرش کلامی سے

جھگڑا ہر روز ہی رہتا ہے
کبھی مامے سے، کبھی مامی سے

اپنوں کے ساتھ وہ کیسا ہے
پُوچھو کسی اُس کے حامی سے

کرتے رہے تنگ شریفوں کو
پُوچھا نہیں کبھی حرامی سے

لفظوں سے بغاوت کر دی ہے
جب تنگ پڑا ہوں غلامی سے

جاری بھی رکھا ہوں کام اپنا
ڈرتا بھی رہا بدنامی سے

تبدیل کیا ہے خُود ہی، ظفر
آرام کو بے آرامی سے

☆

لوٹ کر آنے لگا ہوں
یا کہیں جانے لگا ہوں

بات سمجھانے کی خاطر کوئی دن سے
بات اُلجھانے لگا ہوں

آگ سا دہکا ہوا ہوں چاروں جانب
ابر سا چھانے لگا ہوں

ظلم سہتے سہتے جب تنگ آ گیا تو
ظلم خود ڈھانے لگا ہوں

اُس کے بہکاوے سے بچ نکلا ہوں، اور، اب
اُس کو بہکانے لگا ہوں

کر رہا ہوں کاروبار شوق جب سے
کھونے اور پانے لگا ہوں

چھوڑ آتا تھا جسے گھر پر، اب اُس کو
ساتھ ہی لانے لگا ہوں

اجنبی یوں ہی رہے گا وہ ہمیشہ
جس کو پہچانے لگا ہوں

بھوک معنی کی، ظفر، لگتی ہے ایسی
لفظ ہی کھانے لگا ہوں

☆

رنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی
ٹھنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

عورت کی تلاش تھی مجھے تو
سنڈھی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

چادر کوئی دو سمیٹنے کو
بنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

انڈا مجھے چاہیے بطخ کا
انڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

دُم بھی مجھے بھینس کی ہے درکار
لنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

پورا مجھے تول دیجیے گا
ڈنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

گاڑی ہے فقط مری ضرورت
جھنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

مطلوب مجھے نہیں ہے جھگڑا
بھنڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

کافی ہے، ظفر، پھڑی لگانا
منڈی نہیں چاہتا ہوں، بھائی

☆

بھلے ہی اتنا وہ بھولا ہے اور بھاونا ہے
ہمارا عشق زیادہ ہی کچھ گھناونا ہے

ابھی تو محوِ تماشا ہے دُور سے ہی وہ شوخ
ابھی تو اُس نے ہماری مدد کو آونا ہے

تمھاری بات اگر ہم نے ہی بڑھاونی تھی
تمھارا بوجھ اگر ہم نے ہی اُٹھاونا ہے

جہاں سے اُس کے گزرنے کا احتمال نہیں
سو، ہم نے خود کو اُسی راہ پر بچھاونا ہے

ہمارا عشق بھی خالص کہاں رہا ہے، سو، اب
خیال و خواب میں کچھ اور بھی ملاونا ہے

نہ کوئی شکل ہے جس کی نہ شائبہ ہے کہیں
یہ اپنی ضد ہے کہ اُس کا پتا لگاونا ہے

یہ شاعری بھی عجب راز ہے کہ دُنیا سے
کبھی چھپاونا ہے اور کبھی بتاونا ہے

ہم اس لیے ہیں کہ دیوارِ شعر سے کوئی رنگ
کہیں اُتارنا ہے اور کہیں جماونا ہے

رواں ہیں اپنی طبیعت سے بھی زیادہ، ظفرؔ
کہیں سے آونا ہے اور کہیں کو جاونا ہے

☆

پیچھے پیچھے آتا ہوں
آنکھیں میچے آتا ہوں

اوپر آ نہیں سکتے آپ
میں ہی نیچے آتا ہوں

اُترا ہوں جو سواری سے
چڑھ کر میچے آتا ہوں

چل نہیں سکتا اپنے آپ
خود کو کھینچے آتا ہوں

کہیں کھلے ہوتے ہیں پھول
جس باغیچے آتا ہوں

ڈرتا ہوں بے شرمی سے
ون پائینچے آتا ہوں

جاتا بھی ہوں ایسے ہی
اینچے بیچے آتا ہوں

ناک اپنی ہی توڑوں گا
مٹھی بھینچے آتا ہوں

جاؤں گا آگے بھی، ظفرؔ
ابھی تو اچھے آتا ہوں

☆

تقاضا ہو چکی ہے اور تمنا ہو رہا ہے
کہ سیدھا چاہتا ہوں اور اُلٹا ہو رہا ہے

یہ تصویریں صداؤں میں ڈھلی جاتی ہیں کیوں کر
کہ آنکھیں بند ہیں لیکن تماشا ہو رہا ہے

کہیں ڈھلتی ہے شام اور پھوٹتی ہے روشنی سی
کہیں پو پھٹ رہی ہے اور اندھیرا ہو رہا ہے

پسِ موجِ ہوا بارش کا بستر سا بچھانے
سرِ بامِ نوا بادل کا ٹکڑا ہو رہا ہے

جسے دروازہ کہتے تھے وُہی دیوار نکلی
جسے ہم دل سمجھتے تھے وُہ دُنیا ہو رہا ہے

قدم رکھے ہیں اس پایاب میں ہم نے تو جب سے
یہ دریا اور گہرا اور گہرا ہو رہا ہے

خرابی ہو رہی ہے تو فقط مجھ میں ہی ساری
مرے چاروں طرف تو خُوب اچھا ہو رہا ہے

کہاں تک ہو سکا کارِ محبت ، کیا بتائیں
تمھارے سامنے ہے کام جتنا ہو رہا ہے

گزرتے جا رہے تھے ہم ظفر لمحہ بہ لمحہ
سمجھتے تھے کہ اب اپنا گزارہ ہو رہا ہے

☆

میں جو کچھ شور و غوغا کر رہا ہوں
یہ مت سمجھیں کہ تنہا کر رہا ہوں

جو اُلٹا تھا بہت پہلے ہی اتنا
میں اُس کو اور اُلٹا کر رہا ہوں

زیادہ بھی کروں گا جلد ہی میں
ابھی کچھ تھوڑا تھوڑا کر رہا ہوں

نہیں کہتا ہوں اچھا خود بھی اس کو
سمجھتا ہوں کہ اچھا کر رہا ہوں

نصیحت ہے جو کم کرنے کی مجھ کو
میں پہلے سے بھی دُگنا کر رہا ہوں

زیادہ فکر کیا میرے کیے پر
یہی کچھ ایسا ویسا کر رہا ہوں

کسی نے مجھ کو روکا ہی نہیں ہے
کہ اتنی دیر سے کیا کر رہا ہوں

کبھی کرتا ہوں اُس کا خیر مقدم
کبھی میں خُود کو چلتا کر رہا ہوں

ہمارۂ ساتھ ہوں بے شک ظفر میں
مگر یہ کام کیسا کر رہا ہوں

☆

طبیعت رُک گئی ہے پھر رواں ہونے کی خاطر
یہاں سے جا چکا ہوں میں وہاں ہونے کی خاطر

بڑی مشکل سے پیدا کر سکا ہوں یہ سہولت
بہت خرچہ کیا ہے رائیگاں ہونے کی خاطر

کسی کو داستاں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے
سبھی جھگڑے ہیں زیبِ داستاں ہونے کی خاطر

سفر پیچھے کی جانب ہے، قدم آگے ہے میرا
میں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں جواں ہونے کی خاطر

مجھے معلوم ہے انجام اپنا بھی کہ آخر
دھنک سا ہونے والا ہوں دھواں ہونے کی خاطر

وہاں میری ضرورت ہی نہیں ہرگز کسی کو
بہت بے چین پھرتا ہوں جہاں ہونے کی خاطر

مجھے اس کارواں سے اور کیا درکار ہو گا
کہ شامل ہوں غبارِ کارواں ہونے کی خاطر

مجھے خود بھی نہیں معلوم کب سے پھر رہا ہوں
زمیں پر مارا مارا آسماں ہونے کی خاطر

ظفر، وہ اس زباں دانی کا مطلب جو بھی سمجھیں
تگ و دو ہے یہ ساری بے زباں ہونے کی خاطر

-☆-

کوچۂ خواب میں جاتا ہُوا ہو سکتا ہوں
یہی الزام اُٹھاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

مجھے جاتا ہُوا سمجھے ہیں اگر دور سے آپ
اسی رفتار سے آتا ہُوا ہو سکتا ہوں

میں بتاتا ہُوا ہوتا ہوں یہاں پر ہر بات
کچھ نہ کچھ پھر بھی چھپاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

ایک پردہ سا گراتا ہوں، مگر ساتھ ہی ساتھ
کوئی منظر بھی دکھاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

پھر کسی چیز سے باہر نکل آتا ہوں میں
اور کسی شے میں سماتا ہُوا ہو سکتا ہوں

فرق باقی ہی نہیں ہے کوئی دونوں میں اگر
کبھی روتا کبھی گاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

دشت ہوں، چاروں طرف پھیلا ہُوا ہوں اپنے
جس کی میں خاک اُڑاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

کچھ نہیں اور تو اس باغِ سخن میں کہیں میں
گُلِ امکاں سا کھلاتا ہُوا ہو سکتا ہوں

نظر آتا ہوں بظاہر جو میں گمراہ، ظفر
راستہ کوئی بناتا ہُوا ہو سکتا ہوں

-☆-

گزرتی رات جس دوران رُک جاتی ہے ڈھل کر
درخت اک دُوسرے کے پاس آ جاتے ہیں چل کر

بس اک لمحے کو لرزش سی بدن کو چھو گئی ، اور
ہوائیں میرے سر میں سو گئیں کروٹ بدل کر

بہُت کچھ میری تہ میں اور رہ جاتا ہے پھر بھی
بہُت کچھ باہر آ جاتا بھی ہوں ورنہ اُچھل کر

عجب دُشمن تھا ، اُس نے آگ ہی ایسی دکھائی
یہ گھر پہلے سے بھی کِتنا چمک اُٹھا ہے جل کر

جو کڑھتا ہوں تو یُوں سمجھو کہ اک ہانڈی کی صُورت
مَیں اپنے ہی کِناروں کو جلاتا ہوں اُبل کر

زیادہ چوٹ مُجھ کو اس لیے آتی نہیں ہے
کہ مَیں ہر بار گرتا ہوں تو گرتا ہوں سنبھل کر

ہمیشہ کی ہے اپنی فتح کی پیشین گوئی
ہمیشہ رہ گیا ہوں مَیں کفِ افسوس مل کر

مَیں جیسا ہوں سو ایسا بھی نہیں رہنا ہے مُجھ کو
ابھی کُچھ اور ہونا ہے کسی سانچے میں ڈھل کر

ظفرؔ ، مَیں شعر کا ایسا شکاری ہوں کہ ہر بار
نکل جاتی ہے مچھلی میرے ہاتھوں سے پھسل کر

-☆-

وہ بجارہ وار سا شام ڈھلتے ہی بے تکان بچھا ہُوا
کہ ہو جس طرح سے زمین پر کوئی آسمان بچھا ہُوا

کہیں سلوٹیں سی پڑی ہُوئیں، کہیں آہٹیں سی جڑی ہُوئیں
وُہی چار سمت بچھے نہ ہونے کے درمیان بچھا ہُوا

وہ جو ریت کا کوئی رُوپ تھا، وہ جو دُھوپ کی کوئی دھار تھی
اُسی دشت میں تھا کہیں وہ سبزۂ مہربان بچھا ہُوا

جسے مَیں نے سر سے جھٹک دیا تھا روانہ ہونے سے پیشتر
مرے راستے میں ہے دُور تک وُہی ایک دھیان بچھا ہُوا

یہ جو وہم ہے مرے رُوبرُو کو سمیٹنے نہیں دے رہا
مرے اندرون کے خاک و خشت پہ سو گمان بچھا ہُوا

وہ لہُو کی لہر سی روکتی ہُوئی تیز و تُند ہواؤں کو
وہیں زیر و بم کے نواح میں کہیں بادبان بچھا ہُوا

جسے اوڑھنے سے مُکر رہا تھا مَیں خاص و عام کے سامنے
اُسی لمحے میری نشست پر تھا مرا بیان بچھا ہُوا

اِسی شور و شعر کے آس پاس اگر سُراغ لگایئے
تو کہیں پہ زیرِ قدم بھی ہے کوئی بے زُبان بچھا ہُوا

مَیں خُود اپنی خلوتِ خستگی میں ظفرؔ وہ بسترِ خواب ہُوں
کہ جو لمحہ لمحہ لپیٹنے میں بھی ہے ہر آن بچھا ہُوا

-☆-

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صُورت خرابی کی

ظفر اقبال کے بارے لکھتے ہُوئے میرے خیال میں دو باتیں تو پہلے ہی سے طے ہیں: پہلی یہ کہ وہ غزل کا بڑا شاعر ہے اور دُوسری یہ کہ اُس کا غزل میں "لسانی شکست و ریخت" کا تجربہ ایک متنازع ترین تجربہ ہے۔ ادب میں کسی بھی تجربے کی قبولیت کی کامیابی سے پہلے کامیابی کی ایک اور سطح بھی ہوتی ہے جو کہ اس کا متنازع بن جانا ہوتا ہے، اور ظفر اقبال کا تجربہ کم از کم یہ پہلی کامیابی تو حاصل کر ہی چکا ہے۔ اور یہ کامیابی بذاتِ خُود بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں۔ جہاں تک میری اپنی ناقص رائے کا تعلّق ہے تو وہ بس یہیں تک ظفر اقبال کے حق میں ہے۔ لیکن میرے اختلاف کے باوُجود ظفر اقبال کے پاس اور بھی بہت سارے Plus Points موجُود ہیں۔ میرے خیال کے مُطابق لسانی تشکیلات کی تحریک چلانے والوں میں سوائے ظفر اقبال کے تقریباً سبھی لوگ غیر شاعر قسم کے لوگ تھے، جو اُردو شاعری میں کوئی مُنفرد اور بڑا معرکہ سرانجام دینے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے آئے تھے، اور کچھ دیر کے لیے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں تو کامیاب ہو گئے، لیکن بات لسانی تشکیلات تک ہی محدود رہی اور شاعری تک نہ پہنچ سکی۔ جب کہ ظفر اقبال نے پہلے اپنے آپ کو نہ صرف شاعر بلکہ ایک مضبُوط شاعر منوایا اور پھر 'گلافتاب' کا دھماکا کر ڈالا۔ بلاشبہ وہ ایک دھماکا ہی تھا، جس نے اُس کے قارئین سے لے کر ناقدین تک کو نہ صرف چونکا کے رکھ دیا، بلکہ ہلا کے بھی رکھ دیا۔ اور لوگ حیران و پریشان ہو کے رہ گئے کہ شاعری کے ساتھ اور خصُوصاً غزل کے ساتھ یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، اور وہ بھی پُورے اعتبار اور سنجیدگی کے ساتھ۔ اور لسانی تشکیلات والوں کے ساتھ تو سیدھا سیدھا ہاتھ ہو گیا کہ بے چارے مُنہ دیکھتے رہ گئے، اور ظفر اقبال سارا میلا لُوٹ کر چلتا بنا، اور سب نے دیکھا کہ 'گلافتاب' کے بعد لسانی تشکیلات کے بانی اور پیروکار وغیرہ منظر سے کچھ دُور دُور سے لگنے لگے۔ کیوں کہ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر ظفر اقبال کے بجائے خُود اُن جیسا کوئی بے تاثیر شاعر یہ تجربہ کرتا تو خُود بھی مذاق کا نشانہ بنتا اور ساتھ اپنی لسانی تشکیلات کی پُوری تحریک کی بھی تضحیک کا باعث ہوتا۔ لیکن اب معاملہ ذرا مختلف ہو گیا ہے اور 'گلافتاب' سے مُتعلق عموماً دو قسم کی آرا سُننے کو ملتی ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ظفر اقبال نے ایسا کر کے اپنا امیج خراب کرنے کے ساتھ ساتھ زبان اور شاعری کو بھی خراب کیا ہے، اور کچھ کہتے ہیں کہ ظفر اقبال نے اُردو شاعری اور خصُوصاً غزل پر جمی ہُوئی برف توڑی ہے اور سال ہا سال سے بنائے ہُوئے نام نہاد اور جامد روّیوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غزل اور اُس کی زبان کی توڑ پھوڑ دراصل صرف غزل اور زبان ہی کی توڑ پھوڑ نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ہمارے کلاسیکی روّیوں، احساسات اور ضابطوں کی توڑ پھوڑ ہے اور ایسی توڑ پھوڑ نئی تعمیر کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن میری رائے ان دونوں آرا سے مختلف ہے۔ اور اس سے پہلے کہ مَیں ظفر اقبال کے اس تجربے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں، بہتر ہو گا کہ پہلے یہ بتا دُوں کہ کسی بھی تخلیقی شعبہ میں اور خصُوصاً ادب میں تجربہ سے مُتعلق میرا اپنا نقطہ نظر کیا ہے۔

میرے نزدیک کسی بھی شعری تخلیق کا تعلّق وجدان سے ہوتا ہے۔ تخلیق اپنے عدم سے وجدان ہی کے راستے سے ظاہر ہوتی ہے، جس کے بعد اُس کی ترتیب اور تزئین کر لی جاتی ہے۔ یہ تخلیق رُوحانی اور نفسیاتی ہر دو نظاموں کے باہمی تاثّل سے ظہور پذیر ہوتی ہے، جس کے لیے احساس اور جذبے کا میسج ناگزیر ہوتا ہے، یعنی شعری تخلیق میں احساس اور جذبہ اپنے اظہار پانے کی انگیخت کے باعث ہمارے اندر راستے بناتا بالآخر ظاہر ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات احساس اور جذبے کا یہ مواد پہلے سے رائج اور موجُود کسی شکل میں یا تقریباً ملتی جلتی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اور بعض اوقات کسی بالکل ہی مختلف صُورت میں وقُوع پذیر ہوتا ہے جو پہلے سے موجُود تمام صُورتوں سے بہت ہی ہٹ کے اور مُنفرد ہوتی ہے۔ مَیں اُسی صُورت، شکل یا طرز کو شعری تجربہ سمجھتا ہُوں، لیکن یہاں آ کے پھر ہمیں تھوڑا سا اور آگے چلنا ہو گا۔ ایک بڑا تخلیق کار اپنے بھرپُور تخلیقی جوہر اور جدّت کے ساتھ ساتھ مُسلسل شعری ریاضت سے عموماً ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اُس کی تخلیق مکمل طور پر وجدانی ہونے کے باوُجود کہیں نہ کہیں اُس کے شعُور کی مرہُونِ منّت بھی ہو جاتی ہے، اور اُس کی خواہش کے مُطابق اُس کے وجدان سے باہر آتی ہے یا پھر دُوسری صُورت میں تخلیق کا یہ عمل اُس کی لاشعوری سطح پر جاری و ساری رہتا ہے اور لاشعوری کے عالم ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔

تجربے کی ایک تیسری اور نسبتاً کم تر درجے کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ پہلے سے نہایت سوچ بچار کر کے اور منصوبہ بندی کر کے کوئی نیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

عہدِ حاضر میں ہمارے ہاں تجربہ تو کیا خود تخلیق ہی کی سطح پر یہی کاریگری اور ہنرمندی جاری ہے۔ جس کے باعث شعر اور تجربہ دونوں نہایت مکینیکل ہو چکے ہیں۔ اس طرح کی شاعری کی تو خیر لاتعداد مثالیں موجود ہیں، البتہ تجربے کے ضمن میں چند ایک ہی مثالیں ملتی ہیں، جن میں لسانی تشکیلات والوں کے علاوہ طویل نثری نظموں کو بھی کوٹ کیا جا سکتا ہے۔

اب اگر غور کیا جائے تو ظفر اقبال کا تجربہ نہ غیر ارادی طور پر اُس سے سرزد ہُوا نظر آتا ہے اور نہ ہی یہ فقط منصوبہ بندی ہی کے زُمرے میں آتا ہے۔ بلکہ یہ بیک وقت تخلیقی دباؤ اور اظہار میں رُکاوٹ کے ردِعمل میں شعوری سطح پر اختیار کیے گئے، بلکہ کسی حد تک اختراع کیے گئے ایک نئے راستے کی شکل میں آیا ہے۔ اور اجتماعی سطح پر ایک نہایت معروضی تجربہ ہونے کے باوجود انفرادی سطح پر انتہائی داخلی اور موضوعی حیثیت کا حامل ہے۔ اپنی اس بات کی وضاحت میں کچھ اس طرح سے کروں گا کہ ظفر اقبال نے قدرے روایتی غزل میں جو کچھ کہنا تھا، وہ 'گلافتاب' سے پہلے کہہ لیا، یا تنگنائے غزل ظفر اقبال کے تخلیقی وفور کو جتنا سمیٹ سکتی تھی اُس نے سمیٹ لیا، لیکن ابھی ظفر اقبال کے پاس کہنے کو اور بہت کچھ تھا، یا کم از کم ابھی اور شعر کہنے کی شدید خواہش تو ضرور موجود تھی، یعنی اگر وہ وقتی طور پر اکثر فنکاروں کی طرح تخلیقی جمود کا شکار ہُوا تھا تو یہ جمود اُس کی شعر کہنے کی خواہش پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اور مَیں تو اس جمود کا آدھا الزام غزل پر دھروں گا کہ اس میں آپ کب تک اور کہاں تک کیا کیا کچھ کہہ سکتے ہیں، اور پھر غزل کے اندر نظم کی نسبت لچک بھی بہت کم ہے، بلکہ بہت ہی کم ہے، اور اس کا اپنا ایک مزاج ہے، اور یہ کسی بڑے تخلیق کار کے مزاج کے تھوڑا بہت مطابق چل کے اُسے بہت کچھ اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے، اور اگر کوئی اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی برتنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ خود بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور اپنے ساتھ تخلیق کار کو بھی توڑ پھوڑ دیتی ہے، اور باقی آدھا الزام خود ظفر اقبال کے سر ڈالوں گا کہ کتنے غزل کہنے والوں پر جمود یا تنگیِ اظہار کے احساس کا ایسا وقت آتا ہے، جب وہ نظم، آزاد نظم یا نثری نظم وغیرہ کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ ظفر اقبال نے جو تجربہ کیا، میرے خیال کے مطابق اُس میں سب سے زیادہ خود اپنے تخلیقی جمود کو توڑنے کا

مقصد کارفرما تھا۔ بلاشبہ ظفر اقبال غزل کا ایک ایسا جینئس ہے جو غزل کے معاملے میں Rigid ہونے کے باوجود غزل سے شکست کھانے پر تیار نہیں۔ یقیناً شاعری ظفر اقبال کی زندگی کی سب سے اہم Commitment ہے، اور وہ کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی شرط پر اس سے دستبردار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا اُس نے اپنے Creative Self سمیت غزل اور اُس کا ظاہر و باطن سب کچھ توڑ پھوڑ ڈالا۔ اور یہ اتنا بولڈ Step تھا کہ اسے اُردو شاعری کی تاریخ میں صرف ظفر اقبال ہی نے لیا۔ جنسی معاملات پر یا مُروّج شعری ضابطہ اخلاق سے ہٹی ہُوئی شاعری یا اُردو زبان میں عام بول چال کے الفاظ کا استعمال یا پنجابی وغیرہ کی ملاوٹ اب سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے کی ہے، اور اب تک کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی شاید مجموعی طور پر کہ کسی نے جنسی شاعری کی اور دوستوں تک محدود رکھی، کسی نے روزمرہ زندگی کے مضحکہ خیز رویّوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کر دیا یا کسی نے زبان کی شکست و ریخت کر ڈالی، لیکن ظفر اقبال واحد ایسا شاعر تھا، جس نے یہ تمام باتیں بیک وقت اور پھر تمام تر سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ کیں، اور انھیں Own بھی کیا، اور قائم ہو گیا۔ اب یہ سب کچھ ایک طرف بالکل معروضی اور خارجی نوعیت کا ہے، اور وہ بھی خاص طور پر اجتماعی سطح پر کہ اس میں معاملاتِ جذبہ و احساس کم اور نئے سے نئے مضمون کی تلاش اور نئے سے نئے اور انوکھے سے انوکھے پیراہن کی دریافت کی شعوری کوشش صاف نظر آتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہ تجربہ اکثریت کی ذات کا حصہ نہیں بن سکتا، یا ہر آدمی اسے شیئر نہیں کر سکتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ خود ظفر اقبال کی انفرادی سطح پر اس تجربے کا نفسیاتی پہلو یکسر داخلی اور موضوعی حیثیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ ظفر اقبال یہ سب کچھ کرنے پر اپنے Creative Self کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اُس کے اندر کی خاموشی کا اضطراب اور غزل کی سرد مہری کی تپش اُسے ہلکان کیے دے رہے تھے۔ اب یا تو وہ غزل سے بے وفائی کر کے کسی دوسری صنف پر ڈورے ڈالتا، اور اُس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا، لیکن اُس نے غزل ہی کو زیر و زبر کرنے کی ٹھانی اور بالآخر نہ صرف اپنا جمود توڑنے میں کامیاب ہو گیا، بلکہ اُردو غزل کے ایک تنازعے کا بانی بھی بن بیٹھا۔ لیکن اُس کی ان کامیابیوں کی ادبی Evaluation کر کے یہ بھی دیکھنا بہت ضروری ہے کہ ظفر اقبال اور اُس کا تجربہ کہاں سٹینڈ کر رہا ہے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ ادب میں کوئی بھی ایک رائے حتمی یا حرفِ آخر ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہر شخص کوئی بھی رائے

رکھنے یا دینے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ ظفر اقبال کے شعری تجربے کی ادبی حیثیت دیکھنے سے پہلے ہمیں تھوڑا سا یہ ضرور دیکھنا پڑے گا کہ احساس، جذبہ، کیفیت، خیال، نظریہ، زبان اور کرافٹ وغیرہ کا شعر کے حُسن میں کتنا کتنا حصّہ ہوتا ہے، کتنا کتنا حصّہ ہونا چاہیے، یا اسے ایک اور پہلو سے بھی دیکھتے ہیں کہ ایک وہ شاعری ہوتی ہے جو اوراق سے آتی ہے اور کچھ دیر اوراق پر ہی زندہ رہتی ہے اور دلوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتی ہے، اور ایک وہ شاعری ہوتی ہے جو اوراق پر بھی زندہ رہتی ہے اور دلوں میں بھی زندہ رہتی ہے۔ لیکن ایک شاعری وہ بھی ہوتی ہے جو دلوں کو بھی زندہ رکھتی ہے اور اوراق کو بھی، اور یہی شاعری بڑی اور عظیم شاعری ہوتی ہے، اور Time & Space سے ماورا بھی۔ اب میں ظفر اقبال کی زیرِ نظر کتاب سے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ کون سا نمونہ درج بالا شاعری کی کس تعریف پر پُورا اترتا ہے۔

گوشت کو بھون کر پکانا کیا
آپ اسے سوڑ کیوں نہیں سکتے

☆

ہائے ہائے ہُوا مطلب
اوئے اوئے ہُوئے الفاظ

☆

مُلاحظہ ہوں یہ تُک بندیاں ہماری ظفر
غزل چلائی ہے پھر قافیے طریقے سے

☆

چھوڑا حلوہ پُوڑی میں نے
ڈالی نئی بھسوڑی میں نے
اور اُس کے آگے لا رکھا
سب کچھ تلہ تُوڑی میں نے
جب اُس نے سوفہ لگوایا
ساتھ بچھائی پھوہڑی میں نے

ابھی اُلٹے کو سیدھا کر رہا تھا
ابھی سیدھے کو اُلٹا کر رہا ہُوں

☆

کہیں چھاگتے ہُوئے امرود ہیں اور
کہیں کاٹی ہُوئی بیری پڑی ہے
بہُت مُدّت سے جو امرتسری تھی
کئی دن سے وہ اجمیری پڑی ہے

☆

مسکی ہے غزل کی چولی بھی
الفاظ کی کھینچا تانی میں

☆

شاعری اور طرح کی اسے کہتے ہو ظفر
مَیں پریشاں ہُوں کہ یہ شاعری ہے بھی کہ نہیں

☆

اور اب زیرِ نظر کتاب ہی سے کچھ اس طرح کے نمونے بھی مُلاحظہ کیجیے:

کیا ریت کا اک بھنول سا کھل اُٹھتا ہے دل میں
جب موج ہوا آتی ہے صحرا کی طرف سے
دُشوار گزاری مجھے منظور ہے، لیکن
جاتا نہیں مَیں نقشِ کفِ پا کی طرف سے

☆

بیٹھے بیٹھے کھو گیا
عجب تماشا ہو گیا
پڑے کو آ کر ظفر
اپنا رونا رو گیا

☆

کوئی بارش نہیں برسی کب سے
سوکھتی جاتی ہے کھیتی دُنیا
کیسے برداشت کرے تجھ کو بھی
کچھ تمھاری یہ چہیتی دُنیا

☆

محبت بھی وُہی ہے اور موسم بھی وُہی لیکن
ہمارا اور ہو جانا ، تمھارا اور ہو جانا
بتاتے ہی بتاتے راز رکھ لینا کوئی دل میں
چھپاتے ہی چھپاتے آشکارا اور ہو جانا
ظفرؔ وہ یک بیک پانی کی رنگت ہی بدل جانی
سفینے اور ہو جانے ، کنارہ اور ہو جانا

☆

جب لحۂ شام بکھیر دیا
وہیں اک پیغام بکھیر دیا
اُوپر خاموشی تان رکھی
نیچے کہرام بکھیر دیا

☆

نہ ہمارے نہ تمھارے جھلمل
کب کریں گے یہ کنارے جھلمل
بجھ گئے خاک تک آتے آتے
آسمانوں سے اُتارے جھلمل
کچھ سجھائی نہیں دیتا اب تو
کیا ہوئے سارے کے سارے جھلمل
روز و شب گرد اُڑا کرتی ہے
کیا کوئی نقش نکھارے جھلمل

دھند میں راہ دکھانے کے لیے
انگلیوں کے وہ اشارے جھلمل
چار سُو پھیلا ہوا خواب دھواں
وسط میں چند شرارے جھلمل
کر گئے اور بھی تاریک یہ عمر
چند لمحے جو گزارے جھلمل

میں نہیں سمجھتا کہ قاری کو ان دو مختلف مزاج کے شعری نمونوں کی درجہ بندی میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش آ سکتی ہے۔ لیکن ظفر اقبال کے اس تمام تخلیقی عمل اور تخلیقی عوامل کے تحرک سے اب جو نئی صورتِ حال سامنے آئی ہے، نہایت اہمیت کی حامل ہے، اور اس میں سب سے زیادہ ظفر اقبال کی اپنی تخلیقی زندگی کے حوالے سے، اور اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے Self Awareness اور پھر اس خود آگہی کے بعد خود احتسابی کا عمل ہے، جس نے ظفر اقبال کو اُس کے تجربے کے اُلجھاؤ سے نکال کے صاف راستے پر ڈال دیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ صاف راستہ بلکہ صاف اور الگ تھلگ اور نیا راستہ اسی تجربے کی دین ہو سکتا ہے۔ ظفر اقبال کو 'گلافتاب' کے تجربے کے دوران یہ علم ہو نہ ہو کہ آیندہ اُس نے اس تجربے کو آگے بڑھانے کے لیے یا اس پُرپیچ اور خاردار جنگل سے نکلنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اُسے کم از کم یہ ضرور علم تھا، بلکہ شاید اُس کے اپنے تئیں طے تھا کہ اُس نے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لینا ہے۔

ظفر اقبال کی زیرِ نظر کتاب اُس کی تازہ ترین کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کے تجربے کی Extention بھی ہے، اور یہ کتاب اس لحاظ سے بہُت اہم ہے کہ اس میں ظفر اقبال بہُت واضح اور صاف ستھرے انداز میں اپنے تخلیقی جوہر کو لسانی شکست و ریخت کے تجربے کی نوکیلی لگام ڈال کے ایک نئے راستے پر لے آنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور یہاں تک آتے آتے ایک اور عجیب و غریب بات یہ ہُوئی ہے اور جسے یقیناً ناقدین کو بڑی توجّہ اور غور و فکر سے دیکھنا پڑے گا کہ ظفر اقبال اپنے تمام لسانی تشکیلاتی سفر میں دراصل معنوی تشکیلات کا سفر طے کرتا آیا ہے۔ نام نہاد اخلاقی ضابطے اور خواہ مخواہ کی پابندیوں کو ایک شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں توڑ پھوڑ کر اُس نے تقریباً ہر وہ بات غزل میں کر کے دکھا دی ہے،

جسے نامناسب اور نامعقول سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ظفر اقبال نے جس طرح اُس تمام نامعقولیت میں سے خالص معقولیت کو دریافت کیا ہے یا پیدا کیا ہے، اُس نے ہماری اُردو غزل کو ایک اور اگلی منزل پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، اور اب وہ اپنے پہلے مقام سے ایک منزل اور بلند مقام پر کھڑی نظر آتی ہے ظفر اقبال کے نہایت پُرسوز خیالات اور مادر پدر آزاد شعری روش کے ملاپ سے غزل کا جو ایک نیا رُوپ سامنے آ رہا ہے، اُس کی چند مثالیں مُلاحظہ کیجیے:

ادھر اُدھر محض رائگاں ہے تلاش میری
کہ مَیں کئی دن سے اپنے اندر نکل رہا ہوں

☆

اپنی ہی راہ چل کر پہنچا ہوں، گرتا پڑتا
مَیں آ نہیں سکا ہوں اکثر کے راستے سے

☆

گودا عشق ہمارے کو
پروا نہیں تمھارے کو
آیا کرو ہمارے پاس
سمجھا کرو اشارے کو

☆

کھینچ کر پھر مجھے نیچے لے جائے
اُبھر آتا ہوں بھنور سے اتنا

☆

جو لپیٹا نہیں اُسی کو لپیٹ
موت سے پہلے زندگی کو لپیٹ
یہی خواب ہوس، دری کی طرح
کبھی دیتا ہے آدمی کو لپیٹ

☆

قاعدہ توڑ کیوں نہیں سکتے
فالتو چھوڑ کیوں نہیں سکتے
یہ سفر میں اگر رکاوٹ ہیں
آبلے پھوڑ کیوں نہیں سکتے

☆

اک وصل وادیوں کی طرح پھیلتا گیا
اک خواب سا کھلا ہوا اندر کے سامنے
ایسے ہی تو یہ بھیڑ نہیں لگ رہی یہاں
ہو گا ضرور کچھ پسِ منظر کے سامنے

☆

شبہ سا رہتا ہے، یہ زندگی ہے بھی کہ نہیں
کوئی تھا بھی کہ نہیں تھا، کوئی ہے بھی کہ نہیں
رنگ سا پھیلتا جاتا وہ ہوا کا ہر سمت
وہم سا پھر بھی ہے یہ تھرتھری ہے بھی کہ نہیں
یہ اندھیرا ہی غنیمت ہے کہ یہ ہے تو سہی
روشنی ڈھونڈتے ہو روشنی ہے بھی کہ نہیں
دل نے خود پہلی محبت کو سبوتاژ کیا
دُوسری کے لیے، اور دُوسری ہے بھی کہ نہیں
اہلِ دُنیا مجھے زنجیر تو کرتے ہیں، مگر
کیا خبر سر میں وہ دیوانگی ہے بھی کہ نہیں

ان تمام اشعار میں جو ایک منفرد اور بے باکانہ طرزِ اظہار موجود ہے اور جو بے ساختگی نظر آتی ہے، یہ سب اُس کی تخریب کا تعمیری رُخ ہے کہ اس میں ظفر اقبال نے اپنے جامد و ساکت ظفر اقبال کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا ظفر اقبال تعمیر کیا ہے۔ میرے نزدیک اس نئے ظفر اقبال کے خدوخال اور حُسن اب بھی اُتنا واضح نہیں ہے، جتنا کہ آنے والے زمانے میں ہونے والا ہے۔

فرحت عباس شاہ

میری ساری سعی سُخن نئی شعریات کی تلاش کا سفرنامہ ہے۔ منزل پر پہنچنے کا دعویٰ اس لیے نہیں کرتا کہ یہ کبھی میرا مقصود ِنظر ہی نہیں رہا، یعنی:

ہمارے واسطے منزل مُعاملہ نہیں عشق
اگر یہ ہے بھی تو بس راستا مُعاملہ ہے

یُوں، سفرنامے کے مُسافر کی کوئی خاص منزل ہوتی بھی نہیں، اور، وہ سیر سپاٹا کر کے گھر واپس آ جاتا ہے۔ اسے روایت سے بغاوت بھی نہیں کہا جا سکتا، کیوں کہ زمین کے بغیر تو راستوں کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا، اور، روایت ہی وہ زمین ہے جس پر نئے پُرانے راستے بچھائے جاتے ہیں۔ البتہ روایت اور بداعت کے درمیان سے نئی شعری بوطیقا کو جاتا ہُوا کوئی راستہ نِکالا جا سکتا ہے، بشرطے کہ شاعر اس کی توفیق رکھتا ہو۔

مُنفرد نظر آنا یا چونکانا بھی میرا مسئلہ نہیں رہا، خاص طور پر 'آبِ رواں' کو جو پذیرائی حاصل ہُوئی، اُس کے بعد اس کی گنجایش اور ضرورت بھی نہیں تھی۔ انفرادیت میرے نزدیک ہمیشہ فن پارے ہی کو حاصل ہونی چاہیے، بلکہ مَیں خود تو جگہ جگہ اپنا انکار ہی کرتا چلا آیا ہُوں، اور اس طرح سے میری یہ شعوری کوشش رہی ہے کہ سامنے کے بجائے اپنے آپ کو فن پارے کے پس منظر میں ہی رکھوں، کیوں کہ بصُورتِ دیگر کوئی بھی شعر پارہ قارئین کی مُشترکہ میراث نہیں بن سکتا، جو کہ اسے لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ گویا:

جو مَیں کہتا ہُوں وہ سب کی ملکیت ہے، اور، مَیں
ایک جانب کہہ کے ہو جاتا ہُوں شرماتا ہُوا

زبان اور اس کے شعری استعمال کے بارے میں البتہ میرا نقطۂ نظر ذرا مختلف ہے، اور، مَیں سمجھتا ہُوں کہ یہ میرا استحقاق تھا، جسے مَیں بروئے کار لایا ہُوں۔ چناں چہ میری ان جُملہ کاوشوں کے گھال میل سے اگر نئی شعریات کی طرف پیش رفت کا کوئی سُراغ لگایا جا سکتا ہے، تو مَیں اپنے آپ کو سُرخرو سمجھوں گا۔ اور، اگر خواب و خیال کا یہ سلسلہ غلط تھا تو مَیں پھر بھی شرمندہ نہیں ہُوں، کیوں کہ غلط بات سوچنا، اس سے بہتر ہے کہ کچھ بھی نہ سوچا جائے۔

ظفر اقبال

اختر احسن کے نام

آ تُو بھی دیکھ تاب تماشا تجھے بھی تھی
بندر بندھا ہُوا ہے، مچھندر کھلا ہُوا
(کُھلا آفتاب)

نانِ جویں پہ نام ہمارا بھی تھا، مگر
تقسیم کے لیے کوئی بندر بٹھا دیا
(سرِعام)

بوزنہ کس لیے ہُوا وارد
تھے اگر بوزنے سے پہلے ہی
(انحراف)

گم ہونے لگے ہیں مرے اجداد کے آثار
ٹوٹا ہُوا رشتہ کوئی بندر سے نکالوں
(ترتیب)

دُم سی ایک نکل آتی ہے کبھی، ظفر
اور، یہ صورت بندر جیسی لگتی ہے
(تقویم)

مسخ کر لیا ہے اپنے آبا کی کشش نے
سو میں صد احترام بندروں میں آ رہا ہوں
(تماشا)

حوالے سے تو آبادیاتی استبداد کا استعارہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''منکی بزنس'' کی رعایت سے یہ اپنی جنس پرستی اور شہوانیت کے ضمن میں زیرِ سطح اُن مظالم کا استعارہ بھی بنتا ہے، جو حال ہی میں بوسنیا کے اندر سفید فام غیرمسلموں کی جانب سے مُسلم خواتین پر ڈھائے گئے ہیں۔ اسی طرح بیت المقدس پر اہلِ یہود کا تسلّط بھی اس استعارے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

بندر بانٹ کے حوالے سے یہ قسّامِ رزق کا استعارہ بھی بنتا ہے جو اُوپر بیٹھا ہُوا اور رزق تقسیم کرنے کے بہانے سب کُچھ خُود ہی ہڑپ کرتا چلا جا رہا ہے، اس طرح ایک اعتبار سے یہ جاگیردارانہ بالادستی کا بھی استعارہ بنتا ہے۔ پھر چُوں کہ اس کے سر پہ ہمیشہ تاج رہتا ہے، اس لیے یہ حاکمیت اور دھونس کا استعارہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ کاندھے پر گُرز رکھنے اور جنگل کا سردار ہونے کے ناتے یہ جنگل کے قانون یعنی مارشل لا، بلکہ اپنے خاکی وجود کی رعایت سے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا استعارہ بھی ہے (گستاخی مُعاف) پھر بندر چُوں کہ ایک مثالی نقّال بھی ہے، اس لیے یہ ہر عہد کے قینچی بردار شاعروں اور ادیبوں کا استعارہ بھی ہے، جو لہجے، ترکیبیں، مضامین بلکہ دُوسروں کے اشعار تک چُرا لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اُس ہنومان کا بھی استعارہ ہے، جو ہم سب کے باطن میں ظاہر و مستور اور موجود ہے۔

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے، ہنومان چُوں کہ بُنیادی طور پر بندر ہیں، اس لیے مَیں نے ہنومان اور ایک عام بندر کو ایک ہی وحدت شمار کیا ہے، اور اپنی سہولت کی خاطر دونوں کے خصائص کو خاصی حد تک گڈمڈ بھی کر دیا ہے۔ پنتاں چہ جہاں جہاں ہنومان جی سے بے تکلّفی وغیرہ کا اظہار کیا گیا ہے، وہ اُن کے بندر ہونے اور مختلف استعاراتی حوالوں سے ہے، لہٰذا ہنومان جی کی توہین یا اُن کے ماننے والوں کی دل آزاری ہرگز مقصود نہیں ہے، کیوں کہ خُود میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہنومان جی چُوں کہ حُسن پرست بھی مشہور ہیں، اس لیے بندروں کی جنسی صُورتِ حال بیان کرنے میں مجھے آسانی رہی ہے۔ بندر کے استعارے کو طرزِ جدید پر لانے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو لمحۂ موجود پر نافذ کرنے کی تخلیقی کوشش میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس ضمن میں اہلِ نظر ہی کی رائے صائب ہو سکتی ہے کہ مَیں تو اپنے بارے میں ہمیشہ شک شُبہے ہی میں مُبتلا رہتا ہوں۔

ظفر اقبال

دوسری اپریل، 1996ء

ہنومان جی اور ہم

ہنومان تھے تو بندر ہی لیکن ذرا پہنچے ہُوئے۔ اسطوریائی حوالے کے مُطابق اُن میں کُچھ مافوق البشر خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں، مثلاً وہ ہوا میں اُڑ سکتے تھے، بلکہ رامائن کے مُطابق وہ ایک ہی چھلانگ میں بھارت سے سری لنکا پہنچ گئے۔ طاقتور اتنے کہ ایک دفعہ جڑی بُوٹیاں لینے کے لیے گئے تو پہاڑ کا پہاڑ ہی اُٹھا لائے۔ ہنومان، جو بندروں کے سردار کہلاتے ہیں، پَون دیوتا کے بیٹے تھے، علم و فضل کے حساب سے وہ تمام سائنسوں اور قواعد پر عُبور رکھتے تھے اور جس وقت بھی چاہتے اپنی جُون تبدیل کر لینے پر قادر تھے، آپ رام چندر جی کے بن باس میں اُن کے بھگت تھے اور سیتا جی کو راون کی قید سے چھڑوا کر لائے۔ بندروں کی فوج کے ساتھ راون سے جنگ بھی کی اور فتح یاب ہُوئے۔

ہنومان بُنیادی طور پر بندر تھے، پنتاں چہ مَیں نے اس کردار کو مختلف استعاروں میں مُنتقل کرتے ہُوئے موجودہ عہد تک لانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اس کا پہلا استعارہ، ڈارون کی متنازع تھیوری کے مُطابق ہمارے آبا و اجداد کا بنتا ہے۔ اس کا دُوسرا استعارہ دیومالا کا ہے اور اُسی حوالے سے اُس کی محرومی کا بھی، کہ اگر انسان پہلے بندر ہی تھا، تو یہ ارتقا اب رُک کیوں گیا ہے اور اب بقایا بندروں کے انسان بننے میں کیا امر مانع ہے۔ اس کے علاوہ بندر ہوتے ہُوئے یہ آدھے انسان کا استعارہ بھی ہے، جب کہ ہمارے عہد تک پہنچنے والے اکثر آدمی بھی بجُود آدھے ہی انسان ہیں، یعنی انھیں پُورے انسان یا آدمی نہیں کہا جا سکتا۔

بندر ایک محنت کش کا بھی استعارہ بنتا ہے کہ وہ ڈگڈگی پر ناچ کر اپنی روزی بھی کماتا ہے اور مداری کی بھی۔ اپنی بھگتی اور سائنسی قواعد پر عُبور حاصل ہونے کی بدولت اس کا استعارہ ایک عالم اور فلسفی کا بھی ہے۔ لیکن اس کی یہ استعاراتی نمائندگی بعض منفی پہلو بھی رکھتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں حاکم انگریز کو بندر بھی کہا جاتا تھا، پنتاں چہ یہ سفید فام اقوام کے

تاج ہے سر پر ہنومان کے
عجز ہے اندر ہنومان کے

جلتا خاکی گوریلوں کی
ساتھ ہے اکثر ہنومان کے

آپ ہیں کس کے چاکر، صاحب!
ہم ہیں نوکر ہنومان کے

آپ بھی وہ جو کچھ ہو، لیکن
سارے بندر ہنومان کے

آدھا تو انسان بنے گا
بیٹھ برابر ہنومان کے

پات ہرے، شاخیں چکیلی
پیڑ تناور ہنومان کے

اس پر بس کیا چلے کسی کا
دُم ہے باہر ہنومان کے

آگے پھول ہیں دور دور تک
پیچھے پتھر ہنومان کے

ہنومان ہے سب سے اُوپر
کچھ نہیں اُوپر ہنومان کے

☆

دُم کی اپنی شان ہے
کیسی کسی کمان ہے

دُم سے لٹکے ہوئے کو
حاصل سارا گیان ہے

لہو سا رستا ہے کہیں
یا باچھوں میں پان ہے

ہنومان جی ہیں کہیں
جیسے کوئی گمان ہے

ڈنڈی، نیچے اور دُم
ہی ساز و سامان ہے

کرنا ہے مشکل بہت
کہہ دینا آسان ہے

آگے سے جو کچھ بھی ہو
پیچھے سے ہنومان ہے

انسانی حیوان، یا
حیوانی انسان ہے

بھاگتے بندر کو، ظفر
جنگل ہی میدان ہے

☆

بال ہوئے پوشاک
سب کے مُنہ میں خاک

کر کے کام پلید
ہنومان جی پاک

اور چاہیے کیا
بندر ہے بے باک

بیٹھ کے چوٹی پہ
کھیچے ٹیلی ناک

ایک بندریا سے
ہو گئے اشتراک

پیڑ سے نیچے آئیں
کرنی ہے کچھ واک

کانوں تک باچھیں
بے حد چپٹی ناک

بندریاؤں میں سے
اچھی سی کوئی تاک

رونگٹے کھڑے ہوئے
بیٹھی ہوئی ہے دھاک

☆

کاندھے پہ گرز جمائے ہو
ہنومان ! کہاں سے آئے ہو

آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی
اور ، باچھیں بھی پھیلائے ہو

یہ تاج بھی کافی بھاری ہے
کیوں اتنا بوجھ اٹھائے ہو

ظاہر میں تو یہی لگتا ہے
اللہ میاں کی گائے ہو

پھانسی ہے نئی بندریا بھی
پھر ناچے ہو اور گائے ہو

بھگتی کو سمایا ہے خود میں
یا خود بھگتی میں سمائے ہو

بھگتی کو کئی دن بیت گئے
کیا اس سے بڑا انیائے ہو

کوئی تو فضیلت ہے جس پہ
تم ہنومان کہلائے ہو

بندر ہو ، ظفر ، معمولی سے
اور ، سارے بن پہ چھائے ہو

☆

لگتے ایسے ویسے ہو
ہنومان جی ! کیسے ہو

کیا جیسے ہو باہر سے
اندر سے بھی ایسے ہو

پھُولتے جاتے ہو دن رات
بندر ہو یا بھینسے ہو

پھنسے ہوئے ہو سُر میں ایک
ڈرے ہوئے اک لے سے ہو

سُوجھ ہی نہیں رہا کچھ بھی
وحشت پتّوں کی نے سے ہو

بِین بجاتے ہو ہر دم
مست اسی اک نے سے ہو

جنگل چھوڑ دیا ہوتا
تنگ اگر کھٹکے کھٹکے سے ہو

ڈوب گئے ہو سیاست میں
خوش کتنے بچے بچے سے ہو

ہمیں تو ہو منظور ، ظفر
جیسے ، جیسے تیسے ہو

-☆-

جرأت سے کچھ، ڈرتے کچھ
کہہ گئے جیتے مرتے کچھ

باچھیں تو کرواتے صاف
بنتے اور سنورتے کچھ

ہمیں تو یہ حسرت ہی رہی
ہنومان جی کرتے کچھ

کود تو پڑتے پانی میں
ڈوبتے اور اُبھرتے کچھ

نچلی شاخ پہ آ جاتے
چوٹی سے تو اُترتے کچھ

کھاتے ، اور ، کھاتے جاتے
اسی سمان اپھرتے کچھ

پُوچھا حال ، چلے آئے
بندریا پاس ٹھہرتے کچھ

جنگل چھوڑ دیا بیکار
اور بھی جچتے چرتے کچھ

خوب مزہ آتا جو ظفر
کرتے کچھ اور بھرتے کچھ

-☆-

یہ جڑی بوٹیاں ہی کیا لائے
تُم تو سارا پہاڑ اُٹھا لائے

جانور سب ہیں پیار کے حقدار
کبھی پیغام جا بہ جا لائے

کچھ تُمھارا نہیں قصُور اس میں
دل ہی تُم کوئی منچلا لائے

کل بھی کشتی تھی اک تُمھارے ساتھ
آج یہ اور بیسوا لائے

بندریائیں نئی نویلی سب
ساتھ کچھ لائے ، کچھ جُدا لائے

بعض پہ رُعب تاج کا جھاڑا
بعض کو گُرز سے ڈرا لائے

اُڑ گئے ساتھ لے کے دلبر کو
اور سارا جہاں دکھا لائے

بندریاؤں کے بھاگ جاگے ہیں
جسے چاہا اُسے اُڑا لائے

اے ظفر ، ہے وُہ قادرِ مُطلق
کاش اُسے بھی اِدھر خُدا لائے

☆

ٹھیک ٹھاک انسان ہو
کہنے کو ہنومان ہو

رونق ساری تُمھی سے
تُم جنگل کی جان ہو

تُم ہی ہندستان تھے
تُم ہی پاکستان ہو

اندر سے پیچیدگی
باہر سے آسان ہو

جتنے بھی آباد تھے
اُتنے ہی ویران ہو

آدھے ہو انسان اگر
آدھے تو حیوان ہو

دُم کٹوا کر دیکھنا
کیسے بے پہچان ہو

آپ کے ہوتے ہُوئے تو
شاید ہی بحران ہو

آپ اگر چاہیں ، ظفر
ہر مُشکل آسان ہو

☆

جس بندریا سے گئے ہو پھنس
کاٹے دے گی تمھارے کَس

اُس بندریا کا نہیں نقصان
آپ کا نُچڑے گا سارا رس

اِک بندریا وہ بھی ہے جس پہ
آپ کا چلتا نہیں ہے بس

کام آؤ گے ہمارے کیا
ٹس سے تو ہوتے نہیں ہو مَس

ہنومان کا ہی کہا مانا
کر نہیں سکتے تھے پیش و پس

ہنومان جی ایک لوہا لاٹھ
اور باقی سب ہیں خار و خس

پھول بکھراتے ہیں مُنہ سے آپ
دُم سے تو لیتے ہیں لیکن ڈس

اِک بندریا کی زیارت کو
جا رہا تھا ہر کس و ناکس

اے ظفر، جاری رکھو اِس کو
کام یہ کرنا نہیں ہے بس

☆

ہنومان کو پکڑا پیر
نکلے اب یہ جیسا پیر

ہوتے ہیں جھوٹے حالات
ہو نہیں سکتا جھوٹا پیر

شہر میں جا کر ہی کر لو
کوئی چھوٹا موٹا پیر

شہر کے پیر سے بہتر ہے
پھر بھی یہ جنگل کا پیر

پہلا پیر ہے بندر خُود
اُس کے بعد بندریا پیر

بَن ہے بھرا مُریدوں سے
ہنومان ہے تنہا پیر

کھڑی تھیں کئی مُریدنیاں
سامنے سب کے ناچا پیر

سب مُرید خُود بھوکے تھے
دُم دبائی اور بھاگا پیر

ہوتا ایک، ظفر، اے کاش
میرا اور تُمھارا پیر

☆

پل میں کہاں گئے ہنومان
یہیں کہیں تو تھے ہنومان

شہروں پر بھی سایہ فگن
جنگل میں رہتے ہنومان

دھوم مچاتے گورے ہیں
بوسنیا میں سے ہنومان

بیت المقدس کے اندر
کیسے گھسے ہوئے ہنومان

دھاک بٹھائے بیٹھے ہیں
کالوں پر گورے ہنومان

کمزوروں کی کیا ہمت
پھرتے ہیں تگڑے ہنومان

صدیاں گزریں ، اور ، رہے
ویسے کے ویسے ہنومان

باہر والوں سے بڑھ کر
اپنے اندر کے ہنومان

آپس میں لڑتے ہیں ، ظفر
میرے اور ترے ہنومان

-☆-

سب سے آگے آگے آئے
ہنومان جی ، کیسے آئے

آ پہنچے ، کافی ہے یہ بھی
سیدھے آئے ، اُلٹے آئے

آئے تو چھدرے بالوں کی
خاکی وردی پہنے آئے

بُلوائے تھے سارے بندر
کتنے رہ گئے ، کتنے آئے

تھا یہ مجبوری کا آنا
آئے ، جیسے تیسے آئے

آنا ہی کافی ہے اُس کا
اُوپر آئے ، نیچے آئے

ہنومان پر پڑی مُصیبت
بندریاؤں کو کپڑے آئے

مطلب آن پڑا ہے جب بھی
ٹھیں ٹھیں کرتے بھاگے آئے

مُفت ظفر ملتا ہے ، رکھ لو
شاید کام تمھارے آئے

-☆-

میرے جیسے ہیں کہ تمھارے جیسے ہیں
ہنومان دُم‌دار ستارے جیسے ہیں

بات سمجھ میں آ ہی نہیں رہی ہے کہ آپ
بندر ہیں اور کتنے پیارے جیسے ہیں

اور تو کسی کے جیسے ہوں کہ نہیں ہوں آپ
آبا و اجداد ہمارے جیسے ہیں

کچھ معلوم تو ہو کہ ہمارے سامنے آپ
آدھے جیسے ہیں یا سارے جیسے ہیں

جاگتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہی سوئے بھی
ہنومان جی خواب کنارے جیسے ہیں

آپ کا حکم بجا لانے کو ہیں تیار
آپ کے سب انداز اشارے جیسے ہیں

چین سے بیٹھ نہیں سکتے پل بھر کے لیے
آپ تو سیدھے سیدھے پارے جیسے ہیں

اُن کے ساتھ کوئی کیسے چل سکتا ہے
ہنومان جی اُلٹے دھارے جیسے ہیں

ہنومان ! انسان نہ بنتا ، رُک جانا
ایسے کاروبار خسارے جیسے ہیں

-☆-

کچھ تو ہلو جلو ہنومان
کوئی کام کرو ، ہنومان

مِل کے اندر ہیں مزدور
مِل کے اوپر ہو ہنومان

پھیلایا غصے نے ڈُوڈ
بنے ایک کے دو ہنومان

چھوڑ اب جان رعایا کی
او ہنومان ، او ہنومان!

باندریوں کا سہارا کیا
اپنے آپ اُٹھو ہنومان

ایک عُمر سے ہوتا ہے
بَن میں ، چاہے جو ہنومان

جانے کی کیا جلدی ہے
آئے ہو ! بیٹھو ہنومان

آج کی بُھگتی کیسی تھی
سچ سچ ہم سے کہو ہنومان

آپ کی بیعت کر لی ہے
ہو سو ہو اب جو ہنومان

-☆-

سچائی کی صدا کچھ ہو
ہنومان جی، کیا کچھ ہو

اُن لوگوں کا خدا حافظ
جن لوگوں کے خدا کچھ ہو

بندر ہو یا ہو انسان
یا اُن سے بھی جُدا کچھ ہو

دونوں صفتیں ہیں موجود
کچھ ہو شاہ، گدا کچھ ہو

یہ بھی تمھاری خاص ادا
کیا ہو اور، کہا کچھ ہو

ہو مزدور پہ مِل مالک
یا اُس سے بھی سوا کچھ ہو

وہ بیماری ہو، ہنومان
جس کی آپ دوا کچھ ہو

ہم تو مان گئے، ہنومان
جو کچھ بھی ہو، بلا کچھ ہو

کھویا گیا ہے کہیں ظفر
اُس کا تمھیں پتا کچھ ہو

-☆-

قسمت کھوٹی ہے، ہنومان
عقل بھی موٹی ہے، ہنومان

کھیل ہے جیون کا، جب تک
تن پر بوٹی ہے، ہنومان

بھوک تو مِٹ جاتی ہے، مگر
رُوکھی روٹی ہے ہنومان

دُنیا اندھی ہے یا ہم
ہاتھ میں سوٹی ہے ہنومان

پیڑ کی چھانو سے بھی بڑھ کر
پیڑ کی چوٹی ہے، ہنومان

دُم کو اور بڑھا، پیارے
ابھی یہ چھوٹی ہے، ہنومان

آگے پیچھے کرتا رہ
جیون گوٹی ہے، ہنومان

دُم کے نیچے جیسے کوئی
بیر بہوٹی ہے، ہنومان

ہم نے تو دُنیا میں، ظفر
بھنگ ہی گھوٹی ہے، ہنومان

-☆-

تاج کہاں سے پایا تم نے
کس کا گرز چرایا تم نے

ایک بندریا کی یادوں میں
اپنا آپ بھلایا تم نے

پھل کے ہوتے ہوئے کیسے
نیا شکار پھنسایا تم نے

پیڑ کا پتا پتا لرزا
گیت انوکھا گایا تم نے

بندر اور انسان کا آخر
کافی فرق مٹایا تم نے

ایک بھجن ایسا بھی ہے جو
اب تک نہیں سنایا تم نے

ننھی سی اس جان کے اوپر
من کا بوجھ اٹھایا تم نے

جو بھی پایا تھا جنگل سے
سب کچھ یہیں گنوایا تم نے

کوئی بچت بھی کی ہے، آخر
ساری عمر کمایا تم نے

☆

جیتے جی اب مرو بھی
جان خلاصی کرو بھی

پانی ہے، گہرا نہیں
پاؤں کچھ اس میں دھرو بھی

ہنومان جی! ایک دن
برف سے ہو کر ٹھرو بھی

جو سر پر آ پڑی ہے
ہمت کر کے جرو بھی

کمی نہیں پھل پھول کی
کچھ تو چاہو چرو بھی

ڈوبو بھی گہرائی میں
اس کے اوپر ترو بھی

میرے ساتھ رواں رہو
اے میرے ہمسرو بھی

اچھا وقت بھی خوب ہے
بُرے وقت سے ڈرو بھی

کھیل بہت کھیلا، ظفر
بازی اب یہ ہرو بھی

☆

قائم سے ہیں، ڈولے سے ہیں
ہنومان جی بھولے سے ہیں

کبھی آگ کا شعلہ ہیں، اور
کبھی برف کے گولے سے ہیں

بہ جاتے ہیں دائیں بائیں
پھوڑے ہوئے پھپھولے سے ہیں

فرق نہیں رتی ماشے کا
ناپے سے ہیں، تولے سے ہیں

پا کر کھو جاتے ہیں اکثر
رانوں بیچ ٹٹولے سے ہیں

حبس میں دم گھٹتا ہے پھر بھی
سات کھڑکیاں کھولے سے ہیں

امرت ہے باتوں کے اندر
زہر بھی ان میں گھولے سے ہیں

قورمے اور پلاؤ بھی ان کے
خاصے آلو چھولے سے ہیں

کوئی بھی انھیں پہن لے آ کر
ہنومان جی چولے سے ہیں

-☆-

ہنومان نے کھولا جب
پی کر اُلٹے ہو گئے سب

تن پر، اور، آنکھوں میں جھاگ
اور، پانی سے خالی ٹب

باچھیں ہی باچھیں تھیں وہاں
کہیں نظر نہیں آئے لب

ہنومان کا آیا راج
لوگ کہاں کو جائیں اب

ہنومان! جاتے ہو کیوں
ہنومان! آؤ گے کب

تھوڑے اچھے لگتے ہو
گُرز نہیں لہراتے جب

ہم بھی ساتھ رہے اُس کے
دیکھے سب اُس کے کرتب

آدمی پُوجا کرتے ہیں
دیکھو بندر کا منصب

ہنومان کی صحبت سے
نکلو گے جانیں گے تب

-☆-

بے ہتھیارے لڑتے ہو
ساتھ ہمارے لڑتے ہو

ہنومان جی ! لے کر ساتھ
بندر سارے لڑتے ہو

یہاں تو لڑتے ہی تھے ، اب
راون دوارے لڑتے ہو

لڑے تھے پہلے بھی اک بار
اب دوبارے لڑتے ہو

دُم کی مار بھی ہے کافی
اسی سہارے لڑتے ہو

نقد ہی لڑتے ہو ، لیکن
کبھی اُدھارے لڑتے ہو

اُٹھ کر لڑنا کیا لڑنا
پاؤں پسارے لڑتے ہو

پھرتے ہو مارے مارے
اور ، بے چارے لڑتے ہو

کبھی بیاہے ہوئے ، ظفر
کبھی کنوارے لڑتے ہو

☆

ہنومان جی ، بے مثال سے کیوں ہیں
آپ کے ایسے خال خال سے کیوں ہیں

سیدھے سادے ، بھولے بھالے اتنے
ساتھ ساتھ ہی گول مال سے کیوں ہیں

ہنومان جی ! یہ تو بتاؤ ہم کو
دُم کے نیچے لال لال سے کیوں ہیں

پیار بھی رکھتے ہیں ، اور ، بے پروا بھی
دُور دُور سے ، ٹال ٹال سے کیوں ہیں

باچھیں کھلی ہوئی رہتی ہیں تو پھر
اندر سے یُوں خستہ حال سے کیوں ہیں

جانتے بُوجھتے سب کچھ ہیں ، اور اس پر
بے جواب اور بے سوال سے کیوں ہیں

تاج ہے سر پر ہلکا پھلکا لیکن
چُور چُور سے اور بدحال سے کیوں ہیں

ایک دُوسرے سے آپ اور ہم اب تک
بچے ہوئے یُوں بال بال سے کیوں ہیں

آپ اور ہم تو اور اور ہیں ، لیکن
آپ ہمارے ہم خیال سے کیوں ہیں

☆

آدھا سچ اور آدھا کھوٹ
ہنومان کی لُوٹ کھسوٹ

پیڑ سے اُترے ہی اُترے
دیکھ لیا ہے دس کا نوٹ

بُوٹی لائے پہاڑوں سے
لگی بندریا کو جب چوٹ

پتّے بھاتے نہیں اُسے
اب تو کھاتا ہے اخروٹ

ہر دم رہتا ہے تیّار
ڈھیلا رکھتا ہے لنگوٹ

سردی نے جب زور کیا
ہنومان نے پہنا کوٹ

کرے گا سب کی خدمت خوب
ہنومان کو دینا ووٹ

اُتنا آگے جانا ہے
یہاں سے جتنا ہے ڈنڈوت

خود بھی ہے موجود، ظفرؔ
لے رکھی ہے دُم کی اوٹ

☆

وہ ہی پانو پر کھڑے ہُوئے
ہنومان جی بڑے ہُوئے

دانت بھی میلے چیکٹ ہیں
بال بھی ہیں کچھ بڑھے ہُوئے

کس نے سکھلائے یہ داو
کس کالج کے پڑھے ہُوئے

گھات لگائے بیٹھے تھے
یُوں گُم صُم سے پڑے ہُوئے

جنگل کی ہریالی میں
اک موتی سے جڑے ہُوئے

کبھی پیڑ کے نیچے ہیں
کبھی پیڑ پر چڑھے ہُوئے

سیدھے مُنہ بولے ہی نہیں
بیٹھے تھے کچھ سڑے ہُوئے

ہلتے ہی نہیں تھے، جیسے
ہوں دھرتی میں گڑے ہُوئے

بندروں سے ناخوش تھے، ظفرؔ
بندریاؤں سے لڑے ہُوئے

☆

سوئیں کبھی ہمارے ساتھ
روئیں کبھی ہمارے ساتھ

نا ہونے کے ہوتے ہُوئے
ہوئیں کبھی ہمارے ساتھ

ہنومان جی ، سُکھ کے بیج
بوئیں کبھی ہمارے ساتھ

چُکیں دیر سویرے کبھی
چوئیں کبھی ہمارے ساتھ

میلی چادر سپنوں کی
دھوئیں کبھی ہمارے ساتھ

پایا ہے تنہا سنسار
کھوئیں کبھی ہمارے ساتھ

بوجھ اس جینے مرنے کا
ڈھوئیں کبھی ہمارے ساتھ

لہو میں اس بن کی مٹی
گوئیں کبھی ہمارے ساتھ

وصل کی یہ بتی روٹی
موئیں کبھی ہمارے ساتھ

-☆-

سُنا نہیں تھا ایسا ناچ
ہنومان کا دیکھا ناچ

بات ہی تھی کچھ اُلجھی سی
سُلجھانے کو ناچا ناچ

تھمنے میں ہی نہیں آتے
ناچ رہے ہیں پہلا ناچ

کوئی چیز تو ٹیڑھی ہے
اب وہ آنگن ہو یا ناچ

اچھا ناچا تھا اُس دن
آج اُس سے بھی اچھا ناچ

تنہا ناچ نہیں ، ہنومان
لے کر کوئی بندریا ناچ

رُوٹھا یار منانا تھا
ورنہ کیا ہم اور کیا ناچ

ناچتے دیکھا جب اُس کو
بھول گئے سب اپنا ناچ

نچواتا ہے آپ ظفر
ہم نے تو نہیں سیکھا ناچ

-☆-

سپنا دیکھا پاپ کا
کیا شُھ نام ہے آپ کا

جوڑ کہاں سے لائیے
ہنومان کے ناپ کا

کپڑا ہی ملتا نہیں
کوئی تُمھارے ماپ کا

عُرز بھی تھا بڑھیا بہت
تاج بھی پہنا ٹاپ کا

کوئی حساب ہی نہیں ہے
ہنو نام کے جاپ کا

دھیرے دھیرے ہی کہیں
ہو گا اثر سراپ کا

ہنومان کو دیکھیے
پتا کسی تِک شاپ کا

مُرلی کی دُھن کا دھنی
یا طبلے کی تھاپ کا

پتا نہیں چلتا ، ظفر
ہنومان کے باپ کا

-☆-

ہنومان کی پوجا کر
بندر بن کے سوچا کر

کوئی بندریا پھانس کے لا
کوئی کام تو اچھا کر

ہنومان کی حرکت کا
جنگل جنگل چرچا کر

چھپ کر بُغتی میں مشغول
ہنومان کو دیکھا کر

اسی کام کو آئے ہیں
ہنومان جی ، سمجھا کر

پیڑوں پہ پھل نہیں رہا
گھاس پھونس ہی کھایا کر

بَن میں برکت نہیں رہی
اس پہ اشک بہایا کر

اُلٹایا ہے کیوں اس کو
ہنومان کو سیدھا کر

کھانا ہے میوہ تو ، ظفر
ہنومان کی سیوا کر

-☆-

جنگل جنگل شور ہے
ہنومان بھی چور ہے

آدھا آدمی ہے ، مگر
آدھا ڈنگر ڈھور ہے

چوٹی پہ بیٹھا ہے وہ
اس پر کس کا زور ہے

آنکھیں کھولو ہنومان
شام نہیں ہے ، بھور ہے

بن اب کیوں کر آئیں گے
دھرتی کلّر شور ہے

ہرے رنگ کی روشنی
کیا جانے کس اور ہے

ہنومان سے کیا کہیں
وہ خود آدم خور ہے

دیکھنے والے مر گئے
جنگل ہے اور مور ہے

ہنومان کا تو ، ظفر
کوئی اور نہ چھور ہے

-☆-

آ ہنومان
جا ہنومان

جو چاہے
کھا ہنومان

امبر پہ
چھا ہنومان

سُکھ سندیس
لا ہنومان

از آدم
تا ہنومان

سب سنسار
کا ہنومان

کیا جنگل
کیا ہنومان

بندر ایک
تھا ہنومان

ناچ ، ظفر
گا ، ہنومان

-☆-

کب چھوڑو گے جان جی
کیسے کچھ ، ہنومان جی

اُٹھیں گے سب آپ پر
آپ جو ہیں پردھان جی

ڈٹے ہوئے ہیں تخت پر
کیسے بندر خان جی

پولیس کسوا لیجیے
منگوائیں ترکھان جی

نئے زمانے آ گئے
لکھو نیا فرمان جی

دیکھو اپنی آنکھ سے
پڑا ہوا گھمسان جی

اوپر سے کچھ بھیجیے
نیچے بھی سامان جی

سب کچھ کھا گئے آپ خود
خلقت ہے حیران جی

کس بندریا نے ، ظفر
بھرے تمھارے کان جی

-☆-

بندر تھوڑا ہنومان
بہتا گھوڑا ہنومان

تنہا کیسے رہ سکے
ہر دم جوڑا ہنومان

ثابت و سالم تھا ابھی
کس نے توڑا ہنومان

ٹوٹ گیا تو گوند سے
ہم نے جوڑا ہنومان

میں نے باندھا تھا ، مگر
کس نے چھوڑا ہنومان

آئی پسینے سے مہک
تھا کوئی کیوڑا ہنومان

رُوٹھ کے جاتا تھا ، مگر
میں نے موڑا ہنومان

جاگا پھر بھی نہیں تھا
بہت جھنجھوڑا ہنومان

پھولوں کی بوری ، ظفر
پھل کا توڑا ہنومان

-☆-

بندریاؤں سے پرے ہیں
ہنومان جی کھرے ہیں

جیون میں پہلی دفعہ
بُرے کام سے ڈرے ہیں

خالی ہو گئے دنیا سے
اور غُصّے سے بھرے ہیں

باہر پھیلا سوکڑا
بن اندر کے ہرے ہیں

پاتو دلوں میں کچ سے
ہنومان نے دھرے ہیں

بن میں راج بھی ہے وُہی
اور وُہی گُل چھرے ہیں

اُس ناری کے پاس دو
ناگپوری سنگترے ہیں

اتنی گری تھی ، مگر
دیکھ کے اُس کو ٹھرے ہیں

ایسی ویسی پہ ، ظفر
ہنومان جی مرے ہیں

☆

بن پر کوئی مصیبت آئے
ہنومان جی پھر مت آئے

سارے بندر مل جائیں تو
ہنومان کی شامت آئے

دے رکھا ہے سب کو دھوکا
دیکھ کے سب کی حالت آئے

رات رنگیلی ہنومان کی
چاہے صبح قیامت آئے

بن میں ہے اک بیابان بھی
جسے دیکھ کر وحشت آئے

ہنومان کے اندر جاؤ
باہر دل سے محبت آئے

اب تو ایک زمانہ گزرا
ہنومان پہ تہمت آئے

دھن برسا ہے ہنومان پہ
اب تو کہیں سے عزت آئے

کوئی بندریا ایسی بھی ہو
جس پہ آپ طبیعت آئے

☆

آنکھوں سے دیکھے ہنومان
بنا پنکھ اُڑتے ہنومان

آ جوہڑ میں کود پڑے
تھے اِتنے پیاسے ہنومان

اور بھی اچھے لگتے ہیں
بندریا سے لپٹے ہنومان

اُلٹا کام جو کرتا تھا
آئے یہاں سیدھے ہنومان

تھے سب سے ہی الگ تھلگ
ترچھے اور بانکے ہنومان

پیچھے پیچھے بھگتی ہے
بھگتی سے آگے ہنومان

داستان سی ہے ، ورنہ
کیا جنگل ، کیسے ہنومان

ہے انصاف کی بات یہی
جیسے ہم ، ویسے ہنومان

ابھی منگائے دیتے ہیں
چاہیے ہیں کتنے ہنومان؟

-☆-

آؤ ! پکاریں ہنومان کو
مِل کر ماریں ہنومان کو

تخت ہمارا ہے ، اِس پر سے
تُرت اُتاریں ہنومان کو

بُلوایا ہے آخر ہم نے
دے کر تاریں ہنومان کو

کہیں ڈبوئیں اِس پانی میں
کہیں اُبھاریں ہنومان کو

کبھی اُکھاڑیں اور گرائیں
کبھی اُساریں ہنومان کو

یاد رہیں گی جیون بھر یہ
دودھ کی دھاریں ہنومان کو

بیٹھ جائیں گی لے کر اِک دن
ہاہاکاریں ہنومان کو

مارنے سے پہلے بہتر ہے
ابھی اُلاریں ہنومان کو

اور نہیں تو کہیں بیٹھ کر
جُوئے میں ہاریں ہنومان کو

-☆-

ہیں شرمائے ہوئے ہنومان
کہیں سے آئے ہوئے ہنومان

حکم چلاتے ہیں بَن میں
دُم لہرائے ہوئے ہنومان

مارے ہوئے ہیں سب کا حق
یہ للچائے ہوئے ہنومان

آج رات کے جلسے میں
ہائے ہائے ہوئے ہنومان

رہتے ہیں اک عرصے سے
کچھ بولائے ہوئے ہنومان

ظاہر تو نہیں کرتے کچھ
ہیں گھبرائے ہوئے ہنومان

باتیں کرتے وقت بھی کچھ
تھے بھرائے ہوئے ہنومان

چٹخارا دیتے ہیں کہاں
اپنے لائے ہوئے ہنومان
چھٹیں گے مشکل سے ہی ظفر
ہم پہ چھائے ہوئے ہنومان

-☆-

ہاتھ سے نکلا جائے زمانہ
او ہنومانا ! او ہنومانا!

بندریاؤں سے فرصت ہو تو
کبھی ہمارے پاس بھی آنا

اُونچی چوٹی ، چھدری شاخیں
اور نہیں کوئی ٹھور ٹھکانا

پچھلی رات کو اس جنگل سے
بندرجاتی کا اُٹھ جانا

کوئی کمال نہیں ہے یہ تو
کبھی ہنسانا ، کبھی رُلانا

ایک سے فارغ ہو چکنے پر
دُوسری کو جا کر بہکانا

بہت خراب کیا ہے اس کو
ابھی اسے جا کر نہلانا

آپ تو اپنے ہنومان ہیں
بھلا آپ سے کیا شرمانا

ہنومان کا ناچ یہی تھا
آؤ ! سنو اب اُس کا گانا

-☆-

ہنومان ہم سے شرمائے
دُم بھیجی ہے، خود نہیں آئے

بندریاؤں کو کیے جو ارپن
وہی بھجن ہم کو بھی سنائے

اور تو کوئی کام نہیں تھا
رات رات بھر ناچے گائے

ساری خلقت پُوج رہی تھی
جا ہم نے بھی سیس نوائے

رام چندر کی خاطر لڑنے
اپنی فوج بنا کر لائے

کٹ کر مر گئی بندر جاتی
آپ بھی کافی گُرز گھمائے

خود اُڑتے ہیں ہنومان جی
یہ کرتب ہم کو نہ سکھائے

ہنوؤں نے سر میں چھیڑ چھاڑ کی
تاج اُٹھایا اور کھجلائے

کیا بندر تھا، شان تھی کتنی
آدمی بن گیا، ہائے ہائے

-☆-

آدھی رات سمے ہو گی
ہنومان کی جے ہو گی

کھا بیٹھے ہیں آج بہت
ہنومان کو قے ہو گی

بندریا کو بلوانے میں
او ہو گی یا آے ہو گی

بھیڑیں بن جائیں گے سب
آخر سب کی بھے ہو گی

پیڑ کی چوٹی پر چڑھ کر
حکمتِ عملی طے ہو گی

معشوقوں کے پیڑ تلے
مدرا ہو گی، مے ہو گی

ہنومان کے پہلو میں
کوئی انوکھی شے ہو گی

پیڑ کی شاخ بھی آج کی رات
ایک لچکتی لے ہو گی

بندریاؤں کی شہزادی
سب کے سامنے ہیچ ہو گی

-☆-

تھے ڈرتے ہنومان سے
کیا کہتے ہنومان سے

ہنومان نے کہہ دیا
سب اچھے ہنومان سے

ڈرے ہوئے تھے، اس لیے
دُور رہے ہنومان سے

ہیں پُوجا کے ساتھ ساتھ
کئی گلے ہنومان سے

جنگل سارا طے کیا
اور ملے ہنومان سے

کچھ سمجھایا بیٹھ کر
کچھ سمجھے ہنومان سے

ہنومان ہم سے گیا
ہم نہ گئے ہنومان سے

ہیں اپنے تو اور بھی
کچھ رشتے ہنومان سے

کیوں لڑواتے ہیں، ظفر
آپ مجھے ہنومان سے

☆

چاروں سمت اُسی کا نرم نظارا ہے
ہنومان ڈنکے کی چوٹ ہمارا ہے

ہم سے زیادہ کس کا حق ہوگا اُس پر
ہم نے ہی اُس کو چوٹی سے اُتارا ہے

مُشکل ہے چلنا ویسے تو اُس کے ساتھ
ہنومان ایک ایسی اُلٹی دھارا ہے

اُس کے پار تو ہے منزل ایمان کی بھی
ہنومان ایسا ہی کُفر کنارہ ہے

ہنومان آگے بھی ہے اور پیچھے بھی
ہنومان پہلے ہے اور دوبارہ ہے

ابھی جُڑے گا اور بن جائے گا ہنومان
یہ جو ہمارے سامنے پارہ پارہ ہے

اِس کو معمولی مت سمجھیں آپ! جناب
یہ جنگل کے آسمان کا تارا ہے

ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے اس بارے میں
جا کر دیکھ لو آدھا ہے یا سارا ہے

ظاہر میں تو محض ایک بندر ہے، مگر
عقلمند کے واسطے ایک اشارہ ہے

☆

ہنومان کا رُتبہ عالی
دل میں بجے اُسی کی تالی

ویسے تو پتی ہوتی ہے
کبھی ساتھ رہتی ہے سالی

سیکھ جائیں گے کرتب سارے
بیت رہی ہے عُمریا بالی

یہی پہاڑ کا راکھا اپنا
اور اپنے جنگل کا مالی

مَن تو یُوں ہی ہرا بھرا ہے
کہاں سے آئی ہے یہ بدحالی

یہ طوفان کِدھر سے آیا
چائے کی پیالی تو ہے خالی

بندر جی سے ہوتے ہوتے
آئی شاعروں میں نقالی

وُہی ہمارا جدِّ امجد
اور ہم اُس کے وارث ، والی

ہنومان جی ! یہ تو اور ہے
کہاں گئی وہ پہلے والی

☆

آخر کیا ہو گی اُن کی مجبوری
سہتے ہیں جو ہنومان کی دُوری

ہنومان کی باچھوں میں خُوشبُوئیں
اور اُس کی دُم کے اندر کستوری

آ کر اور اُداسی دے جاتی ہے
سپنوں میں وہ صُورت بھوری بھوری

دُوسروں کو ہے گھاس پھونس پر رکھا
ہنومان جی خُود کھاتے ہیں چُوری

بندروں کو بھُوکوں نہیں مرنے دینا
ہنومان جی ! ہے یہ بہُت ضرُوری

ہنومان جی وعدے کے ہیں پکّے
ہنومان جی شرط کریں گے پُوری

جنگل کی اِتنی خِدمت کی ، آخر
ہنومان جی ! کب ہو گی مشہُوری

ہنومان جی ! کُچھ ہم کو بتلائیں
آپ یہاں کے ناری ہیں یا نُوری

اب تو کسی مداری کے ہو جاؤ
اور ، ظفر کے ساتھ کرو مزدُوری

☆

آخر ہم یہ کب تک سُنتے جائیں
ہنومان جی ، آئیں بائیں شائیں

کیسے پہنچیں آپ کے چرنوں تک ہم
بندریائیں ہیں آپ کے دائیں بائیں

آپ کے بارے میں کچھ سچّی جھوٹی
ہم نے بھی تو سُن رکھی ہیں کتھائیں

آپ کو تو کیا فرصت ملتی ہو گی
نسدن ہم ہی آپ کے دوارے آئیں

ہنومان جی ! گھاس بھی سُوکھ گئی ہے
اب تو رہا نہیں کچھ بھی ، کیا کھائیں

جنگل تو سب کٹ گیا، لیکن اب بھی
کانوں میں رہتی ہے سائیں سائیں

آپ ہی چالو کر سکتے ہیں اُن کو
رُکی ہُوئی ہیں صدیوں سے جو ہوائیں

ہم ہیں کب کے دُور سے آئے بیٹھے
ہم کو بھی کبھی اپنا آپ دکھائیں

موسم ٹھیک ہے، بندر چپ ہیں سارے
بندریائیں بھی خُوش ہیں ، اور سنائیں

☆

پیڑ پہ چڑھ کر پیڑ ہو گئے
ہنومان جی بھیڑ ہو گئے

کانوں کان سُنا سندیا
لفظو لفظ کھدیڑ ہو گئے

گھوڑے کو کیا ایڑ لگائی
ساتھ ہی خُود بھی ایڑ ہو گئے

ویسے بن گئے جیسے چاہا
سیدھ ہو گئے ، ٹیڑھ ہو گئے

جُون بدل لی ہنومان نے
لالی تھے ، اب سیڑھ ہو گئے

چھیڑتے چھیڑتے بندریاؤں کو
خُود بھی اپنی چھیڑ ہو گئے

اپنے کرتُوتوں کے باعث
بچپن میں ہی اُدھیڑ ہو گئے

قُدرت ہمیں بھی ساتھ ملایا
آدھے تھے، پھر ڈیڑھ ہو گئے

اچھے بھلے خُوشی نندن تھے
اچھی بھلی کھکھیڑ ہو گئے

☆

آبادی سے ہو گئے تنگ
ہنومان جی ! چھیڑو جنگ

جب تک جنگ نہیں چھڑتی
تب تک بیٹھ کے گھوٹیں بھنگ

بھوکوں مرتے بھاگیں گے
بے شک بڑھتے جائیں ملنگ

طرز اُتارا بھی کیسے
آپ تو ہیں پہلے ہی دبنگ

ہنومان جی ، ایسے ہو؟
لوگ دیکھ کر رہ گئے دنگ

بے رنگی بھی کافی ہے
یہ بھی ایک تُمھارا رنگ

چلا پھرا بھی کرو ہنومان
یوں تو لگ جائے گا زنگ

تُم تو اُڑنے لگتے ہو
کیسے چلیں تُمھارے سنگ

رہتا ہے بے انگ سدا
جو بھی لگا تُمھارے انگ

-☆-

مہک رہی ہے گھاس
دل ہے بہت اُداس

جو ہنومان سے دُور
اُس کا ستیاناس

ساتھ ہے بستر پر
ہنومان کی ساس

چوٹی سے اُترو
آ کر بیٹھو پاس

ہم عاجز ، مسکین
اور ، تُمھارے داس

ہنومان کو ہے
نندن کا بن باس

آخر جنگل ہے
آ جائے گا راس

جی میں جمع ہوئی
چار سَمت کی پیاس

ہنومان کے دانت
ہنومان کا ماس

-☆-

بھٹی مجرائیں ہنومان کی
کسی طنائیں ہنومان کی

دیمک کھا گیا بھگتی ساری
اور کتھائیں ہنومان کی

شام ڈھلے باچھوں سے بہتی
وہی شرائیں ہنومان کی

دور دور تک اور چمکتی
جائیں رکائیں ہنومان کی

دسترخوان پہ پڑی ہوئی ہیں
خالی قائیں ہنومان کی

رہتی ہیں کمزوروں پہ ہی
نسدن دائیں ہنومان کی

سپنوں میں یہ سارے بندر
ہڈیاں چبائیں ہنومان کی

تیتر ، تلیر ہنومان کے
اور ، مرغائیں ہنومان کی

باندریاں ایک ایک سے بڑھ کر
چنڈلیاں دائیں ہنومان کی

☆

جتنی کیجے چھان پھٹک
نکلے گا خوشحال خٹک

چھوٹا سا تو جنگل ہے
اس میں کیا سکتے ہو بھٹک

نار ہی وہ کچھ ایسی تھی
چلتے چلتے گئے اٹک

ہنومان تھے ابھی یہاں
گئے ہیں یہ کس اور سٹک

ہنومان کی کھلتی باچھ
ہے کیسی غنچے کی چٹک

ناری ایک ، کبوتر دو
دور سے آتی ہوئی ٹھمک

ایک بار اُس ٹہنی سے
لامی دُم کے ساتھ لٹک

رہ گئے کانٹا سے ہنومان
اور ، اُن کی بے نام کھٹک

بوجھ ، ظفر ، ہے سر کا ہی
کبھی جو اس کو پاؤ جھٹک

☆

میں سمجھا تھا ہوں بس میں
شہر میں تو کچھ اور بھی ہیں

بندر ہیں یا ہیں توتے
کرتے رہتے ہیں ٹیں ٹیں

دل کا گھوڑا دب جاتا
ایک بار تو ہوتی ٹھیں

بندریاؤں کو ہوا زکام
بچے کو اب کہتی ہیں چھیں

میں نے پوچھا، کیسے ہو؟
ہنومان جی بولے: ٹھیں

پٹا بہت بندریا کو
ساری رات رہی ڈھیں ڈھیں

جس نے یہاں اُٹھایا سر
کیا اُسے چپکے سے گھیں

ہنومان ہو گئے بکری
کرتے رہتے ہیں: میں میں

ہو گی بند، ظفر، کس دن
روز کی یہ تیری چیں چیں

-☆-

جھنڈا کیا یہ گاڑا میں نے
گلا ہی اپنا پھاڑا میں نے

ہنومان جی کو پلوایا
شوربا گاڑھا گاڑھا میں نے

مال بھرا ہے سب دو نمبر
کھول لیا ہے باڑا میں نے

چیز ہی ایسی تھی وہ جس کو
بہت دُور سے تاڑا میں نے

سوم نے بے سدھ کیا کچھ ایسا
ہنومان کو جھاڑا میں نے

تھا رومال پُرانا، لیکن
پھول نیا ہی کاڑھا میں نے

راستہ اپنے لیے پٹا تھا
خود ہی برچھا آڑا میں نے

آخری عمر میں نہ نہ کرتے
چھوڑ ہی دیا اکاڑہ میں نے

پیڑ ہی بنجر تھا کویتا کا
جڑ سے کھینچ اکھاڑا میں نے

-☆-

مَیں تو ہُوا ہُوں گُم
کہاں گئے ہو تُم

ہنومان کی ہے
ہے یہ سَر پنچم

یا بندر کی باچھ
یا گھوڑے کا سُم

سب کُچھ گئی لپیٹ
ہنومان کی دُم

بندریا نہیں ہے پاس
بیٹھا ہے گُم سُم

بیگم صاحب یہ
اوّل ہیں کہ دوم

ٹھمکے سے ہنومان
ناچ رہے ٹھم ٹھم

ابھی قبولے سے
جا پہنچے ہو قُم

پہلی بات جو تھی
رہی وُہی اَنجُم

-☆-

بڑی ہی مُشکل سے جا کھوسے
وُہ بھی چند ہوائی بوسے

وُہی ہمارے آئے مُقابل
جو ہم نے خُود پالے پوسے

ساتھ ساتھ کپڑوں لیڑوں کے
بچّے بھی صندوق میں ٹھونسے

ناری کی بھرپُور رسوئی
کھانے والے چنگے چوسے

ہنومان جی کی فرمائش
دو امرتیاں ، تین سموسے

جنگل پر ہیں قابض اب بھی
چیر ، جتوئی ، ٹوانے ، کھوسے

ہنومان کا پتا نہ پایا
چھانے سبھی اڑوس پڑوسے

ہارتے سار کیا مُنہ کالا
یہی سلوک ہُوا ہیرو سے

گڑبڑ کر لیتے ، اچھا تھا
مارے گئے ، ظفر ، بے دوسے

-☆-

ملا جو انگ بھبھوت
بندر ہو گئے نبھوت

ہم ہنومان کی دین
آپ ہیں کس کے پوت

بھگت کبیر سمان
رہے اوت کے اوت

امن ہوا قائم
جب کھڑکایا بوت

کار نمایاں کو
کہتا ہے کرتوت

من میں کھلی کپاس
سب نے کاتا سوت

ہمیں اڑا لے جائیں
جانا ہے پیروت

رس کے بھرے ہوئے
ہونٹ ہیں یا شہتوت

روح سے آپ ، ظفر
باغی ہے قلبوت

☆

بندر جاتی وُہی ہے سڑتی گلتی
ہنومان جی ! رُت کیوں نہیں بدلتی

ہنومان جی ! بچّے کیوں نہیں پڑھتے
ان کے بِنا گھرداری کیوں نہیں چلتی

ہنومان جی ! رشوت کیوں ہے زیادہ
آپ کی منڈلی بھی ہے اسی پر پلتی

آپ تو موت کے ہرکارے مت بھیجیں
یہ بھی سچ ہے ، آئی موت نہیں ٹلتی

ڈاکوؤں کی ٹولی میں نے ان آنکھوں
آپ کی کٹیا سے دیکھی ہے نکلتی

سب کچھ ہوتا رہتا ہے مرے آگے
آنکھیں رہتی ہیں بے کار اُبلتی

ہنومان جی سوت کے ساتھ پھنسے تھے
پتنی بیٹھی رہی پکوڑے تلتی

مکھیاں چٹ کر گئی ہیں سارا کھانا
پتنی آخر کب تک پنکھا جھلتی

اتنا جلدی کرنا پڑتا ہے کچھ
ایسی ہوتی ہے یہ جوانی ڈھلتی

☆

آپ بھی اب رستے سے ہٹنے والے ہیں
ہنومان جی ! جنگل کٹنے والے ہیں

آسمان کو جاتے ہوئے غبارے بھی
آہستہ آہستہ پھٹنے والے ہیں

بیٹھے ہیں جو دھونس جمائے ہوئے بن پر
وہ بندر آپس میں بٹنے والے ہیں

آپ کے نوکر چاکر بھوکے بندر لوگ
آپ کی جانب آپ جھپٹنے والے ہیں

بندروں کی ہونے والی ہے خود بے کار
ہنومان دُنیا میں گھٹنے والے ہیں

عاشق لوگوں نے بھی سوچ رکھا ہے کچھ
اور ، بساطِ عشق اُلٹنے والے ہیں

بندر جاتی کے جاتے ہوئے قافلے اب
اُنہی پانو پر آج پلٹنے والے ہیں

آپ کدھر سے نکلیں گے ہنومان جی اب
راستے سب لاشوں سے پٹنے والے ہیں

جن کی مدد کو کوئی نہیں آتا تھا ، وہ
آپ سے اپنے آپ نمٹنے والے ہیں

☆

کچّے سے کچھ کاٹھے سے
ہنومان ہیں ماٹھے سے

پہنے ہوئے لنگوٹی سی
کھائے ہوئے پراٹھے سے

تاج اُچھالنے اُٹھے ہیں
باندھ سروں پر ٹھاٹھے سے

فوج ہنومانوں کی ہے
ہانکو ڈنڈے لاٹھے سے

رُکے نہیں پل بھر کو بھی
دیکھ کے ہم کو ناٹھے سے

شام ہوئی تو ہوئے شروع
جھینگر سے ، چرناٹھے سے

گھیرنے آ گئے جنگل کو
سانٹے سے ، کچھ آٹھے سے

پُوجا کریں تو پُوجاری
پاٹھ کریں تو پاٹھے سے

بوڑھے لگتے نہیں ظفر
حال آں کہ ہیں ساٹھے سے

☆

تھی مشہور بھگوڑی
آگے آگے دوڑی

توڑنے کو بادام
منگوائی تھی ہتھوڑی

ناک پکوڑا سی ہے
خود بھی ایک پکوڑی

چکھ کر ہٹ گئے پیچھے
ایسی کڑوی کوڑی

چھت پر جا پہنچے ہم
چڑھ کر پہلی پوڑی

مرے گی اُس سے پہلے
پیدا ہُوئی تھی جوڑی

لوگ کہاں سے گزریں
سڑک ہوئی ہے چوڑی

چترالی تھی پہلے
اب ہو گی پٹوڑی

ہنومان کے طعنے
دیتی رہی نگوڑی

-☆-

آپ سے اب کیا بولیں، صاحب!
دُم اپنی ہی ٹٹولیں ، صاحب!

جو پہلے ہی کھُلا ہُوا ہے
کیا اس بھید کو کھولیں ، صاحب!

روز یہ موقع کب ملتا ہے
ہنستے ہنستے رو لیں ، صاحب!

آپ سے ہے یہ لاگت بازی
آپ سے ہی یہ جُھلیں ، صاحب!

گیان دھیان اور بھگتی اندر
اپنا آپ مدھولیں ، صاحب!

ظاہر ظاہر ڈٹے ہُوئے ہیں
بیچ بیچ میں ڈولیں ، صاحب

دھرم دھار برتی ہے کب تک
کبھی کفر بھی تولیں ، صاحب!

پتا چلے جب دفتر اپنا
واشنگٹن جا کھولیں ، صاحب

کیجیے کیا ستھرائی صفائی
یہ باچھیں ہی دھولیں ، صاحب!

-☆-

رشی ولی رہنے نہ دیا
کہیں کوئی رہنے نہ دیا

آدمی تو ہم بن نہ سکے
بندر بھی رہنے نہ دیا

اس نے کچھ کو بتائیں سنائیں
اور ، کوی رہنے نہ دیا

کبھی کبھی موجود رہے
کبھی کبھی رہنے نہ دیا

ابھی تو ہم تھے یہیں کہیں
اور ، ابھی رہنے نہ دیا

ہم تو رہنا چاہتے تھے
آپ نے ہی رہنے نہ دیا

کبھی نکالا کوئے سے
کبھی مری رہنے نہ دیا

کیا بندریا کو سیدھی
پھر سیدھی رہنے نہ دیا

ہنومان نے بات اُلجھائی
پھر اُلجھی رہنے نہ دیا

-☆-

سارے بیٹیاں بیٹے
ہنومان کے پیٹے

دُم کے کنڈل میں ہی
سارا دھرت لپیٹے

پھیلا ہُوا ہے کیوں کر
اپنا آپ سمیٹے

چھوڑ رہا بدوئیں
مار رہا پلیٹے

ہنومان ہی اُونچا
باقی سب تھے بیٹے

بندریا کے کہنے پہ
ساتھ سوت کے لیٹے

کپڑے دھونے ہوں گے
توڑ رہے ہیں ریٹھے

چڑھ گئے راتوں رات
حلوے کدّو میٹھے

سوفے سے ہیں صُوفی
بیٹھ ہوئے ہیں سیٹھے

-☆-

لدے ہوئے دردانہ کے
پٹے ہوئے ریحانہ کے

ہنومان بھی نکلے ہیں
عاشق لیڈی ڈیانا کے

ہنومان جی کی خاطر
لاؤ سگار ہوانا کے

انتظار میں بیٹھے ہیں
اک جلوۂ جانانہ کے

ایسے ویسے نہیں ، جناب!
ہیں خالص ہریانہ کے

دال بھی کہیں نہیں ہوتی
کہیں کباب کبانہ کے

ہنومان جی ہیں شوقین
بچپن سے جگانہ کے

لاڈلے ہیں سارے بندر
نانی کے ، کچھ نانا کے

چور ہیں ، ایم این اے کے ، ظفر
ڈاکو ہیں سلطانہ کے

-☆-

جب بھی ہوئے متلاشی
نئی زمین تراشی

ہنومان جی سب کی
لیتے جائیں تلاشی

جلدی ہے صاحب کو
کرنی ہے شب باشی

ہنومان جی آئے
ہوتی ہے گُل پاشی

ہنومان برلن میں
جا کر لگے اتاشی

دیکھیں تاریکی میں
ہنومان خفاشی

داستان ہے اُس کی
اپنے صرف حواشی

ہنومان جی کی بھی
چلی نہیں بدماشی

ہنومان جی جاگے
کیجیے سمع خراشی

-☆-

صاف خدا کی مار پڑی
چہرے پر پھٹکار پڑی

ہنومان جی آتے تھے
راہ میں اک دیوار پڑی

یہی مصیبت جینے کی
ہم کو دوسری بار پڑی

جاری ہوا ہے چشمہ سا
کیا پیشاب کی دھار پڑی

ہنومان جی کو پھر آج
بجلی کی بیگار پڑی

دریا پار گئے ہنومان
رہ گئی دم اس پار پڑی

بندریا چل دی تھی اٹھ کر
رہی وہیں شلوار پڑی

دھوئے ہاتھ بندریا سے
تاش کھیلتے ہار پڑی

دل کے آئینے میں، ظفر
بندریا کی جھلکار پڑی

-☆-

تھی اتنی ناچاقی
رہا نہیں کچھ باقی

اب تو بے شرمی کو
کہتے ہیں بیباکی

رہی نہیں گھر بھر میں
کوئی پلیتی پاکی

ہنومان رکھتے ہیں
اپنا واکی ٹاکی

ہار گیا ہے گھوڑا
پکا ہوا تھا جاکی

ہنومان کہلائے
پہن کے وردی خاکی

ڈوب کے مر گئے آخر
سیکھ تو لی تیراکی

کسی کو تو خوش رکھتے
بھی ہیں آپ کے شاکی

ہنومان بستر میں
کھیل رہے ہیں ہاکی

-☆-

رہتا ہوں ہنومانوں میں
بٹا ہوا ہوں خانوں میں

سیندھ لگا کر پہنچیں گے
آپ کے خلوت خانوں میں

بجی کنجی مدرا کا روپ
ٹوٹ رہے پیمانوں میں

چھوڑ ان اُڑن کھٹولوں کو
گھوم کبھی انسانوں میں

میزبان نے لوٹ لیا
شور اُٹھا مہمانوں میں

اور حفاظت اب کیا ہو
مچھلیاں خوش ہیں چانوں میں

ڈوبے رہتے ہیں ہنومان
ناچوں میں اور گانوں میں

ملے گی رہی سہی ہنومت
کھسیں انہی دیوانوں میں

اب وہ کیا پوچھیں گے، ظفر
بیت گئی ہے بہانوں میں

☆

تھامی جب کلہاڑی
کچی لکڑی پھاڑی

چھوڑتے کو بتا کرتب
کرتے کھیتی باڑی

ساتھ ہی تھی باندریا
پاس ہی تھی اک جھاڑی

دیکھ کے سوت کا بوتھا
چیخی زور دہاڑی

ہنومان جی نے اب
چھوڑ رکھی ہے داڑھی

اپنی باندریا کو
بندھواتے ہیں ساڑھی

چھنتی ہے سب کی اب
ہنومان سے گاڑھی

جانا تھا کلکتے
جا پہنچے کیماڑی

ہنومان کی خاطر
پکوائی بھگواڑی

☆

ہر ناری پہ لٹو ہونا
اور ، پھر صاف نکھٹو ہونا

چاٹ گئے ہنومان جی سب کچھ
اچھا نہیں ہے پیٹو ہونا

پیٹ پھلاتے جانا آخر
ہوتے ہوتے مٹو ہونا

آپ کی شان کے شایاں کب تھا
یہ بھاڑے کا ٹٹو ہونا

امتحان آیا تو پڑا ہے
ہنومان کو رٹو ہونا

جب سب ہی ایسے ہیں تو پھر
بُرا نہیں کن کٹو ہونا

پیالی ہونا سبز چائے کی
یا مدرا کا گھٹو ہونا

آپ اپنی ذمّے داری پہ
ہو سکتے ہیں وٹو ہونا

ہنومان ، اچھا لگتا ہے
یوں کاندھے پہ پٹھو ہونا

☆

چاروں جانب دیکھا بھالا بندر
بندرگاہ میں کوئی نہیں تھا بندر

روٹی کیا معلوم کدھر جاتی ہے
بانٹ رہا ہے اوپر بیٹھا بندر

جس نے سب کی جان عذاب میں ڈالی
میرا بندر تھا کہ تُمھارا بندر

سامنے سے تو فرق نہیں تھا کچھ بھی
آدم زاد تھا ، مَیں نے سمجھا بندر

ہوکیں نِکال رہی تھی جہاں بندریا
وہیں پہ تھا صف باندھے کیا کیا بندر

پہلے ناچا اُلٹا ہو کے مداری
اور ، پھر اُس کے اوپر ناچا بندر

ابھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا ہے
کتنا ہے اِنسان اور کتنا بندر

دُم کٹوا کر ہی اِنسان بنے گا
ورنہ تو ایسا ہی رہے گا بندر

یہی ظفر تھا آدمی اچھا خاصا
نقل اُتاری ، اور ، کہلایا بندر

☆

سب سے اُونچا ہے ہنومان
جے ہنومان ، جے ہنومان

چُپ چُپ ، اور ، ٹُنّی ٹُنّی
یہ ہنومان ، وَے ہنومان

ایک اجنبی خواب سراب
ایک انوکھی شے ہنومان

ہو گئے سبھی مسائل حل
ساری راہیں طے ہنومان

میں نے کچھ پُوچھا تھا ابھی
کیا کہتے ہو ، اَے ہنومان

کھاتے بھی جانا دن رات
کرتے جانا قے ، ہنومان

بھیڑوں کی بدلی ہے ٹُون
کرتا ہے بھے بھے ہنومان

کاغذ اور مسالے کے
ایک روپے میں سَے ہنومان

جے جے کار کے بعد ، ظفرؔ
آخر کو ہے ہے ، ہنومان

☆

ہنومان ، سپنے میں آؤ
تھوڑی صورتیا دکھلاؤ

سچا جی ہے ، مدرا پی ہے
پُومو چاٹو ، ناچو گاؤ

بَیری سر پر آ پہنچے ہیں
تیر چلاؤ ، گُرج تھماؤ

دُم کو آگ لگا کر پھر سے
ساری لنکا کو جُھلساؤ

ہوا دیوتا باپ تُمھارا
اُڑتے آؤ ، اُڑتے جاؤ

راون کے پنجے سے چُھڑا کر
پھر سیتا کو واپس لاؤ

جلدی کیا ہے ہنومان جی
ہو جائے گا کچھ سمجھاؤ

کیسے کیسے کام تُمھارے
بندر ہو یا اُودبلاؤ

مرو گے جس دن ہنومان جی!
جی بھر کے کھائیں گے پُلاؤ

☆

بھگت بنے ہو رام کے
نہیں ہمارے کام کے

کوئی توجہ ہی نہیں
بیٹھے ہوئے ہیں شام کے

جب سورج واپس ہوا
چلے کنارے بام کے

ہنومان کے ہر طرف
کیا کیا پٹّے پام کے

بندریائیں دیکھیں تمھیں
رہ جائیں دل تھام کے

راتوں کا کیا پوچھنا
دن تو ہیں آرام کے

کبھی سوت کی سیج پہ
چلے ہیں بسرام کے

کچھ نیپالی ریچھ تھے
کچھ بندر آسام کے

دیوتاؤں کا روپ ہیں
بندر تو ہیں نام کے

☆

نسدن ٹیڑھی ہنومان کی دُم
کبھی سیدھی ہنومان کی دُم

قوسِ قزح کی صورت آتے جاتے
لہرا لیتی ہنومان کی دُم

اُس نے پھر کچھ بھی نہیں دیکھا اور
جس نے دیکھی ہنومان کی دُم

اچھی ہے، پر شاید نہیں رہی
پہلے جیسی ہنومان کی دُم

پُورم پُور اندھیرا تھا جنگل میں
اِک دم چمکی ہنومان کی دُم

آگ دکھائی تو لنکا بھر میں
کیسی گھومی ہنومان کی دُم

سب سے بھدی ہنومان کی باچھ
سب سے اچھی ہنومان کی دُم

اک ہتھیار بھی ہے یہ، یاد رہے
چابک ایسی ہنومان کی دُم

نِل نہیں نکلا تیرا بھی تو، ظفر
ہے اک تُو بھی ہنومان کی دُم

☆

ہنومان جی بڑے ہیں
دو ہی پانو پر کھڑے ہیں

دم ہے اُس کا ناک میں
جس کے پیچھے پڑے ہیں

ہرے کچور درخت میں
کیا موتی سا جڑے ہیں

ہوا چلی اور شاخ سے
کچھ پتّا سا جھڑے ہیں

کبھی اُتر بھی آئیں گے
ابھی تو چوٹی چڑھے ہیں

شکتی ہے اندر بہت
یُوں ہی سوکھے سڑے ہیں

بات اثر کرتی نہیں
ایسے چکنے گھڑے ہیں

من کی دُبدھا کے لیے
دُنیا بھر سے لڑے ہیں

چلے تو چلا کیے، ظفر
اڑ گئے ہیں تو اڑے ہیں

☆

اپنے ہونے کی سزا تھی
اُس کی ہستی اور کیا تھی

اُس نے بندر کیوں جنا پھر
انجنا جو اپسرا تھی

حبس تھا باہر تو لیکن
اندر اندر کیا ہوا تھی

ابتدا تھی ایک دُم کی
اور نہ کوئی انتہا تھی

پیڑ اُکھاڑے، گھر گرائے
اُس کی یہ بھی اک ادا تھی

پانو تھے اپنی ہی دُم پر
سر پہ اپنی ہی گھٹا تھی

اینٹ روڑے تھیں چٹانیں
قہر تھا، کوئی بلا تھی

وہ کہیں ٹِک کر نہ بیٹھا
اتنی بے چین آتما تھی

خود بھی بندر تھا، ظفر، وہ
اور، بندر اُس کے ساتھی

☆

پچھوا مارا ، پری نکل آئی
کیا موت سے زندگی نکل آئی

اُس نے پیڑوں سے مُنھ نکالا
جنگل سے روشنی نکل آئی

وہ شکل نہ تھی کبھی یہاں پر
چاہا جو اُسے ، ابھی نکل آئی

یوگا کا دیوتا ہنومان
کسرت کوئی ایک سی نکل آئی

بندر بندر ہی رہ گیا تھا
اپنی ہی کوئی کمی نکل آئی

راون کا بھائی آ مِلا ساتھ
بَیری تھا ، دوستی نکل آئی

غائب کیا چاند کو نگل کر
یہ اور بھی سنسنی نکل آئی

روتے روتے ہنسی بھی جیسے
باچھوں سے آپ ہی نکل آئی

مَیں آپ ، ظفر ، کھڑا تھا حیران
بندر کی لاٹری نکل آئی

☆

مہنگائی اتنی ، ہنومان!
تمھی نے پیدا کی ، ہنومان!

اُوپر ہی جاتے ہو ہمیشہ
بھیجو نیچے بھی ، ہنومان!

بے زبان بندر جاتی
مُنھ سے کیا کہتی ، ہنومان!

اس بن کے سنگھاسن سے
کب ہو گی چھٹی ، ہنومان!

تبدیلی آتی ہی نہیں
بن ہے وُہی ، وُہی ہنومان!

جنگل نے جکڑی کیسی
یہ بندر جاتی ، ہنومان!

باہر باہر کھلے کھلے
اندر کے قیدی ہنومان

آپ کو اُوپر پہنچایا
ہم سے بھول ہُوئی ، ہنومان!

کارن اِس حالت کے ، ظفر
کبھی ہیں آپ ، کبھی ہنومان!

☆

چاند پہ خوب جھپٹ سکتے ہو
سُورج سے بھی نمٹ سکتے ہو

اپنی آئی پہ آ جاؤ ، تو
مر سکتے ہو ، کٹ سکتے ہو

دُوسری بار اکٹھا ہو کر
پھر ٹکڑوں میں بٹ سکتے ہو

جتنا چاہو پھیل پڑو تم
جتنا چاہو سمٹ سکتے ہو

ہنومان ، اپنی مرضی سے
بڑھ سکتے ہو ، گھٹ سکتے ہو

بم کی طرح سے ہنومان جی!
کسی نگر میں پھٹ سکتے ہو

بندریا اپنی ہو کہ پرائی
اُس کے ساتھ لپٹ سکتے ہو

اوروں کو بھی گزرنا ہو گا
کیا آگے سے ہٹ سکتے ہو؟

دیر لگاتے ہی کب ہو تم
جب کہہ دیں ، جھٹ پٹ سکتے ہو

-☆-

توڑیں جنگل کی جیل اِک دن
اور ، ختم کریں یہ کھیل اِک دن

پیڑوں پہ اِسی طرح سے ہو گی
پھل پھول کی ریل پیل اِک دن

آنا جانا رہے گا نسدن
جنگل میں چلے گی ریل اِک دن

سُوکھے سر بندریاؤں کے ہیں
لاؤ کہیں جا کے تیل اِک دن

انگریزی پڑھ سکیں گے بندر
دُم کہلائے گی ٹیل اِک دن

پچھتائے ہمیں کہ اب نہ پچھتائے
ٹھو ہم دیں گے ٹھیل اِک دن

یہ ظلم نیا سہی ، مگر ، ہم
جائیں گے یہ بھی جھیل اِک دن

اونے پونے خریدنے کو
آخر تو کھلے گی سیل اِک دن

ہونا کسی پیڑ پہ ہے آخر
یہ میرا تمھارا میل اِک دن

-☆-

جو ہنومانی ہیں
سب لافانی ہیں

سُن کر اُس کی بات
پانی پانی ہیں

ہنومان اپنے
دلبر جانی ہیں

ہنومان جی اب
پاکستانی ہیں

بلکہ وہ کچھ کچھ
آغا خانی ہیں

ہنومان کے ساتھ
اُن کی نانی ہیں

بد باطن ہیں، مگر
خوش پیشانی ہیں

ہنومان اور ہم
آنی جانی ہیں

رہو ظفر سے دُور
یہ سیلانی ہیں

-☆-

بچپن ہی میں گزر گئے تھے
ہنومان جی مر گئے تھے

زندہ ہوئے دوبارہ سے
ورنہ پڑے ٹھٹھر گئے تھے

ہنومان کا حال سنائیں
آپ بھی وہاں اگر گئے تھے

پکڑے گئے تھے ہنومان جی
ہم تو کہہ کے مُکر گئے تھے

چھوٹے سے برتن تھے وہ
دیکھتے دیکھتے بھر گئے تھے

نیچے بھی موجود نہیں
چوٹی سے تو اُتر گئے تھے

ساری گھاس محبت کی
ہنومان جی چر گئے تھے

رام چندر سے سدا جوان
ہو کر آپ کدھر گئے تھے

لمبی عمر ارداس ہوئی
واپس آئے جدھر گئے تھے

-☆-

بھگتی میں بھگوان تھا
اور ، اُوپر ہنومان تھا

آدھا بندر ہی سہی
آدھا تو انسان تھا

ہنومان جی کو یہاں
دُم پر اپنی مان تھا

بھگتی واس جہاں بھی تھے
ایک اُن میں جاپان تھا

کہنا تھا مُشکل ، مگر
کرنا ہی آسان تھا

گھر ہے اپنا ہی ، مگر
اس میں کُچھ سامان تھا

وہ بھی سمجھ نہ پائے تھے
مَیں بھی کُچھ حیران تھا

جو کٹوا کر آئے ہو
ناک نہیں تھی ، کان تھا

فیصلہ جلدی کیجیے
میرا بھی بیان تھا

-☆-

اِدھر اُدھر بھی جاتے ہو
اپنے گھر بھی جاتے ہو؟

پھر جینے کو ، ہنومان
گویا مر بھی جاتے ہو

رہتے ہو خالی خالی
آخر بھر بھی جاتے ہو

پانی سا رہتے ہو رواں
اور ، ٹھہر بھی جاتے ہو

چوٹی پر بیٹھے بیٹھے
کبھی اُتر بھی جاتے ہو

اُڑنا بھی آتا ہے تُمھیں
قدموں پر بھی جاتے ہو

بھوکے بھی رہتے ہو بہت
اور ، اپھر بھی جاتے ہو

ہو آتے ہو پڑے پڑے
اور ، اُٹھ کر بھی جاتے ہو

تپتے بھی رہتے ہو ، ظفر
کبھی ٹھٹھر بھی جاتے ہو

-☆-

ہنومانی اشارہ ہو رہا ہے
کہ جھگڑے کا نتارہ ہو رہا ہے

ہنو جی ناشتہ فرما رہے ہیں
سو ، پیٹ اُن کا غبارہ ہو رہا ہے

جو پہلے ہو چکا بَن میں کئی بار
وہی سب کچھ دوبارہ ہو رہا ہے

توجّہ ہی نہیں کرتا ہے کوئی
ہنومت پارہ پارہ ہو رہا ہے

کہیں چپکے ہوئے ہیں بھوک سے پیٹ
کسی جانب اپھارہ ہو رہا ہے

یہ سب اشیائے خورد و نوش پر کیوں
ہنومانی اجارہ ہو رہا ہے

ہمیں بھی اصل بات اک دن بتائیں
یہ تھوڑا ہے کہ سارا ہو رہا ہے

ہمارے نام پر ہی کیوں ، ہنومان
دھڑن تختہ ہمارا ہو رہا ہے

نکلنا چاہتے ہیں کیوں یہاں سے
اگر بَن میں گزارہ ہو رہا ہے

-☆-

ہنومان ہرجائی سے
پھرتے ہیں سودائی سے

سازباز کی ہے کیسی
راون جی کے بھائی سے

امن پسند بھی ہیں ، لیکن
ڈرتے نہیں لڑائی سے

رائے بدل بھی لیتے ہیں
آپ لگائی بجھائی سے

ساری بات ہوئی معلوم
ہنومان کی تائی سے

ہنومان کی نکلی دُم
اتنی بڑی کھدائی سے

اور نہ تھی صورت کوئی
پھانسی لی نکٹائی سے

عزت رہی ہتھیلی پر
ڈرے نہیں رُسوائی سے

فرق پڑا کچھ بھی نہ ، ظفر
اتنی حال دُہائی سے

-☆-

ہر آن ہنومان
پردھان ہنومان

یہ شور شرابہ
یہ شان ، ہنومان

سب سو گئے ہو کے
مہمان ، ہنومان

اتنے بھی نہیں ہیں
انجان ہنومان

باچھوں میں لہو ہے
یا پان ، ہنومان

پھیلاؤ ہے دُم کا
زروان ، ہنومان

بھگتی کا ہے اک بھیس
بھگوان ، ہنومان

مرتی ہے رعایا
اے خان ہنومان

چوٹی پہ کھڑا ہے
حیران ہنومان

-☆-

سب کے ساتھ ہی بھاگے ہو
لیکن سب سے آگے ہو

موڑ نہیں سکتا کوئی
ایسے ہی بے باگے ہو

ایک بندریا کے پیچھے
سارے بَن کو تیاگے ہو

پہلے تو نہیں تھے ایسے
جیسے ہم کو لاگے ہو

چلتے ہوئے ہل ہو ، ہنومان
پھرتے ہوئے سُہاگے ہو

یہ بھی بڑا غنیمت ہے
کسی تو سُر میں راگے ہو

لہر لہر چلتے پھرتے
جا ساحل پہ جھاگے ہو

کائیں کائیں سی ہے من میں
بندر ہو یا کاگے ہو

ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہو ، ظفر
ایسے کچے دھاگے ہو

-☆-

بدلے جنگل کا قانون
تم رہ جاؤ ہنامون

چھدرے سے بالوں کے بجائے
اب تو اُگنے لگی ہے اُون

پیٹ میں چوہے دوڑتے ہیں
پھیلے گا بَن میں طاعون

سب کچھ ہے معلوم انھیں
ہنومان ہیں افلاطون

دیکھتے دیکھتے پل بھر میں
ہنومان کی بدلی جُون

ظاہر ہوئے ہیں ڈھاکے میں
ابھی ابھی تھے ڈیرہ دون

ایک چھلانگ میں پہنچے ہیں
پیڑ کی چوٹی سے رنگون

صاحب آخر صاحب ہے
ہنومان پہنیں پتلون

ہنومان ہی کے یہ بھیس
کھوسے ، پیر ، ٹوانے ، ٹون

☆

آپ تو ہیں چار دانگ
پھر یہ کیوں بھرتے ہیں سوانگ

ہنومان مرغے ہوئے
صبح کو دیتے ہیں بانگ

بندریا سے رات دن
کھیلتے ہیں پنگ پانگ

سُن رہے تھے داستاں
ٹانگ پر رکھی تھی ٹانگ

یاد ہے سب کو ابھی
چاند پر تیری چھلانگ

جو اکڑتا ہے ذرا
آپ اُسے دیتے ہیں ٹانگ

سارا جنگل اُس کا ہے
جس کے ہو کاندھے پہ ڈانگ

چھین سکتا ہے تو چھین
چھوڑ یہ سب مانگ تانگ

ہوش آئے کیا ، ظفر
رات دن پیتے ہیں بھانگ

☆

گھوڑ بازاری ہے کیا
یہ خریداری ہے کیا

یہ ہنومانی ہے کیوں
یہ چھپےداری ہے کیا

یہ رعایا آپ پر
اس قدر بھاری ہے کیا

اس قدر جلسے جلوس
رات دن خواری ہے کیا

بےزری کیا چیز ہے
اور ، بےکاری ہے کیا

بے اماں ہونا ہے کیوں
اور ، بیماری ہے کیا

اتنی مجبوری کے ساتھ
اتنی لاچاری ہے کیا

بھوسلا پن کیا رہا
اور ، نسواری ہے کیا

سارے تن پر یہ ، ظفر
خوف سا طاری ہے کیا

☆

پہنے ہوئے وہ گہنے سے
لگی ہوئی ہے ٹہنے سے

ہنومان کب مانتے ہیں
ایک ہمارے کہنے سے

بالوں پر خوش ہیں ہنومان
کپڑے سے کچھ پہنے سے

لنکا پل میں ڈھیر ہوئی
کچھ جلنے ، کچھ ڈھہنے سے

نرک میں جانا بہتر ہے
اس جنگل میں رہنے سے

یوں ہی گزارہ ہوتا ہے
کچھ کہنے ، کچھ سہنے سے

بائیں طرف بھی لگتے ہیں
ہنومان جی دہنے سے

کرتے رہے شکایت ہی
دیتے رہے اُلہنے سے

پربت ہی اچھا ہے ، ظفر
یوں پانی سا بہنے سے

☆

ایک سے ہے دو تین
ہنومان کی تین

قید میں راون کی
ٹھہرے بہت مہین

ہمیں ڈرانے کو
کھڑکاتے ہیں ٹین

رکھے تھے سر پہ ہیٹ
پہنے ہوئے تھے جین

ایک چھلانگ سے ہی
جا پہنچیں گے چین

ہنومت پہ ایمان
یہی ہے اپنا دین

تھامے ہوئے ہیں باگ
کسے ہوئے ہیں زین

ہنومان کی ہے
بگڑی ہوئی مشین

مانگنا ہے بےکار
آگے بڑھ کر چھین

☆

رٹے ہوئے کچھ ہوتے ہیں
ہنومان جی توتے ہیں

دادا بھی ہو گا کوئی
جس بندر کے پوتے ہیں

ہنومان جی ہم نے آج
ہل کے آگے جوتے ہیں

ہنومان ہیں جریانی
کھڑے کھڑے ہی چوتے ہیں

لگتے ہیں اچھے اُس دن
جس دن سر مُنہ دھوتے ہیں

ہنستے ہیں کھیں کھیں کر کے
بھوں بھوں کر کے روتے ہیں

آپ ہی جانتے ہیں ہنومان
گھوڑے ہیں یا کھوتے ہیں

لسی مکھن کی خاطر
دُم سے دُودھ بلوتے ہیں

دو ہی کام اُن کے ہیں ، ظفر
کھاتے ہیں ، اور ، سوتے ہیں

☆

کھا کر سب کا حق
رنگ ہے پھر بھی فق

شکوا ہُوا وجُود
پھیلا ہُوا اُفق

قافیہ ہے محدود
اور ، مضمون اَدق

دیکھ کے بن کا حال
ہُوا کلیجا شق

چودہ ہوں یا چار
روشن ہُوئے طبق

ہنومان کو بھی
آخر ہُوا قلق

دُم کے نیچے کیا
پُھوٹ رہی ہے شفق

بَن کے یہ دن رات
گھوڑا ہیں ابلق

یاد آئے ہیں آج
کیوں حاجی لق لق

-☆-

آگے جاؤ تو ہرا
پیچھے دیکھو سو ہرا

یہاں کھپت ہے اس قدر
جتنا ہے ، لاؤ ہرا

ہاتھ لگائے پنا ہی
کتنا ہے دیکھو ہرا

چلے جاؤ ، بَن کو اگر
رکھ نہیں سکتے ہو ہرا

ہنومان ہے ، اس لیے
ہنومان کو دو ہرا

بَن سے اُٹھتا ہے دُھواں
تُم اُس کو بھی کہو ہرا

ساون کا اندھا ہُوں مَیں
آئے نظر مُجھ کو ہرا

یہ پیلا بھی وہی ہے
اِسے اگر سمجھو ہرا

کبھی نہ سُوکھے جو ، ظفر
ہنومان ہے وہ ہرا

-☆-

کرتے کرتے غُل
دے جائیں گے جُل

شب بھر پتوں میں
رہی بہت ہل چل

ہنومان اپنے
جنگل کی ٹیبل

ہنومان غرورے
توڑ گئے ہیں پُل

سچ پہ لیٹتے ہی
کر دی بتی گُل

آدھی بوتل سے
ہنومان جی فُل

ہنومان جی کے
پاپ گئے سب دُھل

رہ گئے ہیں پتے
کہیں نہیں پھل پھل

ڈٹ گئے سامنے وہ
میں بھی گیا ہوں ٹُل

-☆-

بیٹھے ہوئے لگا کر ٹیک
ہنومان کھاتے ہیں کیک

کچا کچھ بھی نہیں کھاتے
آپ ہی کر لیتے ہیں بیک

سورج جب سر پہ آیا
ہنومان کو پہنچا سیک

ہنومان اصلی ہوں گے
ہم کو تو لگتے ہیں فیک

بیڑی سے آغاز کیا
اب پیتے ہیں گولڈفلیک

پیسا تو رہتا ہی نہیں
ہوں جیسے ہاتھوں میں چھیک

چھانو میں سوئے ہی رہتے ہیں
آپ لگائی تھی یہ دھریک

آپ جدھر سے بھی دیکھیں
ہنومان جی ہیں موزیک

شہرت جیسی بھی ہو، ظفر
ہنومان ہیں بندے نیک

-☆-

پتّی کو دیکھا تو جھٹ
ہنومان بھاگے سرپٹ

پڑے پڑے بڑھ جاتے ہیں
کھڑے کھڑے جاتے ہیں گھٹ

ریڑھی کا بنیان فروش
اب پتّی ہے بھولا بٹ

ہنومان جی نے آخر
بھیڑ دیے ہیں مَن کے پٹ

کھاتے رہے اگر یوں ہی
ہنومان جائیں گے پھٹ

بیٹھ کے اوپر ہی ہنومان
سب کچھ کر جاتے ہیں چٹ

چپکے سے آ جاتے ہیں
ہوتی نہیں کوئی آہٹ

فارسی بولتے ہیں سب سے
ہنومان ایران پلٹ

چلو ، اکھاڑ کے لے آئیں
ہنومان جی کی چوکھٹ

☆

تفاوت

یہاں کے ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سُنا ہو گا کبھو شیون ہمارا
(میر)

پیرتے پھرتے یہ دل میں کبھی دالان میں ہاتھ
کِس پری چہرہ کے رہتے ہیں مرے دھیان میں ہاتھ

آئے دن ہوتی ہے اک تازہ تڑپ ہونٹوں پہ
روز رہتے ہیں نئے ہی کسی ہیجان میں ہاتھ

رات سے دُور اُلجھتے ہیں کِسی خواب سے پانو
دھوپ کے ساتھ بکھرتے ہیں بیابان میں ہاتھ

آستینوں سے اُسی طرح لٹکتے رہے پھول
جیسے بے فائدہ کھلتے رہے گلدان میں ہاتھ

خود ہی پھیلی ہے یہ رُسوائی ، کِسی کا ، ورنہ
داستاں میں نظر آتا ہے نہ عنوان میں ہاتھ

مجھ سے منسوب تو کر سکتے ہیں کوشش کوئی
یعنی ہو سکتا ہے میرا کِسی اِمکان میں ہاتھ

کیا کہیں ، نقلِ مکانی ہُوئی ممکن کیوں کر
اب نکل آئے ہیں باندھے ہُوئے سامان میں ہاتھ

ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا تھا جہاں
تھے اندھیرے میں بھی اُس کے مری پہچان میں ہاتھ

صبح کو روک رکھا تھا کہیں اُس نے بھی ، ظفر
ہم نے بھی ڈال دیا اُس کے گریبان میں ہاتھ

-☆-

مُحسن احمد شیرازی کے نام

یہ جہاں آدھا فقط آہنگ سے پیدا ہُوا
اور ، جو باقی بچا وہ رنگ سے پیدا ہُوا

آنسوؤں کی تیز بارش میں جو وا رہتا تھا دل
باغ سا اس آئنے میں زنگ سے پیدا ہُوا

جس نے ٹھنڈک ڈال دی تھی سینۂ خس میں کبھی
اک شرر ایسا بھی اُس کے سنگ سے پیدا ہُوا

سامنے تو آئے گا دل سے نِکل کر وہ کبھی
یہ بھی اِمکاں اِس مکانِ تنگ سے پیدا ہُوا

ایک مُہلت اپنی وارفتہ مزاجی سے مِلی
ایک موقع اُس کے عذرِ لنگ سے پیدا ہُوا

چھوڑ دی میں نے بھی اُس کی بڑھی پر خوئے عجز
امن آخر میری اُس کی جنگ سے پیدا ہُوا

عزت افزا تھے ہیئت خاشاک گُمنامی کبھی
شعلۂ رُسوائی نام و ننگ سے پیدا ہُوا

کِس نے سمجھا جو کبھی نایاب کے اندر تھا ، اور
کِس نے دیکھا جو کبھی نیرنگ سے پیدا ہُوا

سب کچھ اُس نے نیست و نابود کر ڈالا ، ظفرؔ
اک سخن ایسا بھی میرے ڈھنگ سے پیدا ہُوا

-☆-

اے میرے ہوا ساری دُنیا کے رب
تُو اِن لوگوں کے دن بدلے گا کب

اندر باہر اک ہوا چلی جس دن
اور چھوٹے بچے پھول کھلیں گے جب

تھا پھر بھی ایک سوال ابھی باقی
جب کوئی بات نہ رہی جواب طلب

وہ اِک شعلہ سا درمیان میں گُم
اور کُھلتے ہوئے لبوں کے اندر لب

جب ایک طرح سے تم نایاب ہُوئے
آ پڑی ضرورت مُجھے تُمھاری اب

کیا جُرم تھا وہ آگے کی اور نکلنا
پیچھے ہی پڑ گئے میرے سب کے سب

ہوتا ہے لفظ کے اندر بھی اِک لفظ
ہر بات کا اور بھی ہوتا ہے مطلب

اب ہیں تو ہمارا کوئی سُراغ نہیں
جب نہیں رہیں گے پتا چلے گا تب

کیا ہم ، اور کیا ہے اپنا شعر ، ظفرؔ
یُوں ہی شرمندہ کرتے ہو ، صاحب

-☆-

اگر مُنھ نہ موڑو ہماری طرف
تو دیکھیں گے ہم کیا تُمھاری طرف

یہاں دُوسرے بھی جو موجُود ہیں
تو کیوں گھیر رکھی ہے ساری طرف

گھما کر پڑے گا اُسے دیکھنا
کہ ہے کون سی سب سے پیاری طرف

دہائی کِسی روز اپنے لیے
کبھی اُس کی خاطر اُبھاری طرف

ہم اُس کے طرفدار جب سے ہُوئے
ہُوئی ساری طرفوں سے عاری طرف

ہرا ہونے والا ہے موسم ابھی
کہیں اُگنے والی ہے کیاری طرف

کبھی رُک گئی تھی جو آغاز میں
وُہی آج ہوتی ہے جاری طرف

خُدا نے فلک سے ہمارے لیے
یہ ہے کِس طرف سے اُتاری طرف

ظفر، ہم نے بھی اتنے اطراف کے
کہیں بیچ میں سے گُزاری طرف

☆

جھگڑے کُچھ اس طرح سے کہ جھگڑا کِیا خراب
اپنا مُقدمہ وہاں ایسا کِیا خراب

آبادکار خواب تھے اپنے تئیں بہت
ہم نے تو اور بھی یہ خرابہ کِیا خراب

خُود تو ہُوئے خراب کِسی اپنی لہر میں
اور، اپنے ساتھ ایک زمانہ کِیا خراب

رکھتے تھے زاویہ ہی کُچھ ایسا نگاہ کا
ہم نے خُود اپنے آپ تماشا کِیا خراب

کُچھ لوگ بھی ہمارے موافق نہ تھے بہت
کُچھ آپ نے بھی کام ہمارا کِیا خراب

بیٹھے ہیں اب جناب سے کیسے جُڑے ہُوئے
کل ہی جنھوں نے آپ کا جلسہ کِیا خراب

اِک تو بہار خواب کے پیچھے جہاں تہاں
کیا کیا نہ ہم نے اپنا بُڑھاپا کِیا خراب

لفظوں کو زندہ کرنے کی بے سُود سعی میں
ہم نے بالآخر اپنا ہی مُردہ کِیا خراب

ماحول شاعری کا کُچھ اچھا نہ تھا، ظفر
اُوپر سے اس کو ہم نے زیادہ کِیا خراب

☆

جھوٹ سچ کو دیکھ لیتے ، یہ تمھارا کام تھا
بات سُن لیتے کبھی ، اتنا ہی سارا کام تھا

کُچھ فرائض تھے تمھارے بھی ، ادا کرتے اگر
ہم نے تو کر ہی دیا جو کُچھ ہمارا کام تھا

کُچھ تمھیں زحمت اسی خاطر نہیں دی ہے بہت
اندر اندر کا نہیں تھا ، بس کنارہ کام تھا

ہم یہاں تھے ، اور ، وہاں پر ہو گیا ہے اپنے آپ
اس دفعہ اتنا ہی تھا ، اور ، استعارہ کام تھا

یہ غنیمت ہے کہ ہم دونوں سلامت رہ گئے
ورنہ اپنے سامنے سب پارہ پارہ کام تھا

پاس آ کر ہونے والا ہی نہیں تھا سر بسر
دُور سے جو جھلملاتا تھا ، ستارہ کام تھا

اُس میں تھا اب تک پڑے رہنا ہمارا بھی عجب
اتنا اچھا بھی نہیں تھا ، بس گزارہ کام تھا

ہم نے اپنے ہی خس و خاشاک تک رکھا اُسے
وہ کُچھ اپنی طرز کا ایسا شرارہ کام تھا

اُس کے ساتھ اتنی شرافت سے نہ پیش آتے ، مگر
یہ ضروری تھا ، ظفر ، اُس سے دوبارہ کام تھا

-☆-

یُوں تو دیوار ہوا کے ساتھ سارا خواب ہے
فاصلہ اُتنا ہی طے کرنا ہے جتنا خواب ہے

یہ کہیں ہوتے تو ظاہر بھی ہُوا کرتے کبھی
دل سراسر واہمہ ہے ، اور ، دُنیا خواب ہے

چاہتے ہیں ، اُس کو دل کی ساری گہرائی سے ہم
اس میں بھی آدھی خبر ہے ، اور ، آدھا خواب ہے

دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہونا ہمارا جو بھی ہو
اس میں ہے کتنی حقیقت ، اور ، کتنا خواب ہے

خواب سے آگے بھی ہے خوابوں کا ہی اک سلسلہ
دیکھنے والوں کی خاطر کیسا کیسا خواب ہے

شور ہے جتنا بھی دریائے محبت کا ، مگر
اس میں تھوڑی اصلیت ہے ، اور ، زیادہ خواب ہے

دُھند ہے ، اور ، دُھول ہے ، اور ، ابر ہے چاروں طرف
راستوں پر میں نہیں ، اک چلتا پھرتا خواب ہے

رفتہ رفتہ خواب کتنے ہی پریشاں ہو گئے
اور ، ان آنکھوں میں دیکھو ، اب بھی کیا کیا خواب ہے

اک نہ اک دن مہرباں ہو گا وہ ہم پر بھی ، ظفر
کُچھ ہمارا وہم ہے ، کُچھ یہ ہمارا خواب ہے

-☆-

دُور آیا تو مہکنے کی صدا آئی مجھے
پھر کسی فصل کے پکنے کی صدا آئی مجھے

شور میرا تو کسی طور نہ پہنچا اُس تک
اور، اُسے دیکھ نہ سکنے کی صدا آئی مجھے

حوصلہ مجھ میں بہت تھا، مگر اُس کے آگے
بار بار اپنے جھجکنے کی صدا آئی مجھے

دل کسی اور طرف تھا، مگر ایسے میں کسی
اور جانب سے دھڑکنے کی صدا آئی مجھے

میں بہت دیر سے بیٹھا تھا کہیں آئنہ سا
دفعتاً اُس کے جھلکنے کی صدا آئی مجھے

میرے باہر بھی اندھیرا تھا، مرے اندر بھی
تب کسی شے کے چمکنے کی صدا آئی مجھے

غل غپاڑا مری ہر سمت بپا تھا، لیکن
کئی بار آنکھ جھپکنے کی صدا آئی مجھے

سو رہا تھا تو مجھے وہم تھا جاگ اُٹھنے کا
چل رہا تھا تو اٹکنے کی صدا آئی مجھے

تازہ دم تھا، مگر، آغازِ سفر ہی میں، ظفر
ہر طرف سے مرے تھکنے کی صدا آئی مجھے

-☆-

جہاں بھی میرا نشاں تھا وہاں اُڑی مری خاک
وُہی رہا مرا سودائے سر وُہی مری خاک

اسی نواح میں پہچان تھی کبھی مرا خوں
مری شناخت ہے اس شہر میں کبھی مری خاک

ملا ہے سب کو یہی اضطراب تہ در تہ
کہ میری خاک میں تھی اور بھی کوئی مری خاک

میں سو رہا تو بہت دُور ایک فاصلے پر
غبارِ خواب کی صورت مجھے ملی مری خاک

کسی بہانے ترے پانو چومنے کے لیے
تری گلی میں بھی تھوڑی سی رہ گئی مری خاک

بگولا بن کے رواں ہیں کہاں کہاں دونوں
یہی خیال ہے میرا، جو ہے یہی مری خاک

کسی کا بھی مرے بکھراو میں نہیں کوئی دخل
کہ اپنے ساتھ ہی لائی ہے دربھی مری خاک

پڑی تھی مجھ پہ کسی ماہ وش کی ایک جھلک
چمک رہی ہے جو اس طرح آج بھی مری خاک

ہیں گرد گرد مناظر مرے سبب سے، ظفر
کچھ آسمان پہ بھی جیسے جا پڑی مری خاک

-☆-

ہے بظاہر تو کافی اچھا مال
کھول کر دیکھیے ، ہے کیسا مال

دام پُورے اگر لیے ہیں تو پھر
کیوں نہیں دے رہے ہو پُورا مال

بوجھ کم کر لیا کرو کچھ تو
لیے پھرتے ہو ساتھ اتنا مال

قیمت اُتنی ہی کم پڑے گی یہاں
لاؤ گے جس قدر زیادہ مال

آخر اُس کی پرکھ بھی ہونی ہے
وہ ہمارا ہو یا تمھارا مال

کبھی ہم بھی ہوں مُستفید ان سے
تُم ہو جن خُوبیوں سے مالا مال

ہم نیا ہی اُسے سمجھتے ہیں
یہ جو ہے اس قدر پُرانا مال

پیڑ پودے تو کیا پنپ سکتے
ہو گئی اگلی گھاس بھی پامال

گفتگو خوب ہے ، ظفرؔ ، لیکن
ہوتے اچھے جو آپ کے اعمال

☆

اب سُوجھتی ہے سمت ستارے بغیر بھی
چلتا ہے اپنا کام تُمھارے بغیر بھی

چلنا ہے ایک مُردہ محبت کے پیش و پس
کاندھے سے اب یہ بوجھ اُتارے بغیر بھی

جب صبر آ گیا تو بس آ ہی گیا مجھے
آدھے بغیر ہی نہیں ، سارے بغیر بھی

دیوار درمیاں میں اُٹھانی پڑی مجھے
اب تک تو جی رہا تھا سہارے بغیر بھی

خس تھا سو ، میری اپنی تپش میرے کام آئی
مَیں سُرخرُو ہُوا ہُوں شرارے بغیر بھی

پڑھتا ہُوں اُس کی شکل پہ لکھی ہر ایک بات
سب کُچھ سمجھ رہا ہُوں اشارے بغیر بھی

اب ڈوبنے کا صرف ارادہ ہی چاہیے
ممکن ہے اب یہ کام کنارے بغیر بھی

مرنے کے بعد بھی کئی جیتے ہیں ، اور ، یہاں
مرتے ہیں لوگ عُمر گُزارے بغیر بھی

تا شاعری میں ہم ہی یگانہ نہ تھے ، ظفرؔ
جاری رہے گا کام ہمارے بغیر بھی

☆

کسی صبح سفر کی شام کرنا چاہتا ہوں
اٹھا ہوں سو کے، اب آرام کرنا چاہتا ہوں

محبت کی مشقت کے لیے بھی ہوں میسّر
بہت فارغ ہوں، کوئی کام کرنا چاہتا ہوں

میں خود موجود رہنا چاہتا ہوں درمیاں میں
میں اس آغاز کا انجام کرنا چاہتا ہوں

رہا ہوں گوشہ گیر اپنے ہی اندر آج تک میں
کہیں باہر بھی کچھ بسرام کرنا چاہتا ہوں

کہیں انجیر کو املی بنا دینے کی دھن ہے
کہیں اخروٹ کو بادام کرنا چاہتا ہوں

کوئی اچھی نہیں لگتی ہے یہ ترتیب مجھ کو
جو باغیچہ ہے اُس کو بام کرنا چاہتا ہوں

جو منت سے نہیں مانا تو پھر اے خواہشِ وصل
اب اُس کو رعب سے کیا رام کرنا چاہتا ہوں

لباسِ خاک و خاکستر کہ اب زیبِ بدن ہے
اسی کو جامۂ احرام کرنا چاہتا ہوں

ظفر، خود کر چکا ہوں جن اصولوں سے بغاوت
اُنھی کو رفتہ رفتہ عام کرنا چاہتا ہوں

☆

تھک ہار کے رُکنا کہ لگاتار میں چلنا
آسان مجھے لگتا ہے زنہار میں چلنا

درپیش ہے کب سے سفرِ ہالۂ ہستی
اک عمر سے ہے اپنے ہی آثار میں چلنا

خود ہی قدم اُٹھیں گے، ذرا دیکھتے جاؤ
اس طرح کا چلنا ہے طلب گار میں چلنا

پھولوں کی رُکاوٹ ہے، کبھی دُھند کی دیوار
مشکل ہے وُہی خوابِ گراں بار میں چلنا

کھلنا وہ اُمڈتے ہوئے بادل کا برس کر
اور ایک نمی کا در و دیوار میں چلنا

ایسی یہ محبت کی مسافت ہے کہ جس میں
اکثر ہی پڑا ہے مجھے ناچار میں چلنا

یہ ہم قدمی خوب ہے، جیسی بھی ہے اب تک
اقرار میں چلنا کبھی انکار میں چلنا

گنجان ہوا ہے، کبھی سرسبز معانی
الفاظ میں رہنا ہے کہ اشجار میں چلنا

اسرار بہت ہیں، ظفر، اس نفع و ضرر کے
دیکھو ابھی اس گرمیِ بازار میں چلنا

☆

میرے کی بدولت نہ تمھارے کی بدولت
یہ خواب ہے، قسمت کے ستارے کی بدولت

راتیں بڑی مشکل سے بسر ہونے لگی ہیں
اک شام ترے ساتھ گزارے کی بدولت

اُمید کی اک فصل کھڑی ہے مرے اندر
شاید کسی باہر کے اشارے کی بدولت

پائی ہے محبت کہیں کھونے ہی سے، اے دل!
یہ سارا منافع ہے خسارے کی بدولت

میرے خس و خاشاک میں دل کا یہ دہکنا
روشن ہوں اسی ایک شرارے کی بدولت

کھڑکی سی کوئی اور کھلی ہے کسی جانب
آنکھیں تو ہوئیں بند نظارے کی بدولت

نزدیک تو آنا ہی نہیں تھا کہیں اس نے
کچھ اور ہوا دور پکارے کی بدولت

بچ نکلا ہوں پُرپیچ بھنور سے تو کسی طور
اب ڈوبنے والا ہوں کنارے کی بدولت

دیوار کو بھی ساتھ، ظفر، لے کے گرا ہوں
قائم تھا ابھی تک تو سہارے کی بدولت

☆

زمیں ششدر تھی، اور، برباد ہونا ہو چکا تھا
کہ اب تک جو بھی کچھ پایا تھا، کھونا ہو چکا تھا

کوئی تھا اور بھی موجود ہم دونوں سے ہٹ کر
کہ میرے سامنے منظر تکونا ہو چکا تھا

مصیبت اب مرے اوپر سے آئی ہے کہ آخر
جو میرا اوڑھنا تھا وہ بچھونا ہو چکا تھا

ہوا ٹھہری ہوئی سی، لوگ اکتائے ہوئے سے
مرے جانے سے پہلے رونا دھونا ہو چکا تھا

کوئی بھی چارۂ کار اب نہ تھا باقی کہ اب تو
کسی شے کا کسی شے میں سمونا ہو چکا تھا

طبیعت میں کئی رنگ اور ظاہر ہو رہے تھے
کہ ہنسنا ہو چکا تھا اور رونا ہو چکا تھا

مری آنکھیں نہیں کھلتی تھیں، کیسی نیند تھی وہ
کہ سورج سر پہ آ پہنچا تھا، سونا ہو چکا تھا

معانی کے گل و گلزار ہو جانے سے پہلے
لہو کے ساتھ لفظوں کا بھگونا ہو چکا تھا

ظفر، کیا کیمیا گر ہو کہ جاتے ہی تمھارے
یہ مٹی میں سبھی تبدیل سونا ہو چکا تھا

☆

مشکل تھا کسی اور حوالے سے چمکنا
ہے میرا مقدر ترے ہالے سے چمکنا

دل پر جو یہ رونق ہے تو ہے داغ کے دم سے
ثابت ہُوا اس دشت کا لالے سے چمکنا

شب کا سفر آسان بنا دیتا ہے یکسر
رستے کا مرے پانو کے چھالے سے چمکنا

زلفوں کے اندھیرے میں جھلکتی کوئی بجلی
رُخسار کا وہ کان کے بالے سے چمکنا

ہونٹوں کا مہکنا وہ کسی موج ہوا سے
چہرے کا ذرا اور دوشالے سے چمکنا

اپنی ہی نظر ریت پہ رکھنے سے لرزتی
اپنا ہی لہو خاک پہ ڈالے سے چمکنا

دن سے جو نہیں منظرِ تاریک میں ہلچل
اس کا ہے کسی اور اُجالے سے چمکنا

برسات کی اس رات کی ہے آخری اُمید
پل بھر کے لیے ہی سہی ، ژالے سے چمکنا

نغمے کا سرِ شام وہ بُجھنا ، ظفر ، اک دم
پھر ، ساری فضا کا مرے نالے سے چمکنا

☆

اقرار میں جھلمل کبھی اِنکار میں جھلمل
دونوں ہی طرح سے رہی رفتار میں جھلمل

ہونٹوں سے ہویدا ہُوا دانتوں کا چمکنا
بجلی سے ہُوئی ابرِ گراں بار میں جھلمل

اک اُس مہِ تاباں کے گزرنے سے سرِ شام
کیسی ہُوئی جاتی ہے یہ بازار میں جھلمل

بکھرا تھا کہیں ٹوٹ کے اک سوچ ستارہ
رہتی ہے کسی خاکِ خبردار میں جھلمل

جھمک ہُوئی ، اور ، بعد میں بھی دیر تک اتنی
ہوتی رہی در میں کبھی دیوار میں جھلمل

اک بار ان اندھیروں میں جو چہرہ وہ چمک جائے
رہتی ہے کئی دن مرے آثار میں جھلمل

پانی کی لپک تو وُہی پہلی سی ہے ، لیکن
اس پار میں جھلمل ہے نہ اُس پار میں جھلمل

ایسی تو پھری تھی نہ سخن پہ یہ سیاہی
ہوتی نہیں کیوں اب مرے افکار میں جھلمل

مندے میں تو بکتا ہے وُہی مال کہ جس سے
پیدا ہو ، ظفر ، چشمِ خریدار میں جھلمل

☆

ہوا نہ ہو بھی تو شام و سحر لرزتا ہوں
کہ جڑ پکڑتا ہوں میں جس قدر لرزتا ہوں

اگر یہ اُس کی محبت نہیں تو ڈر بھی نہیں
کچھ اور ہے جو اُسے دیکھ کر لرزتا ہوں

ابھی وہ خوابِ حیا مجھ سے دور تر ہے، مگر
ابھی میں اُس سے بہت بے خبر لرزتا ہوں

کبھی گزر ہی نہ ہو بیشک اس طرف سے ترا
دیا ہوں ، اور ، تری راہ پر لرزتا ہوں

رواں دواں کوئی جھکڑ مرے وجود میں ہے
سنبھالتا بھی ہوں خود کو ، مگر ، لرزتا ہوں

ہوں ایک اور بھی، اور، اُس کے پاس جا کر میں
کسی خیال سے باہم دگر لرزتا ہوں

بس ایک گوشۂ تنہائی ہے مجھے کافی
اُدھر کوئی نہیں ہوتا جدھر لرزتا ہوں

یہ تھرتھری یہاں پھیلائی تھی کبھی میں نے
تو کچھ عجب نہیں خود بھی اگر لرزتا ہوں

جو دن کو اور طریقے سے کانپتا ہوں ، ظفر
تو اور طرح سے میں رات بھر لرزتا ہوں

☆☆

کچھ اب تو آب و ہوا چاہیے کہیں نئی ہو
یہ آسمان پُرانا سہی ، زمیں نئی ہو

کریں اگر مری توفیق میں اضافہ نیا
وہاں کی کوئی آئے تو وہ کمی نئی ہو

کچھ اور طرح کی ہو اس دفعہ محبت بھی
بچے کھچے مرے دل میں ہما ہمی نئی ہو

یہ بیج پھوٹ بھی سکتا ہے خوابِ ہستی کا
اگر ذرا سی مری خاک میں نمی نئی ہو

نہ اس طرح کا ہو جینا نہ اس طرح مرنا
نئے نواح میں شادی نئی ، غمی نئی ہو

نیا معاہدۂ ربط و ضبط ہو تحریر
لہو میں روشنی ، لوگوں میں ہمدمی نئی ہو

ملے کچھ اور ہی تعبیر تازہ تر کی نوید
بتائے کُہنہ کی اس بار دلبری نئی ہو

زمینِ شعر مرے لمس کی رہے محتاج
میں اس کو ہاتھ لگاؤں جہاں ، وہیں نئی ہو

مجھے کسی نئی دُنیا کی آرزو ہے ، ظفر
میں یہ بھی چاہتا ہوں وہ کہیں کہیں نئی ہو

☆☆

ختم ہو گئی ساری چائے
اور پیو گے کتنی چائے

پیتے پیتے گر گئی اپنے
اُوپر تیز ، اُبلتی چائے

پڑی ہے اپنی اپنی سب کو
کیسا کیک اور کیسی چائے

لمبے سے بوسے کے علاوہ
چاہیے ایک پیالی چائے

اُس نے مُنہ ہی جلایا اپنا
پیار کی جس نے چکھی چائے

جلدی بھول نہیں سکتے ہیں
بُرا وقت اور اچھی چائے

جو لسی پینے والا تھا
سامنے اُس کے رکھی چائے

عادت ہی پوری کرنی ہے
لے آؤ ، ہے جیسی چائے

جانِ ظفر ، درکار ہے اب تو
میٹھی بات اور پھیکی چائے

☆

غیر مانوس ، نئی ، اور طرف سے آتا
میں تری سمت کسی اور طرف سے آتا

تُو اگر روک نہ دیتا مجھے آنے سے تو میں
اور کچھ روز ابھی اور طرف سے آتا

کبھی آتا ترے بتلائے ہُوئے رستے پر
اپنی خواہش پہ کبھی اور طرف سے آتا

خواب کے سامنے دیوار اگر بن جاتی
ٹوٹتے بنتے اسی اور طرف سے آتا

زور کرتی نہ اگر اُس کی محبت دل میں
پھر یہ سیلاب کئی اور طرف سے آتا

بچ نکلتا میں کسی اور طرف سے شاید
اگر اُس پر مرا جی اور طرف سے آتا

اور کر سکتا وہ اس شام کا پہلو روشن
موجۂ ماہ مری اور طرف سے آتا

میرے آنے کے یہ اطراف نہ ہوتے غائب
ایک ہو کر جو کبھی اور طرف سے آتا

غم نہ ہوتا کہیں اثنائے سفر میں ہی ، ظفر
اگر اب کے بھی وُہی اور طرف سے آتا

☆

سفر میں اس دفعہ چاہو گے جیسا سامنے ہو گا
جہاں محسوس ہو گی پیاس ، دریا سامنے ہو گا

دماغ اتنی ترقی کر گئے ہیں اہلِ دُنیا کے
عمل کرنے سے پہلے ہی نتیجہ سامنے ہو گا

رہے گا اب نہ دُور اُفتادگی کا مسئلہ کوئی
تمھیں سوچیں گے اور چہرہ تمھارا سامنے ہو گا

ہر اک شے میں کوئی شے دُوسری ہو جائے گی شامل
بُرا پیشِ نظر ہو گا نہ اچھا سامنے ہو گا

سبھی کو ہو گا ہستی نیستی پر اختیار اب کے
یہاں ہونے نہ ہونے کا اشارہ سامنے ہو گا

کسی سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں رہ پائے گا ہرگز
جو پسِ منظر میں ہے ، سب رفتہ رفتہ سامنے ہو گا

کسی شب خون کا اب ہو نہیں سکتا کہیں امکاں
لڑائی دن میں ہو گی ، دشمن اپنا سامنے ہو گا

سمندر پُر سکوں ہو گا اندھیری رات میں ہر سُو
سفینہ سُوئے ساحل اور ستارہ سامنے ہو گا

ظفر، نظارۂ خوابِ تماشا دیکھ بیٹھے ہو
اگر پھر دیکھنا چاہو ، دوبارہ سامنے ہو گا

☆

کاغذ پہ کوئی لفظ اُتارا ہے زبردست
اب دیکھ کے جانا کہ تماشا ہے زبردست

تُو خود بھی زبردست بہت ہے ، مرے مولا
پر ، تجھ سے زیادہ تری دُنیا ہے زبردست

اُس کو کبھی نزدیک سے بھی دیکھنا اک دن
اُتنا ہی دلآویز ہے جتنا ہے زبردست

کُل میں نہیں وہ بات جو ہے جُزو کے اندر
اُس چاند سے یہ چاند کا ٹکڑا ہے زبردست

دو حصّوں میں تقسیم ہے وہ حُسنِ خداداد
آدھا ہے بلاخیز ، تو آدھا ہے زبردست

مَیں خود تو کبھی اُس کی گلی سے نہ گزرتا
لائی ہے جو اس بار ، تمنّا ہے زبردست

کوشش تو بہت ہم بھی کیا کرتے ہیں ، لیکن
حق بات ہے یہ ، کام تمھارا ہے زبردست

یہ جامۂ تزویر جو ہم پہنے ہوئے ہیں
کیا جانیے اُلٹا ہے کہ سیدھا ہے زبردست

ہیں عیب ظفر میں بھی ہزاروں نہیں ، لاکھوں
کیوں کر اُسے جتلائیں کہ بندہ ہے زبردست

☆

ہُوا ہُوں پہلے تو اس کائنات سے باہر
پھر، اُس کے بعد حدِ ممکنات سے باہر

مری گرفت میں آتا کہاں وہ موسمِ خواب
رُکا رہا جو کبھی میری رات سے باہر

سمجھ میں آئی تو آئے گی آتے آتے ہی
کہ بات اور بھی ہے کوئی بات سے باہر

تھیں مشکلات کوئی اور بھی مرے درپیش
کبھی جو آ ہی گیا مشکلات سے باہر

مرا وجود ہے ایک اور بھی مرے ہر سُو
ملوں گا میں تمھیں اپنی صفات سے باہر

نہ لگنے پائی کسی کو ہوا ہی باہر کی
کہ مل سکا نہ کوئی اپنی ذات سے باہر

اِدھر اُدھر کہیں لوگوں میں گھوم کر دیکھو
تمام سچ ہے پڑا واقعات سے باہر

وہی پلٹ کے گھروں کو نہ آج تک آئے
گئے کبھی جو بہت احتیاط سے باہر

کہیں پہ آپ کا بھی نام آ رہا ہے، ظفرؔ
رہے ہیں آپ تو اس واردات سے باہر

-☆-

دل اس طرح بھی ترے خواب سے نکلتا ہے
کہ جیسے عالَمِ اسباب سے نکلتا ہے

چراغ سا جو کسی بُت کدے میں بُجھتا ہُوں
دُھواں دریچۂ محراب سے نکلتا ہے

مَیں اُس میں آپ بھی غائب سا ہونے لگتا ہُوں
غُبار جو مرے مہتاب سے نکلتا ہے

غروب ہوتا ہُوں جب مَیں کُھلے سمندر میں
وہ بند ہوتے ہُوئے باب سے نکلتا ہے

جو پھُوٹتی ہے مری خاک سے کوئی کونپل
تو پھُول آئنۂ آب سے نکلتا ہے

مثال ڈھونڈ رہا ہُوں مَیں آج تک اُس کی
وہ ایک رنگ جو سُرخاب سے نکلتا ہے

مری رُکی ہُوئی رفتار کا کوئی مطلب
مرے تھکے ہُوئے اعصاب سے نکلتا ہے

تلاشِ حُسن میں اس کو بھی دھیان میں رکھنا
کہ ہر سُراغ اُسی نایاب سے نکلتا ہے

کبھی کبھی تو مرا گُم شدہ وجود، ظفرؔ
مرے بندھے ہُوئے اسباب سے نکلتا ہے

-☆-

ہمیشہ رنجِ سفر کے غبار میں ہونا
اور ، اپنی واپسی کے انتظار میں ہونا

اِک اور سُود و زیاں کا حساب رکھتے ہوئے
نئے ہی روز کسی کاروبار میں ہونا

اک اور سِلسِلۂ روزگار میں رہ کر
اک اور سِلسِلۂ روزگار میں ہونا

ترے ہی موجِ صبا کی طرح بُجھانے تک
چراغ سا وہ ترے رہگزار میں ہونا

اگر رکھا تو رکھا ٹھیک مضطرب تُو نے
ہمیں بھی راس نہیں تھا قرار میں ہونا

مرے سمیت سبھی کی سمجھ سے باہر ہے
یہ اتنی دیر مرا اس دیار میں ہونا

ہوائے امن و اماں ہے اگر مجھے درکار
تو لازمی ہے مرا کارزار میں ہونا

ہمارے آپ کے ہونے میں شک نہیں ، لیکن
ہے اصل بات شُمار و قطار میں ہونا

یہ حال ہے تو بہت باعثِ خطر ہے ، ظفرؔ
کسی بھی شے کا مرے اختیار میں ہونا

☆☆

ہُوا اقرار تو انکار کے اُوپر سے ہُوا
رابطہ اصل میں دیوار کے اُوپر سے ہُوا

خواہشوں نے کبھی پکڑا نہیں اُس کا دامن
گُزر اُس کا بھی اس انبار کے اُوپر سے ہُوا

روک لینا تھا ضرُوری اُسے ، لیکن ، مُجھ کو
اتنا احساس بھی دیدار کے اُوپر سے ہُوا

سفر اِس نرم ہوا کا نہ ہُوا اندر سے
کبھی نیچے ، کبھی اشجار کے اُوپر سے ہُوا

دل جو ٹُوٹا ہے تو دُنیا کو خبر ہی نہ ہُوئی
شُبہ سا مُجھ کو بھی جھنکار کے اُوپر سے ہُوا

کوئی گاہک نہیں ، سارے ہیں گُزرنے والے
مُجھے اندازہ ہی بازار کے اُوپر سے ہُوا

اہلیت کا بھی بہُت شور بپا ہے ، لیکن
سر کا ہر فیصلہ دستار کے اُوپر سے ہُوا

اپنے حصّے میں بھی آیا ہے تو ہوتے ہوتے
وُہی ابلاغ جو اظہار کے اُوپر سے ہُوا

رُک گئی تھی کوئی شے طبعِ رواں ہی میں ، ظفرؔ
اور ، یہ حادثہ رفتار کے اُوپر سے ہُوا

☆☆

میں اُس کے ساتھ ساتھ، کوئی میرے ساتھ ساتھ
رہتا ہے ایک خواب سی میرے ساتھ ساتھ

کیسا اُڑائے پھرتی ہے مُجھ کو بھی جابجا
ہوتی ہے رات بھر جو پری میرے ساتھ ساتھ

خوش بُو کی ایک لہر سی اثنائے راہ میں
تھی مُجھ سے دُور دُور، کبھی میرے ساتھ ساتھ

اک یاد میرے ساتھ روانہ تھی جو کبھی
ہر مرحلے پہ وہ بھی نہ تھی میرے ساتھ ساتھ

گہری ہوئی جو شام تو روشن کیا ہے دل
پھر، رات بھر یہ شمع جلی میرے ساتھ ساتھ

اب زندگی گزار رہا ہوں ملی جلی
غم ہے اور اُس کے ساتھ ہنسی میرے ساتھ ساتھ

ہوتا ہے عمر میں جو اضافہ تو رات دن
چلتی ہے اصل میں یہ کمی میرے ساتھ ساتھ

ہوتا کہیں مُسافرتِ زندگی میں کُچھ
میرا وُجود بھی جو کبھی میرے ساتھ ساتھ

باقی بچی ہوئی جو محبت ہے، اے ظفر
کُچھ دن رہے گی یہ بھی ابھی میرے ساتھ ساتھ

-☆-

اگرچہ کہنے کو یہ موت بھی نہیں ہرگز
گزرتی جاتی ہے جو زندگی نہیں ہرگز

میں ہو چلا ہوں اندھیروں سے ہی بہت مانوس
مری طرف جو تری روشنی نہیں ہرگز

ملی نہ جس کو پذیرائی تیرے ساحل سے
مری وہ لہر دوبارہ نہیں اٹھی ہرگز

یہ سوچ کر کہ نجانے ترا جواب ہو کیا
وہ بات روک رکھی ہے، کہی نہیں ہرگز

جو مُجھ کو جانتا ہے، اور، نہیں ترا شیدا
وہ اور کُچھ بھی سہی، آدمی نہیں ہرگز

حسد میں ہوتی ہی رہتی ہے کُچھ کمی بیشی
کہ آگ سرد ہوئی ہے، بجھی نہیں ہرگز

میں اُس کے حق میں بُرا سوچ ہی نہیں سکتا
کہ اُس کے ساتھ مری دوستی نہیں ہرگز

جو دُوسرے یہاں کرتے ہیں، شاعری ہے اگر
تو میں جو کرتا ہوں، وہ شاعری نہیں ہرگز

میں اپنے آپ سے خالی ہی پھر رہا ہوں، ظفر
خود آ کے دیکھ لو، مُجھ میں کوئی نہیں ہرگز

-☆-

خوش بھی نہ ہوئے اتنے ملاقات کے برعکس
اور، کچھ نہ کیا آپ کے حالات کے برعکس

جب جب نظرانداز کیا آپ نے ہم کو
ہے یاد وہی اتنی عنایات کے برعکس

ہو جیسے کوئی آپ کے آئینہ مقابل
باغات ہی باغات ہیں باغات کے برعکس

جب مجھ سے سنبھلتا ہی نہیں ہے کسی صورت
دیتے ہیں مجھے کیوں مری اوقات کے برعکس

مل جاتے ہیں ڈوری کے سرے اُن کے باہم
اور، بات نہیں کوئی کسی بات کے برعکس

درپیش ہے مشکل ہی سہولت کے بجائے
قلت ہی پڑی رہتی ہے بہتات کے برعکس

گنجایش اسی میں کوئی رکھتا ہوں ضروری
کرتا ہوں جو اپنے ہی بیانات کے برعکس

یہ شور ہے میرا، مرے شیون سے بہت دور
اور، شاعری ہے میرے خیالات کے برعکس

اس کے بھی، ظفر، خواب تھے میری ہی طرح کے
تھا کوئی جو موجود مری ذات کے برعکس

☆

ضد ہی کام آئی نہ اصرار بہت کام آیا
صبر تھا ایک جو ہر بار بہت کام آیا

خود کو ترتیب دیا آخرکار ازسرِنو
زندگی میں ترا انکار بہت کام آیا

عمر اندھیروں میں بھی ویسے تو بسر ہو جاتی
وہ چراغِ لب و رخسار بہت کام آیا

مستقل اس نے تغافل ہی رکھا اپنا شعار
یوں ہمارے وہ لگاتار بہت کام آیا

دل نے بہلائے رکھا قصہ طرازی سے ہمیں
اور، تمھارا یہ طرف دار بہت کام آیا

راستے ہو گئے ہموار ہمیشہ کے لیے
سفرِ وادیِ دشوار بہت کام آیا

فائدہ کوئی مجھے تو نہیں پہنچا، لیکن
دوسروں کے، مرا معیار بہت کام آیا

دیکھتے دیکھتے غائب ہوئی خوش بو ساری
ورنہ کچھ دن گلِ گفتار بہت کام آیا

آپ بھی آ کے ظفر سے جو پکڑتے عبرت
آپ جیسوں کے یہ بیکار بہت کام آیا

☆

تھی بھی تکلیف اگر کوئی تو چارہ نہ کیا
ہو تو سکتا تھا جو ہم نے ہی گوارہ نہ کیا

یہ تو ظاہر ہے کہ آنا ہی نہیں تھا تُم نے
انتظار اس لیے بھی ہم نے تُمھارا نہ کیا

کر نہیں پائے کوئی ہم بھی تُمھاری خِدمت
اور تُم نے بھی کوئی کام ہمارا نہ کیا

زندگی ایک کشش و پیچ میں گُزری ساری
ہم نے آواز نہ دی، تُم نے اِشارہ نہ کیا

تُم ہی دُشمن تھے، جسے دوست بھی کر سکتے تھے
دل ہی دیوار تھی، اِس کو بھی سہارا نہ کیا

کہیں ڈوبے نہ کبھی پیاس بُجھائی ہم نے
پھر بھی دریائے محبت سے کنارہ نہ کیا

باعثِ ترکِ مُلاقات وُہی تھا یکسر
ہمیں اچھا جو لگا، تُم نے گوارا نہ کیا

منظرِ خواب ہی تھا ایک یہاں قابلِ دید
دیکھنے والوں نے اُس کا بھی نظارا نہ کیا

رابطہ آپ ہی توڑا تھا کبھی اُس سے، ظفر
دل نے چاہا بھی، مگر، ہم نے دوبارہ نہ کیا

☆

اپنی ضد سے نہ کسی اور سہارے پہ کیا
جو کیا ہم نے تُمھارے ہی اشارے پہ کیا

ہم ہی کرتے رہے بے سُود، وگرنہ، تُم نے
اعتبار ایک دفعہ بھی نہ ہمارے پہ کیا

اِک جواز اُس کا بھی موجُود تھا جس کے لیے ہم
خُود الگ ہو گئے، افسوس تُمھارے پہ کیا

مقصد اس بار تھا مرنا ہی تو جھگڑا کیا ہے
ہم نے پانی میں جو کرنا تھا، کنارے پہ کیا

جہاں پہنچے ہیں، وُہی منزلِ مقصود ہے اب
یہ سفر سب نے اسی غم کے غبارے پہ کیا

ایک گوشے کا طلب گار تھا ہم سے جو بھی
قبضہ گھر آن کے اُس شخص نے سارے پہ کیا

اُس میں بھی ڈوبتے دیکھا ہے سفینہ کوئی
یوں سمندر کا گُماں ہم نے ہمارے پہ کیا

عرصۂ عُمر کا اندازہ لگا سکتے ہو
ہم جو خس تھے تو قیام ایک شرارے پہ کیا

رہ گیا بیچ میں سب کچھ، مگر، اب کے بھی، ظفر
اِنحصار اپنے ہی رُکتے ہُوئے دھارے پہ کیا

☆

مجھے مارنے کو جو بیل آ گیا
سو، وہ بھی تمھارے طفیل آ گیا

ملاقات معقول کی تھی، مگر
دلوں میں محبت کا میل آ گیا

سمٹنے لگیں وشت کی سرحدیں
جہاں، جس طرف خواب لیلیٰ گیا

بدن پونچھ کر کیا مجھے دھوپ میں
کہیں تولیا سا وہ پھیلا گیا

توقع مجھے درج بالا کی تھی
نتیجہ، مگر، حسبِ ذیل آ گیا

میں گھر سے نکل کر گیا ہوں جدھر
مرے ساتھ ہی میرا تھیلا گیا

جو اُترا ہے بارش کا پانی کبھی
تو سڑکوں پہ کیچڑ کا سیل آ گیا

وہی صورتِ حال ہے جوں کی توں
کہ شفاف آیا تو میلا گیا

رہے شاعری سے مبرّا، ظفرؔ
مگر، رفتہ رفتہ یہ ذیل آ گیا

-☆-

مجھ ایسے لگتا ہے باہر بھی اپنا گھر کوئی تھا
ہمارے ساتھ جو ایک اور دربدر کوئی تھا

نہ راستہ تھا وہاں اور نہ سمت ہی تھی کوئی
مگر مجھے یہ گماں ہے کہ وہ سفر کوئی تھا

وہ ایک شک تھا جو دل سے نکل چکا تھا، مگر
کچھ اس طرح کا ہی مجھ پہ ابھی اثر کوئی تھا

مجھے اسی نے اندھیرے میں کر دیا قائم
جو میرے چاروں طرف، اور، دل میں ڈر کوئی تھا

نہیں تھا وہ تو دکھائی نہیں دیا ہے مجھے
اسی نواح میں ہوتا کہیں اگر کوئی تھا

مرے علاوہ بھی اس کائنات میں کسی وقت
مجھے یقیں تو نہیں آ رہا، مگر، کوئی تھا

مجھے بھی یاد ہے بھولے نہیں ہمارے بھی
جو ایک شام تھی، اور، سامنے شجر کوئی تھا

رہی نہ تھی وہاں میری بھی کوئی گنجائش
مکانِ تنگ میں اس رات اس قدر کوئی تھا

کئی زمانوں سے وہ بھی نہیں رہا ہے، ظفرؔ
جو اپنے ہاتھ میں تھوڑا بہت ہنر کوئی تھا

-☆-

ہمیں اُدھر کبھی ہونا نہیں، جدھر کوئی ہے
ہم اپنے گھر میں نہیں، اور، ہمارے گھر کوئی ہے

یہ کس طرح کی محبت ہے، کچھ نہیں معلوم
کہ ہم سفر تو نہیں، شاملِ سفر کوئی ہے

میں اُس کے ہونے کے آثار دیکھتا ہوں بہت
فلک پہ ہو کہ نہ ہو، اس زمین پر کوئی ہے

مرے وُجود کے اندر ہی تھا، اگر کوئی تھا
مرے وُجود سے باہر نہیں، اگر کوئی ہے

جو وہ نہیں تو کوئی ہے ضرور اُس جیسا
کہ ہوبہو جو نہیں بھی تو سربسر کوئی ہے

میں خود نہیں ہوں تو پھر اس سے کیا غرض مجھ کو
کہ اس نواح میں کیا، کوئی، کب، کدھر کوئی ہے

ہر ایک چیز فراواں ہے دہر میں، لیکن
کچھ ایسے لگتا ہے پھر بھی، کہیں کسر کوئی ہے

اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں روز ہی جس میں
مرے لہو میں کچھ ایسا ہی اک بھنور کوئی ہے

کبھی ملے ہی، نہ دیکھا ہے شہر میں اُس کو
سُنا ہے اس کے مضافات میں ظفر کوئی ہے

☆

اگر کبھی ترے آزار سے نکلتا ہوں
تو اپنے دائرۂ کار سے نکلتا ہوں

ہوائے تازہ ہوں، رُکتا نہیں کہیں بھی مجھے
گھروں میں گھستا ہوں، اشجار سے نکلتا ہوں

کبھی ہے اُس کے مضافات میں نمود مری
کبھی میں اپنے ہی آثار سے نکلتا ہوں

میں گھر میں جب نہیں ہوتا تو گھاس کی صورت
دریچہ و در و دیوار سے نکلتا ہوں

اسی کنارۂ دریائے ذات پہ ہر دم
غروب ہوتا ہوں، اُس پار سے نکلتا ہوں

وداع کرتی ہے روزانہ زندگی مجھ کو
میں روز موت کے منجدھار سے نکلتا ہوں

رُکا ہوا کوئی سیلاب ہوں طبیعت کا
ہمیشہ تیزیٔ رفتار سے نکلتا ہوں

اُسے بھی کچھ مری ہمت ہی جانیے جو کبھی
خیال و خواب کے انبار سے نکلتا ہوں

لباس بیچتا ہوں جا کے پہلے اپنا، ظفر
تو کچھ خرید کے بازار سے نکلتا ہوں

☆

ہمارے سر سے وہ طوفاں کہیں گزر گئے ہیں
چڑھے ہوئے تھے جو دریا کبھی اُتر گئے ہیں

رہے نہیں ہیں کبھی ایک حال پر قائم
سمٹ گئے ہیں کبھی اور ، کبھی بکھر گئے ہیں

اُصول ہے کہ خلا یُونہی رہ نہیں سکتا
ہُوئے ہیں خُود سے جو خالی ، سو ، تُجھ سے بھر گئے ہیں

رُکے بھی ہیں تو دوبارہ روانگی کے لیے
چلے بھی ہیں تو کہیں راہ میں ٹھہر گئے ہیں

تُمھارے عہدِ تغافل میں جی رہے ہیں ابھی
ہُوا ہے کُچھ تُمھیں حاصل ، نہ ہم ہی مر گئے ہیں

نِکل پڑے تو پھر اپنا سُراغ مِل نہ سکا
تُمھارے پاس ہی پہنچے نہ اپنے گھر گئے ہیں

وُہی ہے دائرۂ خواب ابتدائے سفر
اُسی قدر ہوئے واپس بھی جس قدر گئے ہیں

اِسی کمی کا ہے احساس ، اور ، حیرانی
ہیں اور تو سبھی موجُود ، ہم کِدھر گئے ہیں

ظفر ، ہماری محبت کا سِلسِلہ ہے عجیب
جہاں چھپا نہیں پائے ، وہاں مکر گئے ہیں

☆

ہمیشہ کے لیے سینے میں سو بھی سکتی ہے
یہ بے جواز محبت کہ ہو بھی سکتی ہے

اگر پسند کرے موسموں کی حیرانی
تو سنگِ دل میں کوئی بیج بو بھی سکتی ہے

وہ شکل جو نظر آئی ہے اتنی دیر کے بعد
اسی ہجومِ تماشا میں کھو بھی سکتی ہے

یہ پار اُتار بھی سکتی ہے موج بے پروا
اور ، اپنے ساتھ سفینہ ڈبو بھی سکتی ہے

بنا بھی سکتی ہے بارش عبارتیں دل پر
لکھی ہُوئی کوئی تحریر دھو بھی سکتی ہے

مَیں جانتا ہُوں کہ دروازہ بند بھی سکتا ہے
مَیں سوچتا ہُوں یہ دیوار رو بھی سکتی ہے

یہ دُھند پیاس بھی میری بُجھا نہیں سکتی
مرے وُجود کو لیکن بھگو بھی سکتی ہے

جُدا بھی کرتی ہے چیزوں کو وہ حسینہ خواب
کسی بھی شے میں کوئی شے سمو بھی سکتی ہے

بالآخر ایک یہ توفیقِ بے مُہار ، ظفر
کلی کو خار ہوس میں پرو بھی سکتی ہے

☆

کچھ بیاں کرنے میں، اور، کچھ سوچنے میں رہ گیا
اپنا سامانِ سخن سب راستے میں رہ گیا

میں نے ہی سب کچھ گنوایا کاروبارِ خواب میں
اک ذرا دیکھو تو میں ہی فائدے میں رہ گیا

جھوٹ سچ اُس سے محبت ہو ہی سکتی تھی، مگر
کام یہ بھی ابتدائی مرحلے میں رہ گیا

اُس نے بھی ہمت نہیں ہاری جُدا ہونے کے بعد
اور، سچ پوچھو تو میں بھی حوصلے میں رہ گیا

یُوں تو اُس کی سب حدوں تک تھی رسائی بھی مری
سوچ کر کچھ میں ہی اپنے دائرے میں رہ گیا

میرے ہاتھوں سے نکل جانا تھا جس نے آخرش
عمر بھر میں ایک اُس کو روکنے میں رہ گیا

کچھ نکالا بھی اُنھوں نے درمیاں ہی میں مجھے
اور کچھ رختِ سفر بھی قافلے میں رہ گیا

داستاں میں تو نہ تھا کردار ہی اپنا کوئی
ذکر کافی ہے جو پھر بھی حاشیے میں رہ گیا

ساتھ کچھ لا ہی نہیں سکتے تھے ایسے میں، ظفر
واپسی پہ باغ سارا آئنے میں رہ گیا

☆

جیسے میرے ہی ٹھکانے کی طرف سے آیا
تیر واپس جو نشانے کی طرف سے آیا

اُس کے آنے کی خبر کیا مجھے آتی آخر
وہ جو آیا بھی تو جانے کی طرف سے آیا

آئے گا دیر سے ہی میری سمجھ میں وہ پیام
جو کسی اور زمانے کی طرف سے آیا

مجھ کو حیران کیا سب سے زیادہ اُس نے
سنگ جو آئنہ خانے کی طرف سے آیا

اُس کی آنکھوں میں دبی زر کی چمک تھی ساری
سانپ جو اُس کے خزانے کی طرف سے آیا

بھول بیٹھا تھا اُسے یاد جو کرتے کرتے
وہ مجھے یاد بھلانے کی طرف سے آیا

رونق اُس نے مرے باہر بھی لگائے رکھی
اور اندر بھی سمانے کی طرف سے آیا

رنگ پہلے بھی مری نیند میں شامل تھے کئی
اک ترے خواب میں آنے کی طرف سے آیا

اُس نے کچھ اور ڈبویا مجھے دریا میں، ظفر
جو کبھی مجھ کو بچانے کی طرف سے آیا

☆

سر بسر اپنے برابر سے نکالا ہے کہیں
رنگ باہر سے نہ اندر سے نکالا ہے کہیں

دیکھتے دیکھتے آ پانو کی زنجیر ہُوا
ایک سودا جو ابھی سر سے نکالا ہے کہیں

خواہشِ وصل کہ سونے نہ دیا اس نے مجھے
اک شکن تھی جسے بستر سے نکالا ہے کہیں

ایک تصویر میں ہوتی ہیں کئی تصویریں
منظر ایک اور بھی منظر سے نکالا ہے کہیں

ایک لٹو کی طرح گھوم رہا ہوں اب تک
جیسے خود کو کسی چکّر سے نکالا ہے کہیں

پھر کوئی چیز سلگتی نظر آئی تھی کہیں
اک دھواں خوابِ مکرر سے نکالا ہے کہیں

ڈوبنے والے سفینے کے علاوہ میں نے
اک ستارہ بھی سمندر سے نکالا ہے کہیں

راستہ کوئی بھی محفوظ نہ تھا اندر سے
اس لیے شہر کے باہر سے نکالا ہے کہیں

اپنے ہی آپ سے باہر کھسک آیا ہوں، ظفر
اُس نے دل سے نہ مجھے گھر سے نکالا ہے کہیں

☆

شاید اپنے ہی کسی کام سے باہر نکلا
اک ستارہ جو مری شام سے باہر نکلا

میں بھی تھک ہار کے اندر کی طرف پلٹا ہوں
وہ بھی آخر دلِ ناکام سے باہر نکلا

کس لیے جا کے پھنسا تھا مجھے معلوم نہیں
اور، کس طرح ترے دام سے باہر نکلا

گھر میں بیٹھا رہا شرمندۂ شہرت ہو کر
آج میں ایک نئے نام سے باہر نکلا

سخت کہرام مچا تھا مرے اندر بھی کہیں
میں نکلنے کو تو کہرام سے باہر نکلا

خاص ہی کوئی ملامت مرے درپیش آئی
جب بھی میں دائرۂ عام سے باہر نکلا

کوئی طوفان اُٹھائے رکھا اندر اُس نے
اور، پھر وہ بڑے آرام سے باہر نکلا

اُس کا مطلب تھا کوئی اور ہی، پہلے سے الگ
ایک پیغام جو پیغام سے باہر نکلا

کی ہے تردید محبت کبھی اُس نے بھی، ظفر
نہ کبھی میں ہی اس الزام سے باہر نکلا

☆

پرندوں، بادلوں کے ساتھ مل کر ایک ہونا
زمین و آسماں کا میرے اندر ایک ہونا

غبار آلود ہوتے ہیں یہ صبح و شام، لیکن
ضروری بھی نہیں دونوں کا منظر ایک ہونا

دھنسے رہنا کئی چیزوں کا وہ اک دوسری میں
جدا ہونے کے لمحوں تک برابر ایک ہونا

جو اپنے آپ میں ہی ایک رہنا چاہتا ہو
اُسے ہونا پڑے خود سے جو باہر ایک ہونا

بکھر جانا ہوا کے دشت و در میں دُور تک وہ
جہاں سے واپس آ کر بار دیگر ایک ہونا

ستارہ بُجھ گیا جب ٹوٹ کر ان وسعتوں میں
تو چاہیں گے سفینہ، اور سمندر ایک ہونا

محبت ہی نہ ہوتی اس قدر وارفتگی سے
اگر تھا ہی نہیں اپنا مقدر ایک ہونا

اب آگے اور مشکل ہونے والا ہے یہ موسم
جو سمجھو تو غنیمت ہے یہ دم بھر ایک ہونا

مرے جیسے، ظفر، کچھ اور ہونا چاہئیں تھے
مناسب ہی نہ تھا میرا سراسر ایک ہونا

☆

جو میسّر ہی نہیں، شاید وہ مُہلت کام آئے
اور، آخر ایک ناممکن محبت کام آئے

چھوڑ دی ہے جب توجہ اپنے کام آئی نہیں
کرتے رہیے، آپ کے شاید یہ غفلت کام آئے

آپ کے پیش آ بھی سکتے ہیں مقامات خطر
اور لازم بھی نہیں اب کے حفاظت کام آئے

دوستوں پر تو کوئی اُمید ہو سکتی تھی کیا
لیکن اس اثنا میں کچھ دشمن غنیمت کام آئے

کچھ نہ کچھ اپنے لیے محفوظ بھی رکھتا ہوں مَیں
تاکہ وہ میرے کبھی وقتِ ضرورت کام آئے

لاکھ فرسودہ ہوں، مجھ پر گر تو سکتی ہیں کبھی
عین ممکن ہے کہ یہ دیوار، یہ چھت کام آئے

عمر کے اتنے اندھیرے میں نہ ممکن ہو سکا
وہ چراغ رنگ جیسی اُس کی صورت کام آئے

جن کی خاطر مارے مارے پھر رہے ہو رات دن
جب بھی ان سے کام آ نکلا تو یہ مت کام آئے

دودھ بچے کو بھی رونے پر ہی ملتا ہے، ظفر
سخت مشکل ہے یہ چپ رہنے کی عادت کام آئے

☆

کبھی اوّل نظر آنا ، کبھی آخر ہونا
اور ، وقفوں سے مرا غائب و حاضر ہونا

میں کسی اور زمانے کے لیے ہوں ، شاید
اس زمانے میں ہے مشکل مرا ظاہر ہونا

میں نہ ہونے پہ ہی خوش تھا ، مگر ایسے ہوا پھر
مجھ کو ناچار پڑا آپ کی خاطر ہونا

دور ہو جاؤں بھی اس باغ بدن سے ، لیکن
کہیں ممکن ہی نہیں ایسے مناظر ہونا

واقعی تم کو دکھائی ہی نہیں دیتا ہوں
یا ضرورت ہے تمھاری مرا منکر ہونا

راستہ آپ بنانا ہی کوئی سہل نہیں
پھر ، اسی راستے کا آپ مسافر ہونا

وہ مقاماتِ مقدس ، وہ ترے گنبد و قوس
اور ، مرا ایسے نشانات کا زائر ہونا

بادلوں اور ہواؤں میں اڑا پھرتا میں
کاش ہوتا مری تقدیر میں طائر ہونا

کام نکلا ہے کچھ اتنا ہی یہ پیچیدہ ، ظفر
جتنا آساں نظر آیا مجھے شاعر ہونا

☆

وہی مرے خس و خاشاک سے نکلتا ہے
جو رنگ سا تری پوشاک سے نکلتا ہے

کرے گا کیوں نہ مرے بعد حسرتوں کا شمار
ترا بھی حصہ ان املاک سے نکلتا ہے

ہوا کے ساتھ جو اک بوسہ بھیجتا ہوں کبھی
تو شعلہ اس بدنِ پاک سے نکلتا ہے

ملے اگر نہ کہیں بھی وہ بے لباس بدن
تو میرے دیدۂ نمناک سے نکلتا ہے

اتارتا ہے مجھے جنید کے نیستاں میں
ابھی وہ خواب رگِ تاک سے نکلتا ہے

فصیلِ فہم کے اندر بھی کچھ نہیں موجود
نہ کوئی خیمہ ادراک سے نکلتا ہے

دھویں کی طرح سے اک ہیول میرے ہونے کا
کبھی زمیں ، کبھی افلاک سے نکلتا ہے

مرے سوا بھی کوئی ہے جو میرے ہوتے ہوئے
بدل بدل کے مری خاک سے نکلتا ہے

یہ معجزے سے کوئی کم نہیں ، ظفر ، اپنا
جو کام اس بتِ چالاک سے نکلتا ہے

☆

مصیبت مستقل سر پر کوئی طاری تو رکھتے ہم
کیا تھا عشق اگر کچھ دیر اُسے جاری تو رکھتے ہم

ملے بھی جا کر اُس سے، راستے سے بھی پلٹ آئے
ملاقاتوں میں آخر کچھ لگاتاری تو رکھتے ہم

اُسے بھی صورتِ حالات سے کچھ آگہی ہوتی
کسی دن اُس کے آگے عذرِ ناچاری تو رکھتے ہم

کبھی آ ہی نکلتا اس طرف پھرتا پھراتا وہ
سلیقے سے کہیں اُس کی طلبگاری تو رکھتے ہم

کوئی گاہک بھی آ جاتا، ہمارا مول بھی پڑتا
کسی پیرایے میں کچھ گرم بازاری تو رکھتے ہم

سفر پر ساتھ لے جانا نہ لے جانا بڑی حد تک
اُسی پر منحصر تھا، اپنی تیاری تو رکھتے ہم

ہمیں بھی ہو تو سکتی تھیں بہت ہمدردیاں حاصل
کہیں اُسلوب میں تھوڑی سی مکاری تو رکھتے ہم

اُمیدِ وصل بھی خود وصل سے کچھ کم نہیں ہوتی
کسی کونے میں دل کے ایک سرشاری تو رکھتے ہم

شرافت سے بسر کرتے کہیں یہ زندگی ہم بھی
کوئی چوری تو کر سکتے، کہیں یاری تو رکھتے ہم

-☆-

سینۂ دشت سے اک چشمہ اُبلتا ہوا ہے
سطحِ دریا پہ کوئی شعلہ مچلتا ہوا ہے

کچھ پرندے ہیں جو مٹی میں گڑے ہیں ہر سُو
اور، پھر ایک شجر ہے جو اُچھلتا ہوا ہے

اس تگ و تاز میں کچھ اور تو باقی نہیں اب
ایک دل ہے کہیں، اور، وہ بھی دہلتا ہوا ہے

اک دیا ہے اس اندھیرے کے مقابل اس وقت
جو کہیں میرے برابر سے نکلتا ہوا ہے

اپنے باغات کی ہے اُس کو نمائش بھی عزیز
جو بظاہر کہیں پوشاک بدلتا ہوا ہے

آپ ہیں اپنے شب و روز میں گم، آپ سے کیا
کوئی اب گرتا ہوا ہے کہ سنبھلتا ہوا ہے

ہم بھی نادم نہیں، اور، وہ بھی ہے مصروف بہت
ایک خطرہ تھا محبت کا، سو ٹلتا ہوا ہے

میں کنواں کھودنے پر غور ہی کرتا ہوں ابھی
اور، اک شہر مرے سامنے جلتا ہوا ہے

اپنے وقتوں میں جو ہر طرح سے باطل تھا، ظفر
اب کے بازار میں سکّہ وُہی چلتا ہوا ہے

-☆-

بچّہ یُوں بھوک سے نہ مرتا
جلدی ترا دُودھ اگر اُترتا

میک اپ کرنا تھا کیا ضروری
یہ چہرہ تو آپ ہی سنورتا

اِتنے لمبے سفر کے دوران
مَیں تیرے پڑاو پر ٹھہرتا

ہوتی اک ضد ہی یہ ہستی
مَیں خواب میں تجھ کو پیار کرتا

یہ راستہ ہو چلا تھا سنسان
مَیں بھی نہ کبھی اگر گزرتا

اُس خاکۂ حُسن میں کبھی مَیں
اپنا بھی کوئی رنگ بھرتا

کرتے مجھ کو بھلے ہی یک سُو
مَیں تو کچھ اور بھی بکھرتا

جا ہی لگتا کبھی کنارے
آخر کہیں ڈوبتا اُبھرتا

ہو کر ہی رہی، ظفرؔ، وہ آخر
جس بات سے مَیں رہا ہوں ڈرتا

☆

شعلہ اوپر سے کبھی اور طرف سے آیا
لیکن اس بار مری اور طرف سے آیا

مَیں نے روکا بہت اُس کو، مگر آتے آتے
وہ بہرحال اُسی اور طرف سے آیا

راستہ اور بھی آتا تھا مجھے، لیکن، مَیں
کسی مٹی سے اٹی اور طرف سے آیا

کبھی اطراف سے بیزار تھا جیسے یکسر
سو، ہتھیلی پہ دھری اور طرف سے آیا

منتظر تھا مَیں کسی اور ہی جانب سے، مگر
وہ مری سمت کسی اور طرف سے آیا

اپنی پیچیدہ پسندی کے سبب سے آخر
کئی طرفوں میں پھنسی اور طرف سے آیا

کچھ ہدایات زبانی بھی رہیں، لیکن، وہ
کسی کاغذ پہ لکھی اور طرف سے آیا

اس دفعہ میرے خیالات کی راہوں سے نہیں
اپنے خوابوں سے بنی اور طرف سے آیا

کسی پھولوں سے لدے اور ہی منظر سے، ظفرؔ
کسی خوش بُو میں بسی اور طرف سے آیا

☆

رنج اگر ہے بہت اُس کا نہ ہو کر مجھے
وہ بھی کوئی خوش نہیں ہاتھ سے کھو کر مجھے

مَیں نے دھکیلا اُسے دل سے جو باہر کہیں
چھوڑ دیا اُس نے بھی خود میں سمو کر مجھے

سلسلۂ خواب میں کھو ہی نہ جاؤں کہیں
تارِ نظر میں رکھا اُس نے پرو کر مجھے

بھول چکے تھے مجھے اُس کے زمان و مکاں
یاد کیا ایک دن رات نے رو کر مجھے

آنا ہی تھا ایک دن میرا کسی کو خیال
گھاس پہ پھیلا گیا کوئی جو دھو کر مجھے

کوئی ضرورت مری پڑ گئی ہو گی ہی پھر
اُس نے نکالا ہے جو آپ ڈبو کر مجھے

آن میں پہنچا ہوں مَیں منزلِ مقصود پر
راس بہت آئی ہے پانو کی ٹھوکر مجھے

اِتنی تو واماندگی سارے سفر میں نہ تھی
جتنی تھکاوٹ ہوئی راہ میں سو کر مجھے

ہوتے نہ ہوں گے مرے تر سرِ ساحل، ظفرؔ
موج پلٹ جائے گی سارا بھگو کر مجھے

-☆-

لکھی رہی کچھ روز جو عجلت کے بجائے
آنی تھی قیامت ہی قیامت کے بجائے

تکتے تھے جو ہم اتنی محبت سے تو اُس کو
کیا اور سمجھتا وہ محبت کے بجائے

ایک اور بھی موسم تھا ملاقات سے ہٹ کر
ایک اور بھی دُنیا تھی حقیقت کے بجائے

ہم کو ترے مہکے ہوئے باغوں سے میسّر
کچھ بھی نہ ہوا حیرت و حسرت کے بجائے

اِک گونج پڑی ہے مری دھڑکن کی جگہ پر
کچھ گرد اُڑی ہے مری حالت کے بجائے

وہ میرا مددگار و معاون تھا کہ جس نے
مشکل ہی میں ڈالا ہے سہولت کے بجائے

یہ معرکہ سخت ہے ایسا کہ اب اس میں
کچھ اور بھی درکار تھا ہمت کے بجائے

ویسی ہی وہ بنستی ہوئی آنکھیں تھیں، اور، اُن میں
کچھ اور تھا اب کے بھی اجازت کے بجائے

درکار ہے لوگوں کو، ظفرؔ، موجِ مسرت
اِس اُلجھے ہوئے خوابِ مسرت کے بجائے

-☆-

یہاں پہ عیبِ سخن بیشتر کسی کا نہیں
خدا کی دین ہے ، ورنہ ، ہنر کسی کا نہیں

چمک دمک کے گھڑی بھر کو بجھتے جاتے ہیں
یہاں کی خاک پہ دائم اثر کسی کا نہیں

رواں دواں ہے یونہی کاروانِ شوق اپنا
وہ سب کے ساتھ ہے، اور، ہم سفر کسی کا نہیں

جو ہیں تو اب خس و خاشاک ہیں فقط اپنے
ہوا پرائی ہے یکسر ، شرر کسی کا نہیں

معاملات کی تقسیم ہی عجب ہے یہاں
شجر سبھی کا ہے ، لیکن ثمر کسی کا نہیں

نہیں ہے رشتہ کوئی خاکِ شہر سے ، جیسے
سبھی کرایے پہ رہتے ہوں ، گھر کسی کا نہیں

یہ خواب وہ ہے جو اپنی خبر نہیں دیتا
یہ راہ وہ ہے کہ جس پر گزر کسی کا نہیں

کٹا ہُوا کوئی نیچے سے ، کوئی اُوپر سے
کسی کے پانو نہیں ہیں تو سر کسی کا نہیں

یہ عشق وہ ہے کہ ہیں ناامید ہر دو فریق
اور ، انتظار کسی کو ، ظفر ، کسی کا نہیں

☆

نہیں کہ دل میں ہمیشہ خوشی بہت آئی
کبھی ترستے رہے ، اور ، کبھی بہت آئی

مرے فلک سے وہ طوفاں نہیں اُٹھا پھر سے
مری زمین میں وہ تھرتھری بہت آئی

جدھر سے کھول کے بیٹھے تھے در اندھیرے کا
اُسی طرف سے ہمیں روشنی بہت آئی

وہاں مقام تو رونے کا تھا مگر ، اے دوست
ترے فراق میں ہم کو ہنسی بہت آئی

رواں رہے سفرِ مرگ پر یونہی ، ورنہ
ہماری راہ میں یہ زندگی بہت آئی

یہاں کچھ اپنی ہواؤں میں بھی اُڑے ہیں بہت
ہمارے خواب میں کچھ وہ پری بہت آئی

نہ تھا زیادہ کچھ احساس جس کے ہونے کا
چلا گیا ہے تو اس کی کمی بہت آئی

نجانے کیوں مری نیت بدل گئی یک دم
وگرنہ اس پہ طبیعت مری بہت آئی

ظفر ، شعور تو آیا نہیں ذرا بھی ہمیں
بجائے اس کے ، مگر ، شاعری بہت آئی

☆

یہ نہیں چون و چرا قابلِ غور
بات میری ہے ذرا قابلِ غور

اور بھی ہیں یہاں کہنے والے
نہیں میرا ہی کہا قابلِ غور

ہم نے تو یہ کبھی سوچا ہی نہیں
کس قدر ہے یہ ہوا قابلِ غور

کوئی جلوت ہے فضا کے پیچھے
اُس سے بڑھ کر ہے خلا قابلِ غور

یہی کیا کم ہے کہ اُس محفل میں
چار دن میں بھی رہا قابلِ غور

میں نہیں ہوں تو تمھارے نزدیک
اور کیا کچھ ہے بھلا قابلِ غور

میں جو خیرات نہیں مانگتا ہوں
کچھ تو ہے میری صدا قابلِ غور

میں جو کرتا ہوں محبت اتنی
اس لیے اور ہے کیا قابلِ غور

فیصلے کی ہے الگ بات، ظفرؔ
شکر ہے، میں بھی ہوا قابلِ غور

☆

پڑا ہوا تھا کسی خوش نما کے ایک طرف
کہ لوگ لے گئے مجھ کو بُلا کے ایک طرف

میں درمیاں سے کوئی راستہ نکالتا ہوں
ہوس کے دُوسری جانب، ہوا کے ایک طرف

جب ایک دُوسرے کے ہم قریب تر پہنچے
تو ہٹ گیا وہ ذرا مُسکرا کے ایک طرف

وہ آپ میری پذیرائی کو اُٹھا تو سہی
خبر ہی لی نہ پھر اُس نے بٹھا کے ایک طرف

ابھی میں اُس گل و گلزار کو ترستا ہوں
مری رسائی ابھی ہے قبا کے ایک طرف

وہ ایک بوسہ جو اطراف کو محیط رہا
بھلا تو رکھ دیا ہم نے اُٹھا کے ایک طرف

ہماری اُس کی مُلاقات ہونے والی ہے
خُدائی سے کہیں باہر، خُدا کے ایک طرف

اب اس سے آگے مجھے راستہ نہیں ملتا
پہنچ گیا ہوں کہیں ماورا کے ایک طرف

ابھی رہے گی یہ بیگانگی، ظفرؔ، کہ ابھی
بھٹکتے پھرتے ہیں میری صدا کے ایک طرف

☆

ہو رہا ہے جو تماشا سرِ دست
تم نے دیکھا اسے ہوتا سرِ دست

اس کا انجام تو ہو گا جو بھی
اس کو کہہ سکتے ہو اچھا سرِ دست

میں بھی دُنیا کی حمایت میں ہوں
اور مرے ساتھ ہے دُنیا سرِ دست

اس کا نکلے گا نتیجہ کیسا
سوچ لیتے اگر اتنا سرِ دست

کل کی جو بات ہے وہ کل جانے
نام لیتے ہیں تُمھارا سرِ دست

تُجھ سے کم تر ہی سہی ، کیا کچھ
نہیں ملتا ترے جیسا سرِ دست

وہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے
میں نے چھو کر اُسے دیکھا سرِ دست

صاف بھی مجھ کو بتا سکتے ہو
پیار دے سکتے ہو کتنا سرِ دست

کیا کرے گا اُسے حاصل کر کے
کر ، ظفر ، اُس کی تمنا سرِ دست

☆

اک فضا چاہیے ہے
اور کیا چاہیے ہے

حال کیا پُوچھتے ہو
بس ، دُعا چاہیے ہے

گھر ہے سُنسان بہت
اک بلا چاہیے ہے

سر ہیں درکار کئی
کربلا چاہیے ہے

اُس نے روکا ہے اگر
بھاگنا چاہیے ہے

چاہنے کو نہیں کچھ
اور کیا چاہیے ہے

اصل میں لال ہے جو
وہ ہرا چاہیے ہے

کر چکے عزمِ سفر
راستا چاہیے ہے

خاک ہے ، اور ، ظفر
کیمیا چاہیے ہے

☆

چھتوں پہ چڑھ کے برابر پتنگ اُڑاتے ہیں
سو، کام ہے یہی ، دن بھر پتنگ اُڑاتے ہیں

اُڑا رہی ہیں کہیں دخترانِ نیک اختر
کہیں پہ سارے برادر پتنگ اُڑاتے ہیں

بڑے میاں بھی اگر کھانسنے سے ہوں فارغ
تو چارپائی سے اُٹھ کر پتنگ اُڑاتے ہیں

نوید ہو کہ شریفانِ شہر کے ہمراہ
کبھی چھپے ہوئے لوفر پتنگ اُڑاتے ہیں

جو مالکان کسی اور کام میں لگ جائیں
تو اتنی دیر میں نوکر پتنگ اُڑاتے ہیں

خلیل خاں بھی یہاں اب تو فاختہ کی جگہ
جہاں بھی دیکھیے ، اکثر پتنگ اُڑاتے ہیں

کھلی فضا میں لڑاتے ہیں شام تک پیچے
تو رات پڑنے پہ اندر پتنگ اُڑاتے ہیں

دکھائی دیتے ہیں بس خال خال ہی اب تو
جو اپنی ذات سے باہر پتنگ اُڑاتے ہیں

ہم اس برس بھی ، جو لوٹی تھی پچھلے سال ، ظفر
وہی پرانی پھٹیچر پتنگ اُڑاتے ہیں

-☆-

باغ کا باغ ہی تھا قابلِ دید
چلتی رہتی تھی ہوا قابلِ دید

زندگی بھر کی ریاضت کے طفیل
مَیں نے اک لفظ لکھا قابلِ دید

ایک وہ ہی نظر آیا نہ کہیں
ورنہ سب کچھ ہی رہا قابلِ دید

تم کسی حال میں دیکھو اُس کو
وہ تو ہوتا ہے سدا قابلِ دید

قابلِ دید تھا سارا ماحول
اور ، وہ سب سے جُدا قابلِ دید

وہ تو سب کو ہی لگا تھا اچھا
اُس کو سب نے ہی کہا قابلِ دید

وہ تو وہ ، اُس کے علاوہ بھی ہے
ہر طرف اُس کی فضا قابلِ دید

کہیں روشن کروں آنکھیں مَیں بھی
کچھ تو مجھ کو بھی دکھا قابلِ دید

اُس کی راہوں کے شجر ، اور ، ظفر
اُس کی گلیوں کے گدا قابلِ دید

-☆-

فقرہ جو ہے ابھی اُسے مصرع بناؤں گا
پہلے بنا نہ ہو کبھی ، ایسا بناؤں گا

صحرائے تشنگی کے کہیں درمیان سے
موجیں اُچھالتا ہُوا دریا بناؤں گا

دیکھو تو ایک فرش بچھاؤں گا بے زمیں
دیوار کے بغیر دریچہ بناؤں گا

تھوڑا بہت بناؤں گا مَیں دُوسروں کے ساتھ
باقی جو بچ رہا اُسے تنہا بناؤں گا

بنتے ہی بنتے شکل نکل آئے گی کوئی
مُجھ کو بھی کُچھ پتا نہیں کیسا بناؤں گا

پہلے تو مَیں بناؤں گا خُوب اُس کو شوق سے
پھر توڑ دُوں گا ، اور ، دوبارہ بناؤں گا

ایسے بھی منتظر مرے ، ویسے بھی ہیں یہاں
ایسا بناؤں گا ، کبھی ویسا بناؤں گا

کیا کُچھ بنانے والا ہُوں اپنے تئیں ، مگر
جب کُچھ نہ بن سکا تو بہانہ بناؤں گا

جیسی بھی ہے ، مرے لیے کافی نہیں ، ظفر
اپنے لیے اب اور ہی دُنیا بناؤں گا

-☆-

چھت کا پنکھا چل رہا ہے
اور اُلٹا چل رہا ہے

ہو رہے ہیں کام اپنے
نام اُس کا چل رہا ہے

رُک گئے ہیں رُکنے والے
چلنے والا چل رہا ہے

یہ سفر ظاہر ہے سب پر
کون کتنا چل رہا ہے

کب سے جو بیٹھا ہے تھک کر
وہ بھی اچھا چل رہا ہے

سکۂ باطل یہاں پر
کیسا کیسا چل رہا ہے

روکتے تھے راہ جس کی
وہ زیادہ چل رہا ہے

جائے گا آخر گڑھے میں
جو بھی سیدھا چل رہا ہے

گر کے اُٹھا ہے ظفر ، جو
رفتہ رفتہ چل رہا ہے

-☆-

بات مشکل ہے ، نظارا بند ہے
یعنی کاروبار سارا بند ہے

عشق آگے جا نہیں سکتا ابھی
اپنی جانب کا اشارہ بند ہے

صحن کی دیوار اُونچی ہے بہت
اور ، دروازہ تمہارا بند ہے

چل رہا ہے اور تو سب کا حساب
ایک بس کھاتا ہمارا بند ہے

اک سمندر اُس کی آنکھوں میں ہے قید
اور گریباں میں ستارہ بند ہے

روکیے گا کاروبارِ دل ، کہ اب
نفع ہے جاری ، خسارہ بند ہے

پھیلنے سے روک رکھا ہے اِسے
کائنات اپنی کنارہ بند ہے

کھولیے کھڑکی محبت کی اگر
جو کئی دن سے دوبارہ بند ہے

زور کرتا باہر آنے کو ظفر
کھال کے اندر بچارہ بند ہے

-☆-

طعنہ سا گمرہی کا
عشق وہی ہے وہی کا

آگے جاتی نے سُنا
رولا پیچھے رہی کا

بڑھ کر پُوری سے بھی ہے
مطلب آدھی کہی کا

ملبا وُہی قدیم ہے
نئی عمارت ڈھی کا

کچھ تو لطف اُٹھایئے
بستر پر دوتہی کا

عیش تجاہل کا کبھی
کبھی عذاب آگہی کا

کچھ تو نکلے گا کہیں
کھاتا کھولیے بہی کا

کچھ تکلیف اَن سُنی کی
کچھ آرام اَن سہی کا

یہی محبت ہے ، ظفر
دُودھ میں چھینٹا دہی کا

-☆-

آر سے پار کسی اور طریقے سے ہُوا
قابلِ کار کسی اور طریقے سے ہُوا

دل جو دھڑکا تھا اُسے دیکھتے ہی پہلے پہل
یہ لگاتار کسی اور طریقے سے ہُوا

اُس کی دُشوارگزاری تو عجب تھی، لیکن
اتنا ہموار کسی اور طریقے سے ہُوا

اپنے اُسلوب سے کچھ ہم بھی اُسے ہٹ کے ملے
وہ بھی دوچار کسی اور طریقے سے ہُوا

عرضِ حال اُس سے کسی اور طرح چاہتے تھے
لیکن، اِظہار کسی اور طریقے سے ہُوا

کہیں ممکن ہی نہیں تھا مرا یکسُو ہونا
پھر، یہ انبار کسی اور طریقے سے ہُوا

ایک بار اُس کا طریقہ تھا کوئی اور، مگر
دُوسری بار کسی اور طریقے سے ہُوا

اُس کا اِمکاں نہ رہا اور طریقے سے تو وہ
چار و ناچار کسی اور طریقے سے ہُوا

شائبہ تھا کوئی اِقرار کا بھی اُس میں، ظفر
اب کے اِنکار کسی اور طریقے سے ہُوا

☆

تھوڑا بہت جواب و سوال اُس کے ساتھ ہے
کچھ رابطہ جو اپنا بحال اُس کے ساتھ ہے

وہ آ لگا ہے سوچ کے ساحل سے اس طرح
ہر خواب اُس کے پاس، خیال اُس کے ساتھ ہے

گستاخ بھی جو ہیں تو ہیں اُس کی رضا سے ہم
ہے یُوں کہ اپنی ساری مجال اُس کے ساتھ ہے

ڈرتے تھے اپنے آئنۂ دل کی دیکھ بھال
اور، وہ بھی ٹُوٹنے کی مثال اُس کے ساتھ ہے

خُود ہی گرائے گا مجھے خُود ہی اُٹھائے گا
سارا مرا کمال و زوال اُس کے ساتھ ہے

کچھ تو ہُوا بھی سامنے کی ہے وہاں بہت
کچھ یُوں بھی نازشِ پروبال اُس کے ساتھ ہے

ہر لحظہ اک خیال خُودآرا ہے رُوبرُو
ہر لمحہ ایک خوابِ جمال اُس کے ساتھ ہے

ہر رات ایک صبحِ مسرت ہے سامنے
ہر روز ایک شامِ وصال اُس کے ساتھ ہے

اپنی بھی بھول جائے گا کچھ روز میں ظفر
کوّا ہے، اور، ہنس کی چال اُس کے ساتھ ہے

☆

جو بوڑھا ہوں تو کیوں دل میں محبت زور کرتی ہے
میں جتنا چپ کراتا ہوں یہ اُتنا شور کرتی ہے

میں اُڑتا پھرتا رہتا ہوں فضاؤں میں، ہواؤں میں
برس جانے کی حسرت ہی مجھے گھنگھور کرتی ہے

میں چوری کم، زیادہ ہیرا پھیری کرتا رہتا ہوں
کوئی شے ہے جواب بھی مجھ کو اُس کا چور کرتی ہے

زمین و آسماں کے درمیاں جم سا گیا ہے وہ
یہ دُور اُفتادگی بھی مجھ کو اُس کی ڈور کرتی ہے

پسینے اور پُروائی کے بیچوں بیچ کی دُنیا
بھی مُنہ موڑ کر موسم کا میری اور کرتی ہے

زیادہ دیر رہ جائے تو خاک و آب کی دُوری
بدن کو بانجھ کرتی اور زمیں کو تھور کرتی ہے

نہ ہو جب ناچتے پیڑوں کا کوئی دیکھنے والا
تو اس جنگل کی تنہائی ہی اُن کو مور کرتی ہے

لہو کا ذائقہ جب رفتہ رفتہ مُنہ کو لگ جائے
تو یہ چیز آدمی کو آپ آدم خور کرتی ہے

ظفر، بیزار ہو جاتا ہوں اپنے آپ سے اکثر
رفاقت ہی یہ ایسی ہے کہ مجھ کو بور کرتی ہے

☆

جُدا ہوا تھا میں اس خاکداں سے پہلے ہی
زمیں نے ظلم کیا آسماں سے پہلے ہی

ادا کرے گا یہ کردار کوئی اور ہی اب
نکل چکا ہوں میں اس داستاں سے پہلے ہی

بچا کھچا مرا سامان بھی نہیں دیتے
مجھے نکال دیا ہے مکاں سے پہلے ہی

جہاں سے جا نہیں سکتا ہوں، جاؤں بھی تو کہاں
وگرنہ تنگ بہت ہوں وہاں سے پہلے ہی

مقام اور ہی تھا وہ بجائے منزل، میں
پہنچ گیا تھا جہاں کارواں سے پہلے ہی

ہے اب تو صرف اشاروں پہ انحصار مرا
کہ بے نیاز ہوا ہوں زباں سے پہلے ہی

نیا نیا سفرِ خواب کیا ہوا درپیش
کہ تھک کے بیٹھ گئے درمیاں سے پہلے ہی

ہمارے طور طریقے تھے مستزاد اُس پر
تمام لوگ تھے کچھ بدگماں سے، پہلے ہی

گلی گلی مجھے کیا ڈھونڈتے ہیں لوگ، ظفر
کہ میں تو جا بھی چکا ہوں یہاں سے پہلے ہی

☆

ہو جیسے چہرہ کوئی خدوخال سے خالی
پڑا ہے دل ترے خواب و خیال سے خالی

کوئی بتائے، ہم اُس کا حساب کیا رکھتے
وہ زندگی جو رہی ماہ و سال سے خالی

سب اپنی اپنی بُرائی پہ آ گئے آخر
ہُوا جو شہر کسی خوش خصال سے خالی

اسی لیے تو ہُوں محفوظ اُٹھائی گیروں سے
کہ مَیں ہمیشہ سے ہُوں جان و مال سے خالی

نہ کوئی دن ہے کسی انتظار سے محروم
نہ رات ہے کوئی وہمِ وصال سے خالی

وہاں بھی کُچھ نہیں اُس پاس بھیک دینے کو
یہاں بھی کاسۂ جاں ہے سوال سے خالی

کُچھ اب تو راہ پہ لانا ہے گھیر کر اُس کو
کہ ڈھب پہ آئے گا کیا بول چال سے خالی

مرے کمالِ سخن کا یہی تقاضا تھا
کہ مَیں رہُوں نہ اُمیدِ زوال سے خالی

کُچھ ایسے اُس کے حوالوں سے بھر چکا ہُوں، ظفر
کہ مُجھ کو ہونا پڑا اپنے حال سے خالی

-☆-

جھوٹا کہنا چاہتے ہو
اب کیا کہنا چاہتے ہو

مَیں پہلے ہی جانتا ہُوں
جیسا کہنا چاہتے ہو

ایک ہی بار یہ کر لو طے
کتنا کہنا چاہتے ہو

جانتے ہو کیا خُود بھی تُم
کیسا کہنا چاہتے ہو

یعنی کم کہنے کے بجائے
سارا کہنا چاہتے ہو

قطعِ تعلّق کر کے بھی
اپنا کہنا چاہتے ہو

دریا لہجے میں مُجھ کو
صحرا کہنا چاہتے ہو

جیسا کہہ نہیں سکتے تُم
ایسا کہنا چاہتے ہو

پھر میٹھے لفظوں میں، ظفر
کڑوا کہنا چاہتے ہو

-☆-

پاس ہونے بھی نہ دے ، ہونٹ بھگونے بھی نہ دے
شور کرتا ہُوا دریا مُجھے سونے بھی نہ دے

بات کو ایک طرف تو وہ لگائے آ کر
کہ نہ ہونے بھی نہ دے ، اور ، مجھے ہونے بھی نہ دے

ڈھونڈ ہی لیتا ہے رُوپوش جہاں ہو جاؤں
وہ مُجھے اتنے بڑے شہر میں کھونے بھی نہ دے

یعنی تیار بھی رکھے وہ محبت کی زمیں
اور ، پھر بیج مُلاقات کا بونے بھی نہ دے

چار سُو چاند ستارے بھی ہوں اُس کے جھلمل
اور ، اُنھیں شاخِ تماشا میں پرونے بھی نہ دے

کہیں یکتائی بھی رہنے نہیں دیتا وہ کوئی
اور ، کوئی چیز کسی شے میں سمونے بھی نہ دے

بارشوں کو بھی الگ روک رکھا ہے ، اور ، اب
دل کی دیوار پہ لکھا ہُوا دھونے بھی نہ دے

پانیوں میں کوئی لہر ایسی بھی شامل ہے کہ جو
کشتیِ خواب کو تا صبح ڈبونے بھی نہ دے

کیا کہیں ، خاک ہُوئے کس کی تمنا میں ، ظفر
کہ زبردست ہے ، مارے بھی وہ ، رونے بھی نہ دے

-☆-

برملا لکھی ہُوئی ہو ، یا زُبانی چاہیے
بات جتنی بھی ہے ، کُچھ اُس کی نشانی چاہیے

دل میں دو باتیں ہیں ، لیکن یہ نہیں مُجھ کو پتا
کیا بتانی چاہیے اور کیا چھپانی چاہیے

ایک دن دم توڑ دے گا دل محبت کے بغیر
زندہ رہنے کے لیے مچھلی کو پانی چاہیے

ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے ابر سا اُس کا خیال
دھوپ ہے ، سر پر کوئی چادر ہی تانی چاہیے

جان پر جھیلے ہیں آسیب زمیں ہم نے بہت
کوئی اب کے تو بلائے آسمانی چاہیے

خُود ہی اُن سے فاصلہ رکھنے لگے ہیں اب تو ہم
آخری تدبیر یہ بھی آزمانی چاہیے

شور برپا ہے زمانوں سے مرے چاروں طرف
کوئی اندر سے بھی اب آواز آنی چاہیے

کون سی میری حدیں ، اور ، کس لیے میرا حساب
مَیں سمندر ہُوں تو مُجھ کو بےکرانی چاہیے

ہیں گھیے مضمون و معنی بند موجوں میں ، ظفر
اور اب کتنی طبیعت کو روانی چاہیے

-☆-

پائے ہوئے اس وقت کو کھونا ہی بہت ہے
نیند آئے تو اس حال میں سونا ہی بہت ہے

اتنی بھی فراغت ہے یہاں کس کو میسّر
یہ ایک طرف بیٹھ کے رونا ہی بہت ہے

تجھ سے کوئی فی الحال طلب ہے نہ تمنّا
اس شہر میں جیسے ترا ہونا ہی بہت ہے

ہم اوڑھ بھی لیتے ہیں اسے وقتِ ضرورت
ہم کو یہ محبت کا بچھونا ہی بہت ہے

اُگتا ہے کہ مٹی ہی میں ہو جاتا ہے مٹی
اس بیج کا اس خاک میں بونا ہی بہت ہے

خوشحال بھی ہو سکتا ہوں میں چشم زدن میں
میرے لیے اُس جسم کا سونا ہی بہت ہے

اپنے لیے ان چاند ستاروں کو سرِ شام
اس شاخِ تماشا میں پرونا ہی بہت ہے

پہلے ہی بہت خاک اُڑائی ہے یہاں پر
میرے لیے اس دشت کا کونا ہی بہت ہے

دریا کی روانی کو، ظفر، چھوڑیے، فی الحال
تھوڑا سا یہ ہونٹوں کو بھگونا ہی بہت ہے

☆

رہے کچھ راہ سے ہٹ کر، کبھی تھے راہ کے اندر
بڑی مشکل سے پہنچے ہم تماشاگاہ کے اندر

مقرر ہے جو ماہانہ ملاقات اُس کے ساتھ اپنی
سو، کرتے ہیں بسر اوقات اسی تنخواہ کے اندر

حسابِ حُسن کرنے آ گئے ہو، یہ تو بتلاؤ
ہمارا بھی تھا کچھ سامان اُس بنگاہ کے اندر

سُنا ہے جو بھی کچھ، اُس پر دوبارہ غور کر لینا
چھپی ہو گی کہیں سچائی بھی افواہ کے اندر

چلا تھا وہ بھی اک موجِ محبت کی روانی میں
رُکا ہوں میں بھی آ کر لمحۂ ناگاہ کے اندر

اُسی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں جو گم ہو چکا مجھ سے
سوارِ خواب تھا کوئی غبارِ ماہ کے اندر

بچا لوں گا بدن کو اور تو ہر آگ سے، لیکن
ہوا کرتا ہے اک اپنا شرر بھی کاہ کے اندر

رعایا دم بخود ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے
دھماکے ہو رہے ہیں بارگاہِ شاہ کے اندر

ظفر، تحسین و تنقیص ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں
وہی کچھ واہ میں شامل ہے جو ہے آہ کے اندر

☆

سمندر کا کنارہ دیکھنا کافی نہیں تھا
مری جانب تمھارا دیکھنا کافی نہیں تھا

کبھی محسوس بھی کرتے ہم اس کو پاس جا کر
نظر بھر کر نظارا دیکھنا کافی نہیں تھا

ہوا کے رُخ کا اندازہ بھی کرنا تھا ضروری
اُن آنکھوں کا اشارہ دیکھنا کافی نہیں تھا

کوئی سوچ مروّت بھی تو ہوگی دل میں اُس کے
اُن آنکھوں میں شرارہ دیکھنا کافی نہیں تھا

اُسے مڑ کر دوبارہ دیکھنا اچھا تھا ، لیکن
اُسے مڑ کر دوبارہ دیکھنا کافی نہیں تھا

بچا رکھتے کوئی دیدار کا ٹکڑا ہی اُس دن
اُسے سارے کا سارا دیکھنا کافی نہیں تھا

چھپا کر دیکھتے تو اور کھل کر دیکھ سکتے
کہ اتنا آشکارا دیکھنا کافی نہیں تھا

مقدّر کو بنانے کی بھی کوئی سعی کرتے
مقدّر کا ستارہ دیکھنا کافی نہیں تھا

ظفرؔ، کچھ فائدے کی فکر بھی کرنی تھی آخر
خموشی سے خسارہ دیکھنا کافی نہیں تھا

-☆-

کسی پیاس کی پاسبانی میں ہے
یہیں کوئی دریا روانی میں ہے

ضرورت بہت ہے یہاں ، اور ، اُدھر
توقف ابھی مہربانی میں ہے

وہ شرطیں سبھی اپنی منوا چکا
تو اب کس لیے سرگرانی میں ہے

کوئی دوسری بات ہے درمیاں
کسی اور ہی بدگمانی میں ہے

محبت میں ڈوبا ہوا ہوں تمام
یہ پچھلی شب و روز پانی میں ہے

جہاں وہ کھڑا ہے مرا منتظر
کوئی موڑ ایسا کہانی میں ہے

بچا تھا اگر رائگانی سے کچھ
تو سب وہ بھی اب رائگانی میں ہے

بہت ذائقے ہیں زباں کے مگر
مزہ اور ہی بے زبانی میں ہے

ہواؤں کو روکے ہوئے ہے ظفرؔ
سو ، کب سے اسی بادبانی میں ہے

-☆-

سبزہ تھا، اور، باغ تھے صحرا کے دائیں بائیں
دُنیائیں تھیں کچھ اور بھی دُنیا کے دائیں بائیں

پیدا کیا ہے میں نے، سو، بے وجہ بھی نہیں
اتنا غُبار نقش ہویدا کے دائیں بائیں

اک خواب چل رہا تھا مرے آئنے میں رات
خُوش بُو تھی ساتھ ساتھ، سراپا کے دائیں بائیں

ہو اور بھی کوئی متبادل تو خُود بتائے
کچھ بھی نہیں تھا بوسہ بے جا کے دائیں بائیں

کچھ پھول میں نے اور اُگائے ہیں، اور، ابھی
کچھ پیڑ، شاہراہِ تماشا کے دائیں بائیں

یُوں بچ نہیں سکے ہیں کنارے بھی اس دفعہ
دریا سا ہے جو آج بھی دریا کے دائیں بائیں

مجھ کو کہیں دکھائی تو دے، ہم قدم تو ہو
کچھ ہے جو میری ہستیِ تنہا کے دائیں بائیں

بے فُرصتی ہے اتنی کہ ہوتا ہے اب کوئی
ادنیٰ کے آس پاس نہ اعلیٰ کے دائیں بائیں

اچھے سہی، ظفرؔ، مگر اتنا تو دیکھیے
ہیں کون کون حضرات والا کے دائیں بائیں

☆

تھرتھری پھیلی ہُوئی ایک زمانے تک ہے
اور، یہ صُورت بھی ترے پردہ گرانے تک ہے

اب تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دل میں ترا نام
یاد رکھنے کے لیے ہے کہ بھلانے تک ہے

جل رہا ہے جو دیا سا ترے رستے پہ یہ دل
اِک ترے موج ہوا ہو کے بُجھانے تک ہے

اب تو ظاہر ہے کہ ایسے میں ہمارا بھی قیام
اپنا سامان ترے گھر سے اُٹھانے تک ہے

ہم تو سمجھے تھے کہ یہ دل کا اندھیرا سارا
موم بتی سی محبت کی جلانے تک ہے

مختصر ہے کہیں انداز تغافل کا حساب
حد کوئی اُس کی مجھے خواب دکھانے تک ہے

دشتِ دل جس کا کہیں کوئی کنارہ ہی نہیں
اِس کی رونق بھی مرے خاک اُڑانے تک ہے

غالباً اُس کی ضرورت ہے زیادہ، ورنہ
چور کا کام مرے شور مچانے تک ہے

جانتا ہُوں کہ سفر کی یہ رُکاوٹ بھی، ظفرؔ
اپنی دیوار کو رستے سے ہٹانے تک ہے

☆

یہیں کہیں تھا، مگر، ہمارے لیے نہیں تھا
کہیں نہیں تھا اگر ہمارے لیے نہیں تھا

سنبھال رکھی تھیں ہم نے سمتیں کئی، مگر، وہ
اسی طرف تھا جدھر ہمارے لیے نہیں تھا

مکان اپنا بھی سامنے ہی کہیں تھا، لیکن
وہ جلوۂ بام و در ہمارے لیے نہیں تھا

اک اور ہی شخص آ کے اب ہو گیا تھا قابض
جو خود بنایا تھا، گھر، ہمارے لیے نہیں تھا

پتا چلا منزلِ محبت پہ آ کے ہم کو
کہ اصل میں یہ سفر ہمارے لیے نہیں تھا

ہمارا حصّہ تھا اپنی عمرِ عزیز میں جو
کچھ اس کا بھی بیشتر ہمارے لیے نہیں تھا

کچھ اور بھی لوگ تھے شریکِ ستم یہاں پر
یہ آسمان سربسر ہمارے لیے نہیں تھا

بس ایک موقع ملا تھا اُس کی طرف سے ہم کو
مگر، وہ بارِ دگر ہمارے لیے نہیں تھا

ظفرؔ، یونہی پھنس گئے تھے گرداب شاعری میں
وگرنہ یہ بھی ہنر ہمارے لیے نہیں تھا

-☆-

اکیلے کیا کبھی گھر میں کبھی دفتر میں ہونا ہے
کہ ہونا تو وہی ہونا ہے جو اکثر میں ہونا ہے

بہم آمیز ہیں کیا خانہ خواب ہوس میں ہم
ابھی کچھ اور بھی دیوار و بام و در میں ہونا ہے

کوئی چکر ہمارے پانو میں رہتا ہے روزانہ
اسی صورت کوئی سودا ہمارے سر میں ہونا ہے

سراسر دیدنی ہے برق رفتاری زمانے کی
ابھی اک پل میں ہو سکتا ہے جو دن بھر میں ہونا ہے

کہیں آپس میں ہی دست و گریباں ہیں، مگر شاید
یہ ہنگامہ تو آخر ایک دن گھر گھر میں ہونا ہے

اُسی کو دیکھنے کا منتظر ہوں ایک مدّت سے
تماشا سا جو اپنے آپ سے باہر میں ہونا ہے

ارادہ کر لیا ہے اب یہاں سے کوچ کرنے کا
کہ اس گھر میں تو ہونا عرصۂ محشر میں ہونا ہے

ابھی واضح نہیں خواہش کی کوئی شکل آنکھوں میں
ابھی کچھ اور اِس بُت کو کسی پتھر میں ہونا ہے

ظفرؔ، سعیِ سخن جیسی بھی ہو، معلوم ہے مجھ کو
کہ اس تصویر کو اک منظرِ دیگر میں ہونا ہے

-☆-

منت کے باوجود ، منانے کے باوجود
یُوں ہی رہا وہ ساتھ سُلانے کے باوجود

آنے سے تو کیا ہی تھا انکار اُس نے صاف
اُٹھ کر بھلا نہیں مرے جانے کے باوجود

اس کا تو کوئی وہم و گماں بھی نہ تھا مجھے
کھویا رہوں گا میں اُسے پانے کے باوجود

سچ پُوچھیے تو ہم ہی رہے اتنے بے شعور
خُوش باش تھے جو رنج اُٹھانے کے باوجود

یا ہم نہیں تھے یا یہ زمانہ نہ تھا کہیں
تنہا تھے ہم جو سارے زمانے کے باوجود

جو بات اصل تھی وہ بیاں ہی نہیں ہُوئی
اک عُمر اتنا شور مچانے کے باوجود

باقی ہے ایک دُھوپ گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ
اک داغ رہ گیا ہے مٹانے کے باوجود

برکت ہی اب نہیں ہے کسی چیز میں ، کہ ہُوں
بے روزگار اتنا کمانے کے باوجود

دل سے تو اُس نے کُفر نکالا نہیں ، ظفر
ایمان اُس پہ اب مرے لانے کے باوجود

☆

رستہ بھی ہو جیسے کہیں دیوار کے برعکس
مطلب تھا کوئی اور بھی انکار کے برعکس

آخر جہاں آنکھوں کی ضرورت نہیں پڑتی
دیدار ہے ایک اور بھی دیدار کے برعکس

جس موڑ پہ میں منتظرِ خواب و خبر تھا
ہے اور کوئی اب ترے آثار کے برعکس

پسپا مرے ہونے کا تو امکاں نہیں ، لیکن
کُچھ بھی اثر اُس پر نہیں اصرار کے برعکس

اتنی بھی نہ تھی چھاؤں کہ ہم بیٹھ ہی سکتے
اشجار ہی اشجار تھے اشجار کے برعکس

اک نقش ہُوا حلقۂ تصویر سے باہر
اک نیند رہی دیدۂ بیدار کے برعکس

کیا کیا مرے درپیش رہی سارے سفر میں
راہوں کی رُکاوٹ مری رفتار کے برعکس

تھا کوئی تو ہمت جو بڑھاتا رہا میری
اک حوصلہ مُجھ میں رہا ناچار کے برعکس

بازار ہی غائب تھا ظفر جب وہاں پہنچے
اک سلسلۂ گرمیِ بازار کے برعکس

☆

نہیں کہ تیرے اشارے نہیں سمجھتا ہوں
سمجھ تو لیتا ہوں ، سارے نہیں سمجھتا ہوں

ترا چڑھا ہوا دریا سمجھ میں آتا ہے
ترے خموش کنارے نہیں سمجھتا ہوں

کدھر سے نکلا ہے یہ چاند ، کچھ نہیں معلوم
کہاں کے ہیں یہ ستارے ، نہیں سمجھتا ہوں

کبھی کبھی مجھے اپنی خبر نہیں ملتی
کبھی کبھی ترے بارے نہیں سمجھتا ہوں

سمجھ میں آتے ہیں میری چھپے ہوئے منظر
جو سامنے ہیں نظارے نہیں سمجھتا ہوں

جو دائیں بائیں بھی ہیں ، اور ، آگے پیچھے بھی
انھیں میں اب بھی تمھارے نہیں سمجھتا ہوں

خود اپنے دل سے بھی اختلاف ہے میرا
کہ میں غموں کو غبارے نہیں سمجھتا ہوں

کبھی تو ہوتا ہے میری سمجھ سے باہر ہی
کبھی میں شرم کے مارے نہیں سمجھتا ہوں

کہیں تو ہیں جو مرے خواب دیکھتے ہیں ، ظفر
کوئی تو ہیں جنھیں پیارے نہیں سمجھتا ہوں

-☆-

ملا نہیں تو چھینا ہے
یہی ہمارا جینا ہے

پیچھے ہے کیا عکس انداز
آگے تو آئینہ ہے

اُس کی مئی میں شامل
اپنا خون پسینا ہے

آپ اُدھیڑا ہے اس کو
خود ہی بیٹھ کے سینا ہے

لے آئے ہیں ساتھ ہی وہ
جو کچھ کھانا پینا ہے

جسے قباحت کہتے ہو
اسی کا نام قرینہ ہے

جس کی قسمت میں جو ہو
کھدر ہے ، پشمینہ ہے

موقع بھی موجود ہے آج
خواہش بھی دیرینہ ہے

بہت بڑا افسر ہے ، ظفر
بہت ہی بڑا کمینہ ہے

-☆-

گرنے کی طرح کا نہ سنبھلنے کی طرح کا
سارا وہ سفر خواب میں چلنے کی طرح کا

بارش کی بہت تیز ہوا میں کہیں مجھ کو
درپیش تھا اک مرحلہ جلنے کی طرح کا

اک چاند اُبھرنے کی طرح کا مرے باہر
سُورج مرے اندر کوئی ڈھلنے کی طرح کا

ایسا ہے کہ رہتا ہے سدا ساتھ بھی اُس کے
منظر کوئی پوشاک بدلنے کی طرح کا

اُڑتی ہُوئی سی ریت وُہی دشت میں ہر سُو
پانی وُہی دریا میں اُچھلنے کی طرح کا

کیسی یہ خزاں چھائی ہے مُجھ میں کہ سراسر
موسم ہے وُہی پھولنے پھلنے کی طرح کا

کیا دل کا بھروسا ہے کہ اس آب و ہوا میں
ویسے ہی یہ پودا نہیں پلنے کی طرح کا

معلوم بھی تھا مُجھ کو، مگر بھول چُکا ہُوں
رستہ کوئی جنگل سے نکلنے کی طرح کا

مَیں تو یہی سمجھا، ظفر، اس بار بھی شاید
مُجھ پر یہ بُرا وقت ہے ٹلنے کی طرح کا

☆

کبھی غُبار میں ہُوں، اور، کبھی فشار میں ہُوں
ابھی خبر نہیں مَیں کِس کے اختیار میں ہُوں

ہے اور طرح کی آبادی، اور، ویرانی
عجیب دشت میں ہُوں، اور عجب دیار میں ہُوں

وہاں پہ تھا تو کسی اور سبزہ زار میں تھا
یہاں پہ ہُوں تو کسی اور سبزہ زار میں ہُوں

یہ راستے بھی جُدا ہیں، سفر بھی سب سے الگ
مَیں کُچھ دنوں سے کِسی اور ہی مدار میں ہُوں

یہی سفر مری منزل ہے میرا مقصد بھی
اگر مَیں اپنے پسندیدہ رہگُزار میں ہُوں

خیال کیا مُجھے سُود و زیاں کا ہو، کہ ابھی
یہی بہت ہے کہ مَیں اپنے کاروبار میں ہُوں

ابھی کسی کو یہ اندازہ ہو نہیں سکتا
مَیں کِس قطار میں، اور، کون سے شُمار میں ہُوں

کوئی مُجھے نظرانداز کیا کرے گا یہاں
کہ ایک بار میں ہُوں، اور بار بار میں ہُوں

بدی کا بیج کہ مُجھ میں سما چُکا ہے، ظفر
اب اس کے پھُوٹ نکلنے کے اِنتظار میں ہُوں

☆

یہی نہیں کہ دلِ زار سے اُلجھتا ہے
وہ روز شہر میں دو چار سے اُلجھتا ہے

رہائی چاہتا ہے میری قید سے ترا خواب
جو در نہیں ہے تو دیوار سے اُلجھتا ہے

ہوائے تند کا جھونکا نہ جانے کیوں سرِ شام
بچے کھچے مرے آثار سے اُلجھتا ہے

شکست و فتح نہیں، حوصلے کی بات ہے یہ
جو ابر آج بھی کہسار سے اُلجھتا ہے

جو گھر کا نقشہ ہی اُس نے دیا ہُوا ہے غلط
تو پھر وہ کس لیے معمار سے اُلجھتا ہے

کوئی تو ہے جو سراسر بہاو کے برعکس
مخالف آتی ہوئی دھار سے اُلجھتا ہے

سخن سرائی کی توفیق اگر یہی ہے تو پھر
خیال کس لیے اظہار سے اُلجھتا ہے

وہ جس کا مال خریدار سے رہے محروم
ہمیشہ گرمیِ بازار سے اُلجھتا ہے

ظفر، دکھا کوئی کردار بھی کہ تُو ہر بار
جہاں اُلجھتا ہے، گفتار سے اُلجھتا ہے

☆

اگرچہ اور بہت انتظار میں کچھ تھا
کیا وہی جو مرے اختیار میں کچھ تھا

ملے سُراغ تو آگے بڑھوں کہ جیسے ابھی
مرے علاوہ بھی اس رہگذار میں کچھ تھا

سوال سُود و زیاں ہی نہیں تجارتِ عشق
سوائے اُس کے بھی اِس کاروبار میں کچھ تھا

رہے یہاں سے وہاں تک فضول ہی مصروف
اگرچہ تھا بھی تو پایانِ کار میں کچھ تھا

مرے خیال کی پرواز ہی تھی یہ بھی کوئی
میں ایک بار جو اُس کے شمار میں کچھ تھا

میں آپ اپنی چمک سے رہا بہت حیران
سراب سا جو کسی ریگزار میں کچھ تھا

زمین، چاند، ستارے ہیں روز کا معمول
مگر، اب اور بھی اُس کے مدار میں کچھ تھا

اُسی حساب سے پانی کا شور تھا، لیکن
نیا ہی اب کے وہاں آبشار میں کچھ تھا

سوار خواب تھا یا اور کوئی شے تھی، ظفر
نظر کے سامنے اُٹھتے غبار میں کچھ تھا

☆

جو سلسلہ سا بظاہر دن اور رات کا ہے
یہ اصل میں تو سبھی کھیل ممکنات کا ہے

یہ تیز شور، یہ آندھی، یہ زور کی بارش
میں سُن رہا ہوں جواب ایک میری بات کا ہے

طرح طرح کے مناظر نہیں مرے ہر سُو
یہ ایک بکھرا ہوا عکس میری ذات کا ہے

بیاضِ خواب کو میں کھولتا نہیں خود بھی
حساب اس میں مری ساری کائنات کا ہے

بیانِ وصل ہے ناقابلِ یقیں یکسر
کہ اس میں ذکر ہی سارا عجائبات کا ہے

تمھارے شہر سے کوئی غرض نہیں مجھ کو
سوال صرف محبت کے شاملات کا ہے

ہُوا نہ تھا کبھی اتنا خراب کار ہوس
میں سوچتا ہوں اثر ہی یہ احتیاط کا ہے

لیے پھرے گا نہ جانے کہاں کہاں مجھ کو
سراغ یہ جو کسی اور واردات کا ہے

اب اُس کے ہونے کا انکار لازمی ہے، ظفر
مآلِ کار ذریعہ یہی نجات کا ہے

-☆-

منزلِ خواب دوام آگے ہے
میں ہوں پیچھے، مرا کام آگے ہے

رات روشن ہے جدھر بھی دیکھو
سایۂ ماہِ تمام آگے ہے

نکل آئے ہیں ستارے، لیکن
ایسے لگتا ہے وہ شام آگے ہے

پھڑپھڑاتا ہوں یہاں میں کب سے
اور مرا حلقۂ دام آگے ہے

جو ہوئی تھی وہ محبت نہیں یہ
اصل جو تھا وہ مقام آگے ہے

منتظر شہر سبھی تھا، لیکن
وہ چراغِ سرِ بام آگے ہے

سُست ہونا ہی تھی رفتار مری
کوئی آہستہ خرام آگے ہے

نہیں آرام کے حالات ابھی
چلتے ہی رہیے، قیام آگے ہے

جتنا پس ماندہ ظفر، خُود ہے کلام
اُتنا ہی طرزِ کلام آگے ہے

-☆-

نکال لائے ہیں جانے کہاں کہاں سے مجھے
کہیں اب اور نکالیں گے کیا یہاں سے مجھے

نہیں مرے خس و خاشاک ابھی بہت مایوس
اُمید ہے جو کسی شعلہ رواں سے مجھے

کوئی کسی کی شکایت نہیں تھی میرے خلاف
پکڑ لیا ہے مرے ہی کسی بیاں سے مجھے

اگر تمھاری کہانی سے ہو گیا باہر
تو جوڑ دیں گے کسی اور داستاں سے مجھے

مجھے جب اُن کی شرائط سے اختلاف ہُوا
وہیں پہ چھوڑ دیا لائے تھے جہاں سے مجھے

جو سو طرح سے چھلکتی ہے اُس کی آنکھوں میں
وہ بات کہہ نہیں سکتا کبھی زباں سے مجھے

مفاد کوئی تمھارا بھی اس میں کچھ ہو گا
جدا کیا ہے جو اُس یار مہرباں سے مجھے

وصول کی ہے کبھی مجھ سے ضد کی قیمت
جگا دیا ہے کبھی خواب رائگاں سے مجھے

کبھی زمین سے بے دخل کر دیا مجھ کو
کبھی نکال دیا ہے، ظفر، مکاں سے مجھے

☆

کوئی آتا ہمارے راستے میں
تو اُس کو روک رکھتے راستے میں

تمھارا راستا معلوم ہوتا
تو ہم ہوتے تمھارے راستے میں

نہیں ہے راستا کوئی بھی آگے
ملے ہیں آ کے اچھے راستے میں

وہ جن کا ایک ہی بس راستا ہو
بچھڑ جاتے ہیں کیسے راستے میں

ہمیں منزل سے کیا شکوہ کہ ہم نے
بہت نقصان اُٹھائے راستے میں

ہمیں اندازہ ہی اس کا نہیں تھا
ہیں جتنے عیب سیدھے راستے میں

جداگانہ سفر آغاز کر کے
کسی سے جا کے ملتے راستے میں

سفر آسان ہو جاتا ہمارا
یہی تھا اس انوکھے راستے میں

ظفر، چھوڑو، اب اپنا راستا لو
ہے کیا رکھا کسی کے راستے میں

☆

کسی روک میں، کسی تھام سے اُسے روکنا
کسی بات پر، کسی کام سے اُسے روکنا

کوئی رات ہو، کوئی گھات ہو کسی طرح کی
بڑی بات ہے سرِ شام سے اُسے روکنا

وہ اگر نیازِ نظر سے بھی نہیں رُک رہا
کسی دن سلام و کلام سے اُسے روکنا

جو اسی طرح سے رواں رہا اسی موج میں
تو پڑے گا دانہ و دام سے اُسے روکنا

کسی ایک آدھ سے روکنے میں زیاں نہیں
کہ بجا نہیں ہے تمام سے اُسے روکنا

اُسے روک لو تو بڑے کمال کی بات ہے
نہ رُکے تو پھر مرے نام سے اُسے روکنا

مرے پھول پھل، مرے گھاس پات بکھر گئے
مرے باغِ دل میں خرام سے اُسے روکنا

مرے ہاں وہ آئے نہ آئے، لیکن، ابھی مجھے
ہے کسی کے پاس قیام سے اُسے روکنا

کسی خودسری کے گمان میں نہ رہو، ظفر
کسی عاجزی کے مقام سے اُسے روکنا

☆

اتا پتا کرتے رہنا
اور دُعا کرتے رہنا

یہی محبت ہے، پیارے
روز گلہ کرتے رہنا

سستا مل سکتا ہوں میں
کیوں مہنگا کرتے رہنا

آتے جاتے گلیوں میں
کوئی صدا کرتے رہنا

چھپ کر کیا کرنا ہر کام
کھلا کھلا کرتے رہنا

سب کو خوش رکھنے کے لیے
بھلا بھلا کرتے رہنا

سر پھوڑا ہے، آنکھ جھکائے
بُرا بُرا کرتے رہنا

جھونکا بھی نکلے گا کوئی
ہوا ہوا کرتے رہنا

مجھ کو کیا آتا ہے، ظفر
میں نے کیا کرتے رہنا

☆

کِس کے روح و رواں تھے
اس سے پہلے کہاں تھے

غائب ہو گئے تھے کہاں
آپ جو یہاں نہ وہاں تھے

میرے علاوہ تو یہاں
سارے ہی خوش بیاں تھے

تُم بھی آ گئے اُس طرف
ہم پہلے ہی جہاں تھے

تھی وہ اکیلی ہی وہاں
ساتھ بس اُس کے میاں تھے

شام تھی کیسی ہر طرف
لوگ دُھواں ہی دُھواں تھے

بدلا تھا سب کُچھ وہاں
آپ جہاں کے تہاں تھے

کئی ارادے آپ کے
چہرے سے بھی عیاں تھے

کہاں گئے ہو، اے ظفرؔ!
ابھی ابھی تو یہاں تھے

☆

ہے جو میرا ہی اثر شاملِ حال
اس کو اتنا بھی نہ کر شاملِ حال

زندگی پھر بھی گزرنی تھی یُونہی
آپ ہوتے بھی اگر شاملِ حال

شاملِ حال تھا پہلے میں خُود
اب تو ہے سارا ہی گھر شاملِ حال

فرق یہ دُور بھی ہو گا کہ نہیں
میں اِدھر، آپ اُدھر شاملِ حال

ہو گی خُود فکر اُدھر کی اُس کو
یعنی ہو گا وہ جدھر شاملِ حال

کُچھ پتا ہی نہیں چلتا اب تو
آج کل ہے وہ کدھر شاملِ حال

کُچھ محبت کی فراوانی ہے
اور، کُچھ رہتا ہے ڈر شاملِ حال

کُچھ ہُوا وہمِ تماشا بھی مجھے
کُچھ ہُوا خوابِ ہنر شاملِ حال

میں جو آرام سے بیٹھا ہُوں، ظفرؔ
ہے کُچھ اس میں بھی سفر شاملِ حال

☆

آنوں والی ، شانوں والی
دولت خواب خزانوں والی

اَن دیکھے ، اَن جانے موسم
دُنیا نئے جہانوں والی

کیسی اپنی سی لگتی ہے
صُورت وہ بیگانوں والی

ضلع صفائی باہر باہر
اندر سے گھمسانوں والی

ریشم سے لہجے کی مالک
پتھر کے پیمانوں والی

بُوڑھوں کو اچھی لگتی ہے
حرکت کوئی جوانوں والی

دل کے چار طرف اُتری ہے
گری تنگ مکانوں والی

کتّوں میں بھی ہُوا کرتی ہے
خصلت ایک انسانوں والی

اور ظفرؔ رہنی ہے کب تک
حالت یہ دیوانوں والی

-☆-

نزدیک و دور یُوں ہی خُدا ہے بذاتِ خُود
جیسے کہ ہر طرف یہ ہوا ہے بذاتِ خُود

اب کیا ہمارے ہونے کی دے گا کوئی سزا
ہونا ہمارا ایک سزا ہے بذاتِ خُود

اُس نے بذاتِ خُود نہ سُنا ہو تو اور بات
ہم نے کچھ اُس سے آج کہا ہے بذاتِ خُود

پہلے وہ دُوسروں کے ذریعے تھا ہمکلام
اور ، اب تو بات کرنے لگا ہے بذاتِ خُود

میرا خیال تھا کہ وہ پُوچھے گا آپ ہی
جو آپ مُجھ کو کہنا پڑا ہے بذاتِ خُود

مَیں نے تو کُچھ کہا نہیں ، مُجھ کو تو چھوڑ دو
جو بھی ہُوا ہے وہ تو ہُوا ہے بذاتِ خُود

اِس میں کِسی کا دخل نہیں کوئی بھی یہاں
چھوٹا بذاتِ خُود ہے ، بڑا ہے بذاتِ خُود

جاتا نہیں ہے لے کے عدالت میں اب کوئی
اب جُرم ہے تو اُس کی سزا ہے بذاتِ خُود

خُود ہی بذاتِ خُود ہیں یہاں آپ ، اے ظفرؔ
یا کوئی آپ کے بھی سوا ہے بذاتِ خُود

-☆-

حق بات ہے افسانہ و افسوں کے مقابل
رہنا یہ زمیں کا یونہی گردوں کے مقابل

بڑھتا گیا میں آگے ہی آگے، بہت آگے
اُس خوابِ سفر میں تھی ہوا پنکھوں کے مقابل

اُس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا، وہ کرے کیا
ہے عجز مرا اُس کی اکڑفوں کے مقابل

دہلائیں گے وہ کس لیے یہ سقف و در و بام
اور، آئیں گے کیا میری غُرفوں کے مقابل

کچھ ہے ترے اشغالِ تر و تازہ کے پیچھے
کچھ تھا مرے احوالِ دگرگوں کے مقابل

اچھا تھا وہ کھُل کر ترا انکار ہی کرنا
آہستہ سی، کمزور سی ہاں، ہُوں کے مقابل

اُچھلا تھا جو لہروں سے کوئی نغمۂ نایاب
ٹھہرا نہ مرے زمزمۂ خُوں کے مقابل

اک رنگ تو جچتا ہے، سو، نکلے تو سہی کوئی
کم تر کے مقابل ہو کہ افزوں کے مقابل

اس ہرزہ سرائی کو، ظفر، کوئی جو سمجھے
اک آئنہ ہے خوابِ فلاطوں کے مقابل

☆

اندر کی سمت وسعتِ صحرا تو ہوئے گی
دل کے نواح میں کہیں دُنیا تو ہوئے گی

آنکھوں کو بند کر کے اُسے دیکھنا ہے اب
ایسے میں ہم کو تابِ تماشا تو ہوئے گی

میں جس کی جُستجو میں بھٹکتا ہوں رات دن
صُورت وہ دشت میں کہیں پیدا تو ہوئے گی

خوش بُو لگا کے باغ میں جاتا ہوں اس لیے
اُس گُل سے کوئی راہِ سخن وا تو ہوئے گی

خود کو خبر نہ ہو، یہ الگ بات ہے، مگر
دریا کی تہ میں دولتِ دریا تو ہوئے گی

یکسُو تو ہوئے گی یہ طبیعت بھی ایک دن
بکھری ہوئی یہ سوچ بھی یکجا تو ہوئے گی

اس میں بھی پیش رفت کی نکلے گی کوئی شکل
یہ آرزو کہیں کہیں پسپا تو ہوئے گی

روکے سے رُک نہ پائے گی، سیدھی سی بات ہے
پہلے جو ہو چکی ہے، دوبارہ تو ہوئے گی

ساکت ہیں برگ و بار تو پھر کیا ہوا، ظفر
یہ محفلِ ہوا کہیں برپا تو ہوئے گی

☆

عالمِ خواب میں بہتا نہیں دریا فی الحال
یہیں بیٹھے رہو، اچھا ہے کنارا فی الحال

پائے جا سکتے نہیں کھوئے ہوئے اس کے سُراغ
لائی جا سکتی نہیں تابِ تمنا فی الحال

دیکھنے کی تو وہاں پر کوئی مُہلت ہی نہ تھی
بھیڑ تھی اتنی کہ میں نے اُسے چوما فی الحال

عمر شاید کہ اسی طرح بسر ہو جائے
دیکھنا جا کے اُسے، اور، ترسنا فی الحال

رات ہو، دن ہو، کہیں بیٹھ کے رو لیتے ہیں
ہوتا رہتا ہے کچھ اس طرح گزارہ فی الحال

آپ زحمت نہ کریں، اور، پریشان نہ ہوں
یعنی ایسا بھی نہیں حال ہمارا فی الحال

اس میں کردار تو اپنا نہیں ایسا کوئی
آ ہی پہنچے ہیں تو دیکھیں گے تماشا فی الحال

ایک وقت آئے گا، کچھ بھی نہ رہے گا باقی
دیکھتے جاؤ کہ ہو گا یہاں کیا کیا فی الحال

عاقبت جب ہوئی درپیش تو دیکھیں گے، ظفر
آخری عمر میں کافی ہے یہ دُنیا فی الحال

☆

وہ کچھ ایسا مرے مخالف ہے
بے تحاشا مرے مخالف ہے

کیا مساوات ہے کہ ہر کوئی
ایک جیسا مرے مخالف ہے

جو بُرا ہے وہ میرے حق میں نہیں
اور، اچھا مرے مخالف ہے

میں بھی کس کے یہاں موافق ہوں
یہ جو دُنیا مرے مخالف ہے

تُو ہی تنہا نہیں مرا دشمن
شہر سارا مرے مخالف ہے

ظاہرا ہے مرے خلاف کوئی
کوئی خُفیہ مرے مخالف ہے

کوئی چلتا نہیں پتا ہی یہاں
کون کتنا مرے مخالف ہے

اختلاف اُس سے ہے مجھے بھی، مگر
وہ زیادہ مرے مخالف ہے

مجھے باہر سے کیا گلہ ہو، ظفر
گھر ہی میرا مرے مخالف ہے

☆

پیچھا خمار کا ہے نہ آگا خیال کا
ایسا اُلجھ گیا ہے یہ دھاگا خیال کا

آ جا سکیں بغیر اجازت کے بھی کبھی
لفظوں کے درمیان ہے واہگہ خیال کا

مجھ کو جب اُس کی آمد و شد کی خبر ملی
پہلا گزر چکا تھا پراگا خیال کا

کھینچی ہے قافیے نے کشش آپ ہی یہاں
خاکے سے بن گیا ہے جو خاکہ خیال کا

وحشی کسی نے آ کے اُچک لی گمان کی
ٹکڑا سا چھین کر کوئی بھاگا خیال کا

دم بھر تو اُس نے شور کیا اپنی موج میں
پھر اُڑ گیا منڈیر سے کاگا خیال کا

پھر یہ ہُوا کہ سوچ میں اُس کی پڑے پڑے
انجام کار لگ گیا لاگا خیال کا

صحرا سا ایک اور بھی طے کر کے آئے تھے
دریا سا ایک اور بھی جھاگا خیال کا

اپنی نظر میں بچ نہ سکا کچھ بھی ، اے ظفر
سونے پہ خواب کے ہے سُہاگہ خیال کا

-☆-

کلام ہوتا ہے اپنا بھی دل گداختیہ
مگر ، نکلتا ہے سارے کا سارا آختیہ

ہے اُن کے پیچھے بھی کیا کیا بھرا ہوا بازود
اگرچہ ہوتی ہیں باتیں تمام فاختیہ

دھوئیں نے کوئی کسر ہی نہیں ہے چھوڑ رکھی
ہمارے سامنے منظر ہے رنگ باختیہ

ہم اپنا حصہ بھی ڈالیں تو اس میں کیا ڈالیں
ہے شہر پہلے ہی تاراجیہ و تاختیہ

بلا سے دل اگر اتنا ہی تنگ ہے تو رہے
یہی بہت ہے کہ سینہ تو ہے فراختیہ

رہے اسی طرح گمنامیوں کا شہر آباد
نشانیہ ہو کہیں پر نہ کچھ شناختیہ

اسی کے برگ و ثمر ہوں گے عام سب کے لیے
اسی شجر سے نکلنا ہے کوئی شاختیہ

جو ڈالیے کسی صحرا کی داغ بیل آخر
ہے قید اپنے لیے اب یہ کو و کاختیہ

بچے بچے ہُوئے بکھراو سے نکالنا ہے
ظفر کو اپنے ہی اندر سے کوئی ساختیہ

-☆-

ویسے بھی راستے میں ہی پڑتی دکان ہے
آیا کرو کہ آپ کی اپنی دکان ہے

تقسیم ہی دکھائی تھی نقشے میں اس طرح
آدھا ہمارا گھر ہے تو آدھی دکان ہے

ہر چیز دستیاب ہے ، اندر تو آیئے
باہر سے لگ رہی ہے کہ چھوٹی دکان ہے

سیدھی طرف سے جائیں تو ہے سب سے آخری
اور ، اُلٹے ہاتھ آئیں تو پہلی دکان ہے

اک ساکھ ہے بنائی ہوئی اہلِ شہر میں
ہر شخص جانتا ہے ، پرانی دکان ہے

اب کیا بُرے بھلے کا تفاوت روا رکھیں
گاہک بھی اُس طرح کے ہیں جیسی دکان ہے

آ جائیں آج اگر رُخِ روشن سمیت آپ
بجلی گئی ہوئی ہے ، اندھیری دکان ہے

پھیکا ہمارا کیوں نہ ہو پکوان اس قدر
سب سے زیادہ شہر میں اونچی دکان ہے

سودا سلف کہیں نظر آتا نہیں ، ظفر
کیسے دکاندار ہو ، کیسی دکان ہے

☆

کہاں گئی وہ اُمید موہومہ ، او معصومہ!
جس پہ یہ دل کئی بار ہی جھوما ، او معصومہ!

گلا گھونٹ کر میں نے جس خواہش کو مار دیا تھا
یاد بہت آتی ہے وہ مرحومہ ، او معصومہ!

باہر گرمی تھی ، لیکن اندر ٹھنڈے کمرے میں
ہم نے مل کر سرد ہوا کو چوما ، او معصومہ!

کیا چکر تھا ، اور ، وہ کیسی رعنائی تھی جس کو
دیکھ کے پہلی بار مرا سر گھوما ، او معصومہ!

ایک خبر جو لہو سے لفظوں تک پہنچی تھی شاید
وہ معلومہ تھی ، یا نا معلومہ ، او معصومہ!

شعر شعار نہیں ہے تیرا لیکن پھر بھی ہم نے
کیوں لکھا ہے قصّہ یہ منظومہ ، او معصومہ!

ایک ایسا بھی دل ہے یہاں جس میں ہے بسیرا تیرا
لیکن ابھی نہیں تجھ سے موسومہ ، او معصومہ!

بھیڑ میں ڈھونڈ رہا ہوں ، اور ، پکار نہیں سکتا ہوں
خود ہی بول ، کہاں ہے ، او معصومہ ، او معصومہ!

کس کو جا کے دکھاتے پھریں ، ظفر ، ہاتھوں کی لکیریں
سب کچھ تو دیوار پہ ہے مرقومہ ، او معصومہ!

☆

کوئی اپنی تھی ادا اُس میں ، کوئی اور کی تھی
خود کوئی اور تھا ، اور ، شکل کسی اور کی تھی

غم کسی اور کا تھے سر پہ اُٹھائے ہوئے ہم
کبھی سرشار جو رکھتی تھی ، خوشی اور کی تھی

ہم تعاقب میں رہے اُس کے ، وگرنہ ہم کو
اصل میں کوئی اگر تھی تو کمی اور کی تھی

رنج دونوں کا رہا ایک طرح سے ہر دم
سرگرانی تھی وہی میری ، وہی اور کی تھی

ایک دُنیا تھی ، سمجھتا رہا جس کو اپنا
اور ، وہ میرے علاوہ بھی کئی اور کی تھی

فُرصتِ شوق میں قائم نہیں تھے مرے حواس
خود مصیبت میں تھا ، اور ، مجھ کو پڑی اور کی تھی

میں بھی موجود تو تھا اپنی ہوا میں ، ورنہ
وہ سماں اور کا تھا ، اور ، گھڑی اور کی تھی

میں گنہگار تھا صرف اُس کو بسر کرنے کا
زندگی ، ورنہ ، بُری تھی کہ بھلی ، اور کی تھی

ہو گیا ساتھ ہی تاریک مرا گھر بھی ، ظفر
ورنہ سچ پُوچھیے تو شمع بجھی اور کی تھی

-☆-

زمیں کا رنگ ترے آسماں میں شامل تھا
کہاں کا ذائقہ جا کر کہاں میں شامل تھا

مرے خلاف گواہی تھی اور کیا درکار
کہ وہ تو سب مرے اپنے بیاں میں شامل تھا

گزر گئے یُونہی گمنام ، ورنہ ، اپنا بھی
کوئی تو ذکر کسی داستاں میں شامل تھا

مجھے یقیں ہی نہیں آ رہا کہ میں بھی کبھی
نہیں کہیں ترے وابستگاں میں شامل تھا

وفور تو مرے اندر زیادہ تھا ہی ، مگر
فتور بھی کوئی طبعِ رواں میں شامل تھا

جو ہو چکا ہے یہاں ، اور ، ہو رہا ہے ابھی
شروع سے مرے وہم و گماں میں شامل تھا

وہیں سے میرے نہ ہونے کا مل رہا تھا سراغ
جو ایک نقش مرے ہر نشاں میں شامل تھا

گیا تو ساتھ اُٹھا لے گیا عمارت بھی
مکیں کچھ ایسا ہی اہلِ مکاں میں شامل تھا

کہیں غبار میں گم ہو کے رہ گیا ہوں ، ظفر
وگرنہ میں بھی اسی کارواں میں شامل تھا

-☆-

ساتھ اپنے کوئی غم ہے نہ خوشی رہ گئی ہے
شے جہاں جو بھی پڑی تھی سو پڑی رہ گئی ہے

پھیلتا جاتا ہے دریائے سخن چاروں طرف
ایسے لگتا ہے کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے

اپنے اندر سے نکالا تھا مُسلسل جس کو
نظر آتا ہے کہ وہ آگ ابھی رہ گئی ہے

جب بھی نکلے ہیں سفر پر، وہ مہکتی ہُوئی یاد
ساتھ اپنے کبھی چل دی ہے، کبھی رہ گئی ہے

خواہشِ وصل چھپا رکھتے کہاں تک اُس سے
داغ کی طرح جو دامن سے لگی رہ گئی ہے

نئی تعمیر کی خاطر جو گرایا تھا کھنڈر
لاش اپنی اُسی ملبے میں دبی رہ گئی ہے

کاٹ ڈالیں گے اِسے خود ہی کسی لہر میں ہم
ایک یہ شاخِ تماشا جو ہری رہ گئی ہے

کیجے اتنی ہی محبت پہ گزارہ، ورنہ
نہیں رہ جائے گی یہ بھی کہ بچی رہ گئی ہے

دل کی دیوار، ظفر، یُوں تو مصوّر ہے تمام
وہ جو تصویر لگانا تھی کوئی، رہ گئی ہے

☆

نہیں کہتا کہ زیبِ داستاں ہونے دے مُجھ کو
ضروری ہے کسی صورت بیاں ہونے دے مُجھ کو

غنیمت ہے ترے اطراف میں ہونا بھی، لیکن
ذرا سی دیر اپنے درمیاں ہونے دے مُجھ کو

ہم آغوشی تو پہلا مرحلہ تھا خوابِ دل کا
لہو کے شور و شر میں ہم زباں ہونے دے مُجھ کو

سفینے کو تو پھر بھی ڈوب ہی جانا تھا، لیکن
یہ مَیں نے کب کہا تھا بادباں ہونے دے مُجھ کو

ستارے میرے اندر جھلملانا چاہتے ہیں
زمیں ہونے سے پہلے آسماں ہونے دے مُجھ کو

مَیں خود حیران رہ جاؤں کہ یہ کیا ہو گیا ہے
جہاں مَیں ہو نہیں سکتا، وہاں ہونے دے مُجھ کو

مرے اپنے لیے بھی اب یہ ناممکن نہیں ہے
سو، بہتر ہے کہ تُو خود ہی یہاں ہونے دے مُجھ کو

مرے ہونے نہ ہونے کا کوئی جھگڑا نہیں ہے
وہیں ہو جاؤں گا مَیں تُو جہاں ہونے دے مُجھ کو

ظفر، خالی قیاس آرائیاں ہیں یہ تو سب کی
کِسی کو کیا خبر ہے، وہ کہاں ہونے دے مُجھ کو

☆

پلتا نہیں شام کا کبوتر
تھا جیسے وہ نام کا کبوتر

اب اڑ جو گیا تو اڑ گیا بس
وہ آپ کے بام کا کبوتر

دانہ کچھ ڈال کر پھنساتے
تھا آپ کے کام کا کبوتر

کچھ دیر تو خوب پھڑپھڑایا
اس خواہش خام کا کبوتر

کیا اپنے پڑاو کے کنارے
کیا اس کے پیام کا کبوتر

ٹھوکا نہیں فرش خواب پر وہ
پھر اس کے خرام کا کبوتر

اس رزق حلال میں کسی دن
پھڑکے جو حرام کا کبوتر

اس طرز خواص میں بھی اب تو
اڑتا ہے عوام کا کبوتر

پرواز کرے، ظفرؔ، کہاں تک
اس طرز کلام کا کبوتر

☆

فسوں طرازی میں سو فسانے نکالتا ہوں
میں ایک پل سے کئی زمانے نکالتا ہوں

کبھی گراتا ہوں خود پہ دیوار خستہ دل
اور اُس کے اندر دبے خزانے نکالتا ہوں

مکان ملبوں میں ڈھونڈتا ہوں میں خواب ٹکڑے
کٹے درختوں سے آشیانے نکالتا ہوں

بہت جلاتی ہے جس گھڑی تیز دھوپ مجھ کو
تو آسمانوں کے شامیانے نکالتا ہوں

خیال بنتا ہوں اک شب وصل کے، مگر، پھر
اسی گھڑی اُس کے تانے بانے نکالتا ہوں

یہاں وہاں یوں تو ہیں بہت میری سجدہ گاہیں
میں اس جبیں سے بھی آستانے نکالتا ہوں

اگرچہ ہوتے ہیں سُر کبھی سوگوار میرے
ابھی سے ہنستے ہوئے ترانے نکالتا ہوں

مرا نیا لفظ باندھنے کا جواز کیا ہے
اگر معانی وہی پرانے نکالتا ہوں

ظفرؔ، ہدف میرا شہر ہو یا کہ شاعری ہو
میں اپنا غصہ کسی بہانے نکالتا ہوں

☆

نہ اُس کو بھول پائے ہیں نہ ہم نے یاد رکھا ہے
دلِ برباد کو اس طرح سے آباد رکھا ہے

جھمیلے اور بھی سُلجھانے والے ہیں کئی پہلے
اور، اُس کے وصل کی خواہش کو سب سے بعد رکھا ہے

رُکا رہتا ہے چاروں سمت اشک و آہ کا موسم
رواں ہر لحظہ کاروبارِ ابر و باد رکھا ہے

پھر اس کی کامیابی کا کوئی امکان ہی کیا ہو
اگر اُس شوخ پر دعویٰ ہی بے بُنیاد رکھا ہے

خزاں کے خشک پتے جس میں دن بھر کھڑکھڑاتے ہیں
اُسی موسم کا نام اب کے بہار ایجاد رکھا ہے

یہ کیا کم ہے کہ ہم ہیں تو سہی فہرست میں اُس کی
بھلے ناشاد رکھا ہے کہ ہم کو شاد رکھا ہے

جسے لفظِ محبت کے معانی تک نہیں آتے
اُسے اپنے لیے ہم نے یہاں اُستاد رکھا ہے

جواب اپنے کو چاہے جو بھی وہ ملبوس پہنائے
سوال اس دل نے اُس کے آگے مادر زاد رکھا ہے

ظفر، اتنا ہی کافی ہے جو وہ راضی رہے ہم پر
کمر اپنی پہ کوئی بوجھ ہم نے لاد رکھا ہے

-☆-

سراسر اہلِ دُنیا سے کبھی بیزار ہو جانا
کبھی، پھر، رفتہ رفتہ آپ دُنیادار ہو جانا

محبت کو ترس جانا کہ ہو جاتی کسی صورت
جو ہو جائے تو اُس کے درپئے آزار ہو جانا

نکل سکنا نہیں آنکھوں سے رنگِ منظرِ ہستی
کہ ممکن ہی نہیں اس خواب سے بیدار ہو جانا

پلٹ جانی کسی جانب ہوا کی آخری کروٹ
دریچہ ہوتے ہوتے ایک دم دیوار ہو جانا

اُٹھا رکھی ہے سر پر رائیگاں عزت کی یہ گٹھڑی
اگر قسمت میں ہے رُسوا سرِ بازار ہو جانا

ضروری سا ابھی کچھ کام ہے ہم کو کنارے پر
ابھی مشکل ہے دریائے سفر کے پار ہو جانا

یہ ہونے اور نہ ہونے کا بھی کیسا کھیل ہے آخر
کہیں مستور رہ جانا، کہیں دوچار ہو جانا

مرے اثبات کی باقی یہی تھی ایک گنجائش
ہجومِ خلق میں خود سے مرا انکار ہو جانا

اسی ٹوہٹو کی حیرت سے، ظفر، زندہ ہے یہ دُنیا
غنیمت ہے یہاں میرا گلِ گفتار ہو جانا

-☆-

ہیں اتنے تنگ جو ہر لحظہ ہائے وائے سے ہم
نکل ہی کیوں نہیں جاتے سخن سرائے سے ہم

ذرا سکھیں کہیں آرام کرنا چاہتے ہیں
تھکے ہوئے ہیں بہت بارِ دل اٹھائے سے ہم

کڑکتی دھوپ نے چاروں طرف سے گھیر لیا
نکل پڑے تھے اگر باہر اپنے سائے سے ہم

پھرے ہیں ڈھونڈتے اس کائنات میں ہر سُو
ہنوز دُور ہیں اپنا سراغ پائے سے ہم

وہ رازِ دل کہ پریشان ہی ہُوئے ہر بار
کبھی بتائے سے اُس کو، کبھی چھپائے سے ہم

بھلا ہُوا کہ ہمارے خلاف تھی بے شک
سو، متفق تو ہُوئے آج اُس کی رائے سے ہم

وہ بدقماش کبھی یاد آ بھی سکتا ہے
بہت جو پھرتے ہیں خوش خوش اُسے بھلائے سے ہم

جو آ سکے تو یہاں آئیں گے دوبارہ بھی
اگرچہ خوار ہُوئے ایک بار آئے سے ہم

ظفرؔ، زیادہ کھلے پانیوں کی حسرت میں
گُزر تو آئے ہیں لفظوں کی تنگنائے سے ہم

☆

زندہ بھی خلق میں ہوں، مرا بھی ہُوا ہوں مَیں
ہوں مختلف بھی، اِن میں پھنسا بھی ہُوا ہوں مَیں

جو اہلِ شہر کو کسی صورت نہیں ہے راس
اُسی یہاں پہ آب و ہوا بھی ہُوا ہوں مَیں

آزردہ کیوں ہیں اب مرے شیون پہ اہلِ باغ
کچھ دن یہاں پہ نغمہ سرا بھی ہُوا ہوں مَیں

اِن بارشوں کی مُجھ کو تمنا بھی تھی بہت
دیوار سے ذرا سا ہٹا بھی ہُوا ہوں مَیں

رہتا ہوں دُور اُس کے دلِ نرم سے، مگر
پتھر کی طرح اُس میں جُڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

زندہ ہوں پھر بھی ایک اُمیدِ بہار پر
پتّا ہوں، اور، شجر سے جھڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

رہتا نہیں ہوں بوجھ کسی پر زیادہ دیر
کچھ قرض تھا اگر تو ادا بھی ہُوا ہوں مَیں

رکھنے لگے ہیں کچھ نظرانداز بھی یہ لوگ
منظر سے اپنے آپ ہٹا بھی ہُوا ہوں مَیں

اِک دُور کے سفر پہ روانہ بھی ہوں، ظفرؔ
سُست الوُجُود گھر میں پڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

☆

سب کو معلوم ہے تُو نے ہمیں کتنا چاہا
اور ، آخر میں وُہی کر دیا ، جیسا چاہا

پیاس جب چاٹ گئی کھیتیاں ساری میری
پھر ، گھٹا نے مرے اندر بھی برسنا چاہا

تُو نہ چاہے تو یہ سب جھوٹ ہے ، ورنہ ، ہم نے
تجھے ایسا کبھی چاہا کبھی ویسا چاہا

تجھے کہنے کی یہ زحمت نہ اُٹھانا پڑتی
ہم نے تو خُود ہی ترے شہر سے جانا چاہا

ساتھ رکھا جسے ، اُس سے تو رہے فارغ ہی
اور ، جسے چھوڑ دیا اُس کو دوبارہ چاہا

وہیں بے سمت ہُوا اپنا سفینہ آخر
ہم نے جس رات سمندر میں ستارہ چاہا

اپنے اندر بھی کوئی ریت سی جب اُڑنے لگی
ہم نے بہتے ہُوئے دریا کو بھی صحرا چاہا

رہی اُفتاد ہی ایسی کہ ہمیشہ ہم نے
لبِ دریا کے بجائے پسِ دریا چاہا

اُس نے آنا تھا کسی اور کے ہی کام ، ظفر
اور ، بیکار ہی جانا تھا ہمارا چاہا

☆

جو توڑتا ہُوں ، مکرّر نہیں بناتا ہُوں
تمھیں تو علم ہے ، کیوں کر نہیں بناتا ہُوں

بنا لیا تو پڑے گا اُسے لُٹانا بھی
اسی لیے تو ابھی گھر نہیں بناتا ہُوں

میں خُود نکلتا ہُوں غازی بھی شہید ، کہ میں
لڑائی کے لیے لشکر نہیں بناتا ہُوں

بناؤں بھی جو بھی دشت ، وادیاں ، دریا
تو اپنے آپ سے باہر نہیں بناتا ہُوں

بنا رہا ہُوں جو تصویرِ وصل میں ہر شے
تو جانے کس لیے بستر نہیں بناتا ہُوں

کبھی بنا نہیں سکتا ہُوں کام کی کوئی چیز
بناؤں بھی تو برابر نہیں بناتا ہُوں

جو ایک بار بھی عذر چل سکے نہ مرا
تو پھر بہانہ دیگر نہیں بناتا ہُوں

میں شاہ کے فقط اوصاف کر رہا ہُوں بیاں
یقین کیجیے ، قبر نہیں بناتا ہُوں

یہ شعر تو یُونہی بنتے ہیں اپنے آپ ، ظفر
کہ خُود تو میں انھیں اکثر نہیں بناتا ہُوں

☆

ہوا بدل گئی اُس بے وفا کے ہونے سے
وگرنہ خلق تو خوش تھی خدا کے ہونے سے

خبر نہیں مجھے مطلوب اور کیا ہے کہ میں
زیادہ خوش نہیں ارض و سما کے ہونے سے

ہمیشہ برسرِ پیکار ہوں کہیں نہ کہیں
مجھے علاقہ نہیں بیچ بچا کے ہونے سے

یہ شعلہ دل سے الگ ہو کے بھی نکل آیا
کچھ آگ پھیل گئی ہے ہوا کے ہونے سے

یہ شہر کچھ بھی مضافات کے بغیر نہیں
وجود اصل میں ہے ماورا کے ہونے سے

جدائی چھوڑتی رہتی ہے وصل کی خوشبو
میں زندہ رہتا ہوں اکثر قضا کے ہونے سے

میں پرزہ پرزہ پڑا ہوں جہاں تہاں ہر سمت
خفا بھی ہیں مرے جابجا کے ہونے سے

ضرورتیں ہی مری ہو نہیں رہیں پوری
رکا ہے قافلہ اک بے نوا کے ہونے سے

جو رہ گئی ہے یہ ایک آنچ کی کسر تو، ظفرؔ
وہ زرگری تھی کسی کیمیا کے ہونے سے

☆

اس فضا میں نئے لفظوں کی جو پروازیں ہیں
سنتے جانا کہ یہ ساری مری آوازیں ہیں

یار لوگوں نے معانی کو کیا ہے مستور
کیسی الفاظ نے پہنی ہوئی پشوازیں ہیں

کاٹتی اور کترتی ہوئیں مطلب سارا
اہلِ محفل کی زبانیں ہیں کہ مقراضیں ہیں

ایک سے ایک ہیں پہنچے ہوئے اس شہر کے لوگ
ہر طرف یہ جو کرامات ہیں، اعجازیں ہیں

اس طرف دوسری جانب کی ہوا ہے نہ خبر
اب کے دیوار میں درزیں ہیں نہ دروازیں ہیں

فرق بس نام کا ہوتا ہے یہاں پر، ورنہ
مہ وشیں تھیں جو کبھی اب وہی مہ نازیں ہیں

رنگ لائیں گی کبھی تو، کسی صورت، آخر
یہ کسی کے لیے اپنی جو تگ و تازیں ہیں

اس تغافل کو تغافل بھی نہیں کہہ سکتے
رنگ اس میں ہیں بہت، اور، کئی رازیں ہیں

کچھ بیانات ہیں ایسے کہ، ظفرؔ، جن کے لیے
آج بھی کوئی اشارے ہیں نہ الفاظیں ہیں

☆

برادرم میاں مقبول احمد کے نام

ترتیب

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل

پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

(سودا)

صورتِ اشکِ تپاں ہوتی ہوئی
نعت آنکھوں سے رواں ہوتی ہوئی

رنگِ رُخ اُڑتا ہوا رہ رہ کر
بات رُک رُک کے بیاں ہوتی ہوئی

موت بنتی ہوئی مطلوبِ نظر
زندگی بارِ گراں ہوتی ہوئی

دل کے پیچھے وہ چھپائی ہوئی شے
صاف چہرے سے عیاں ہوتی ہوئی

ترکِ خواہش کا وہ خواہش ہونا
بے زبانی وہ زباں ہوتی ہوئی

اور ، اس تازہ ہوا کے آگے
ہستی دہر دُھواں ہوتی ہوئی

کیا مدینے کے گلی کوچوں میں
عقل پھرتی ہے گماں ہوتی ہوئی

اس کڑی دھوپ میں اس پیڑ کی چھاؤں
ہے یہاں تک بھی ، وہاں ہوتی ہوئی

آرزو اُن کی زیارت کی ، ظفر
اس بڑھاپے میں جواں ہوتی ہوئی

-☆-

کچھ زاویۂ منظرِ دُنیا تو نیا ہو
آنکھیں جو پرانی ہیں ، تماشا تو نیا ہو

ہونے میں کوئی عذر نہیں ہے مجھے ، لیکن
جو چل بھی سکے ساتھ ، زمانہ تو نیا ہو

آغاز بھی ہوتا ہے وُہی ، اور ، وُہی انجام
اس بار سُنانا ہے جو قصہ تو نیا ہو

کچھ دیر تو ہم بھی اُسے پہچان نہ پائیں
ملبوسِ تغافل کوئی پہنا تو نیا ہو

اس گھر میں کسی اور بھی جانب سے ہوا آئے
جنگل کی طرف کوئی دریچہ تو نیا ہو

مانا کہ زباں ہو نہیں سکتی ، نئی ، لیکن
کچھ اس کے برتنے کا طریقہ تو نیا ہو

کروٹ کوئی اک تازہ تو بدلی ہو زمیں نے
پیغام فلک سے کوئی اُترا تو نیا ہو

اک بار جسے دیکھ کے حیران ہی رہ جائیں
ایسا تو نیا ہو ، کوئی ویسا تو نیا ہو

روزی نہیں کھلتی تو ، ظفر ، خیر ہے ، لیکن
قسمت کے ستارے کا چمکنا تو نیا ہو

-☆-

کہیں میرے ترے سوا کوئی ہے
باغِ دُنیا میں تیسرا کوئی ہے

خیر ، باہر تو ہے ہی بادِ مُراد
اندر اندر بھی اک ہوا کوئی ہے

دل کا دروازہ کھول کر اُس نے
ایک دن پُوچھ ہی لیا ، کوئی ہے؟

پُوجتا بھی ہوں ، ڈھونڈتا بھی اُسے
یہاں موجُود ، اور ، خُدا کوئی ہے

اتنی بے رونقی نہیں تھی کبھی
شہر خالی پڑا ہے ، یا کوئی ہے

اس خرابے میں پہلے کیا کوئی تھا
اس محلّے میں آج کیا کوئی ہے

سوچتا ہے کہ دیکھتا ہے کون
یہ بھی دیکھے کہ سوچتا کوئی ہے

یہ مضافات ہوں گے پھر آباد
ان مکانات میں رہا کوئی ہے

بے سبب تو نہیں یہ سارا فساد
لگ رہا ہے ، ظفر ، خُدا کوئی ہے

-☆-

یُونہی اک دُوسرے سے کب جُدا ہوتا ہے کوئی
خرابی کا تو باعث تیسرا ہوتا ہے کوئی

سلوک اُس کے سر آنکھوں پر اُٹھا رکھے ہیں سارے
روا ہوتا ہے کوئی ، ناروا ہوتا ہے کوئی

کہیں دل میں کوئی زنجیرِ خواہش ٹوٹتی ہے
کہیں قیدِ تماشا سے رہا ہوتا ہے کوئی

نہیں مِلتا کبھی نام و نشاں دل میں بھی اُس کا
کبھی ہونے لگے تو جابجا ہوتا ہے کوئی

مُصیبت میں اگر دستِ دُعا ہوتا ہے درکار
نُجُوم جس میں خواب ہوا ہوتا ہے کوئی

بھلا پھر اُس کے ہونے کا ہمیں کیا فائدہ ہے
اگر ارض و سما کے ماورا ہوتا ہے کوئی

یہاں وہ بھی نہیں موجُود ، ورنہ ، آج تک تو
کوئی بھی دُور ہو ، اُس کا سرا ہوتا ہے کوئی

سفر کرتا ہُوں ناموجُود کا ، اور دیکھتا ہُوں
خلا کے بعد بھی جیسے خلا ہوتا ہے کوئی

ظفر ، دیوار اُٹھا رکھی تو ہے یہ درمیاں میں
مگر ، دیوار میں بھی راستا ہوتا ہے کوئی

-☆-

یہاں سب سے الگ سب سے جُدا ہونا تھا مجھ کو
مگر کیا ہو گیا ہوں ، اور ، کیا ہونا تھا مجھ کو

ابھی اک لہر تھی جس کو گزرنا تھا سروں سے
ابھی اک لفظ تھا میں ، اور ، ادا ہونا تھا مجھ کو

پھر اس کو ڈھونڈنے میں عمر ساری بیت جاتی
کوئی اپنی ہی گم گشتہ صدا ہونا تھا مجھ کو

پسند آیا کسی کو میرا آندھی بن کے اُٹھنا
کسی کی رائے میں بادِ صبا ہونا تھا مجھ کو

وہاں سے بھی گزر آیا ہوں خاموشی میں اب کے
جہاں اک شور کی صورت بپا ہونا تھا مجھ کو

در و دیوار سے اتنی محبت کس لیے تھی
اگر اس قید خانے سے رہا ہونا تھا مجھ کو

میں اپنی راکھ سے بے شک دوبارہ سر اُٹھاتا
مگر ، اک بار تو جل کر فنا ہونا تھا مجھ کو

میں اندر سے کہیں تبدیل ہونا چاہتا تھا
پُرانی کینچلی میں ہی نیا ہونا تھا مجھ کو

ظفرؔ ، میں ہو گیا کچھ اور ، ورنہ ، اصل میں تو
بُرا ہونا تھا مجھ کو ، یا بھلا ہونا تھا مجھ کو

-☆-

نئی تحریر فلک سے کوئی جاری تو کرے
خود نہیں ہے تو وہ تصدیق ہماری تو کرے

ہم پہ سو بار بھٹک جائے تمھارا یہ گواہ
کچھ نہ کچھ ساتھ ہی تائید ہماری تو کرے

اُس کو الزام تراشی سے نہیں روکتے ہم
اُسے آتی ہے جو افسانہ نگاری تو کرے

یُوں ڈراتا نہ رہے ، سانپ نکالے تو سہی
دیکھ لیں گے اُسے ، خالی یہ پٹاری تو کرے

دھند میں لپٹے ہوئے ، اور ، دھوئیں میں ملبُوس
ایک دن آ کے یہاں خواب شماری تو کرے

پھیلتا جائے گا خود رنگِ محبت رُخ پر
زہر کو خون میں وہ جاری و ساری تو کرے

نقش ہو گا تو کوئی عکس بھی اُترے گا ضرور
آدمی اُس کے لیے آئنہ داری تو کرے

منتظر رہتی ہیں بے وجہ یہ آنکھیں اُس کی
اس گزرگاہ پہ وہ اپنی سواری تو کرے

بدگماں ہو کے نہ بیٹھا رہے ازخود ہی ، ظفرؔ
اُس کے آگے وہ کبھی عرض گزاری تو کرے

-☆-

دُور رہ کر نہ ، اُسے پاس بُلانے سے کیا
مَیں نے اندازہ محبت کا بہانے سے کیا

اُس کے اپنے ہی خیالات پریشاں تھے بہت
جس نے آغاز مجھے خواب دکھانے سے کیا

کچھ تسلی مجھے اندازِ تغافل سے ہوئی
کچھ یقیں مَیں نے مزید اُس کے نہ آنے سے کیا

شرکتِ کار کا اِک فیصلہ ہم دونوں نے
درمیاں میں کوئی دیوار اُٹھانے سے کیا

کام کرنا تھا جو ہم نے کبھی خاموشی سے
اس قدر وہ بھی یہاں شور مچانے سے کیا

عکس اُس شوخ کے باہر تک اُسے چھوڑنے آئے
عُذر اُس نے جو کبھی آئنہ خانے سے کیا

کارِ دُنیا میں بُھلا بھی نہ سکے ہم تجھ کو
آخر اتنا بھی ترے یاد دلانے سے کیا

شاعری تھی یہ کسی اور زمانے کے لیے
مَیں نے مربُوط اِسے اپنے زمانے سے کیا

سازگار آب و ہوا ہی نہ ہوئی جس کو ، ظفرؔ
تجربہ ہم نے وُہی فصل اُگانے سے کیا

☆

چلو ، کسی بُتِ رعنا پہ ہاتھ ڈالتے ہیں
سو ، ہم بھی اپنی کوئی واردات ڈالتے ہیں

کُھلی ملی ہو اندھیرے میں روشنی باہم
چمک رہا ہے جو دن ، اس میں رات ڈالتے ہیں

فسانہ اُس کا ہے لیکن بیان کرتے ہُوئے
ہم اِس میں اپنی بھی تھوڑی سی بات ڈالتے ہیں

تلاش کرتے ہیں روزن یہاں وہاں کوئی
کبھی کواڑ کے اُوپر سے جہات ڈالتے ہیں

بنائیں گے کوئی آمیزہ اور ہی ڈھب کا
خُمارِ ہجر میں خوابِ نشاط ڈالتے ہیں

یہ چارپائی اگر واقعی نہیں کافی
تو اور بھی کوئی چیز اس کے ساتھ ڈالتے ہیں

اگر مُعاملہ دُنیا کا ، اور ، ہمارا ہے
تو ، آپ بیچ میں کیوں اپنی ذات ڈالتے ہیں

کبھی ہماری بھی ایک آدھ شرط مانتے وہ
سفارشیں جو ہمیں پانچ سات ڈالتے ہیں

سہولتیں جنھیں دیتے تھے ہم ہزار ، ظفرؔ
ہماری راہ میں سو مشکلات ڈالتے ہیں

☆

چشمِ روزن نہ کسی در کی طرف سے آئی
روشنی خواب کے باہر کی طرف سے آئی

اک ہیولیٰ سا کسی طرفہ نمایش سے اُٹھا
اک ہوا سی کسی منظر کی طرف سے آئی

وہی شکوہ کبھی مجھ کو بھی رہا ہے تجھ سے
جو شکایت مجھے اکثر کی طرف سے آئی

اندر اندر مرے ہو سکتی ہے چنگاری بھی
یہ اشارت اُسی پتھر کی طرف سے آئی

وار خالی ہی بظاہر تو دیا تھا، لیکن
ایک آواز مرے سر کی طرف سے آئی

ابر وہ جانبِ صحرا سے دوبارہ نہ اُٹھا
وہ ہوا پھر نہ سمندر کی طرف سے آئی

سو بھی مَیں نے اُسے اُس کی ہی طرف سے سمجھا
جو مہک اُس کے برابر کی طرف سے آئی

مدّتیں ہو گئیں، آتی نہیں چہرے پہ چمک
کبھی آئی بھی تو اندر کی طرف سے آئی

آئی ہے وہ بھی کہیں اُس کے ذریعے سے، ظفر
جو بلا میرے مقدّر کی طرف سے آئی

☆

کب سے رُکی ہوئی جو مُلاقات کوئی ہے
خود رابطہ کرے گا اگر بات کوئی ہے

بادل نہیں فلک پہ کہیں دُور دُور تک
پھر بھی مرے نواح میں برسات کوئی ہے

دل میں کوئی کمی سی بھی رہتی ہے رات دن
اور، اس کے ساتھ ساتھ ہی بُہتات کوئی ہے

مالک ہے جو بھی میرے سیاہ و سفید کا
میری ہی طرح کا یہاں دن رات کوئی ہے

تنہائی کا مزہ مری قسمت میں ہی نہیں
مَیں جس طرف بھی جاؤں، مرے ساتھ کوئی ہے

یُونہی تو مبتلائے مصیبت نہیں ہوں مَیں
پیچھے اس انتظام کے بھی ہاتھ کوئی ہے

وہ شہر ہو نہ ہو، کوئی نام اُس کا ہے ضرور
اور، اُس کے اردگرد مضافات کوئی ہے

اس کے علاوہ تلخیِ دل کا سبب ہے کیا
اس خاک میں مِلائی ہوئی دھات کوئی ہے

انکار کر رہا ہُوں جو مَیں اُس کا، اے ظفر
ظاہر ہے اس سے بھی کہ مری ذات کوئی ہے

☆

سنبھل گئے ہیں ، شکایت بہت زیادہ نہیں تھی
بھلا ہُوا کہ محبت بہت زیادہ نہیں تھی

پڑے تھے اس کے بھی سو کام اپنے گھر میں ضروری
ہمارے پاس بھی مُہلت بہت زیادہ نہیں تھی

مَیں آئنہ تھا ، مری سمت دیکھتا بھی وہ کم تھا
اسی لیے مجھے حیرت بہت زیادہ نہیں تھی

وہ جس قدر بھی تھی ، جھیلی ہے مَیں نے سر پہ برابر
اگرچہ اب کے مُصیبت بہت زیادہ نہیں تھی

شکست کھا کے مَیں خاموش ہو گیا ہُوں کہ مُجھ میں
بچی کھچی تھی جو ہمّت ، بہت زیادہ نہیں تھی

کبھی کسی کا بھی احسان ہم بھلا نہیں سکتے
کہ یُوں بھی اُس کی عنایت بہت زیادہ نہیں تھی

چلا ہُوا تھا کُچھ اُس کا بھی کام ہم سے علیحدہ
ہمیں بھی اُس کی ضرورت بہت زیادہ نہیں تھی

تھا اور بھی سبب اس کا ، اُداس تھی جو طبیعت
کہ یہ اُسی کی پہ دولت بہت زیادہ نہیں تھی

پڑا ہُوا تھا ، ظفؔر ، کام اپنا ، اور ، تھے فارغ
مگر ، ہمیں یہاں فُرصت بہت زیادہ نہیں تھی

☆

اُمیدِ عاقبتِ کار کے برابر ہے
یہ اک درخت کہ دیوار کے برابر ہے

زیادہ دُور نہیں امن و جنگ آپس میں
یہ فاصلہ تری تلوار کے برابر ہے

تجھے خبر نہیں ، یہ ایک بار کا انکار
ہزار بار کے اقرار کے برابر ہے

کھلی ہے ، اور ، کوئی گاہک اِدھر نہیں آتا
دُکانِ خواب کہ بازار کے برابر ہے

ہو اس کے بعد زمانوں کا کیا حساب کتاب
جب ایک لمحہ لگاتار کے برابر ہے

مَیں اس لیے بھی زُباں کھولتا نہیں کہ ابھی
سکوت ہی یہاں اظہار کے برابر ہے

ہُوں اتنا بے سروساماں کہ اس دفعہ مُجھ کو
یہ برگِ سبز بھی اشجار کے برابر ہے

مجھے پسند ہے جی جان سے یہ عیبِ سُخن
جہاں جہاں مرے معیار کے برابر ہے

وُہی پسینہ پسینہ ہُوں رات دن ، کہ ظفؔر
ہوا یہاں مری رفتار کے برابر ہے

☆

بہت نئے خواب دکھانے کی طرف سے آیا
کبھی آنے ، کبھی جانے کی طرف سے آیا

پہلے آتا تھا کسی اور سے ملنے کے لیے
اب کسی اور بہانے کی طرف سے آیا

وہی مجبوریاں اُس کی ، وہی دُنیاداری
میری جانب وہ زمانے کی طرف سے آیا

اس سے ہو سکتا نہیں تھا کسی صورت بھی بچاو
یہ جو سیلاب نہ آنے کی طرف سے آیا

کام تھا جس کا یہاں اصل میں بہبود و فلاح
شہر کی خاک اُڑانے کی طرف سے آیا

اب کنُواں کھود رہا ہے وہ بجھانے کے لیے
جو یہاں آگ لگانے کی طرف سے آیا

اور بھی اُس نے کیا خون خرابہ ، جو یہاں
لڑنے والوں کو چھڑوانے کی طرف سے آیا

اسی خاطر تو کسی نے بھی نہ مانا اُس کو
واقعہ اب کے فسانے کی طرف سے آیا

یُوں مجھے وہ بھی پُرانے ہی طریقے سے، ظفر
اک نئی بات بتانے کی طرف سے آیا

-☆-

بظاہر صحت اچھی ہے جو بیماری زیادہ ہے
اسی خاطر بڑھاپے میں ہوس کاری زیادہ ہے

چلے گا کس طرح سے کاروبارِ شوق اس صورت
رسد کچھ بھی نہیں ہے اور طلبگاری زیادہ ہے

محبت کام ہے جس طرح کا، بس دیکھتے جاؤ
رُکا رہتا بھی ہے اکثر، مگر جاری زیادہ ہے

ہمیں خود بھی یقیں آتا نہیں اس کا جو یہ ہم پر
گرانباری کی نسبت سے سبکساری زیادہ ہے

سُراغ اس کا کہیں اندر تو کچھ ملتا نہیں بے شک
یہ حالت وہ ہے جو ہم پر ابھی طاری زیادہ ہے

اُٹھا سکتے نہیں جب، چوم کر ہی چھوڑنا اچھا
محبت کا یہ پتھر اس دفعہ بھاری زیادہ ہے

حفاظت ہی ہمارا مسئلہ تھا روزِ اوّل سے
سو اپنے اردگرد اب چاردیواری زیادہ ہے

عمارت یہ مکمل ہونے والی ہی نہیں لگتی
کہ اس تعمیر میں کچھ رنگ مسماری زیادہ ہے

ضروری ہو تو کر دیں گے، ظفر، تردید بھی جاری
بیانِ عشق اپنا اب کے اخباری زیادہ ہے

-☆-

خورچین سے بندھی ہے خبر، خواب ساتھ ہے
آساں نہیں رہا سفر، اسباب ساتھ ہے

کیوں پھر بھی مجھ کو ایک بتارے کی ہے تلاش
حال آں کہ تیرگی نہیں، مہتاب ساتھ ہے

میں خود بھی ہونے والی تباہی میں ہوں شریک
آتا ہوں اپنے زور میں، سیلاب ساتھ ہے

ہمراہ میرے ہے بھی سفر میں، نہیں بھی وہ
اس طرح کا یہ طُرفہ و نایاب ساتھ ہے

روکا ہُوا ہے در سے دیوار نے مُجھے
حال آں کہ خود ہی کھلتا ہُوا باب ساتھ ہے

پُر ہوں لہو سے اپنے صُراحی سا رات دن
نشہ رہے نہ کیوں کہ مےِ ناب ساتھ ہے

خود زرد ہوں تو کیا کہ ابھی دُور دُور تک
موسم تمام سبز ہے، سُرخاب ساتھ ہے

گردانتے ہیں لوگ مجھے بے ادب تمام
حال آں کہ سب قرینہ آداب ساتھ ہے

دشمن اِدھر بھلے ہی توجّہ کریں، ظفر
جب تک یہ خیرخواہیِ احباب ساتھ ہے

☆

پھیلا ہے چار سُو جو تماشا بھی دیکھ لُوں
دل پر نظر پڑی ہے تو دُنیا بھی دیکھ لُوں

گُل پھول اور بھی ہیں پسِ پردۂ چمن
یُوں دیکھنے کو اُس کا سراپا بھی دیکھ لُوں

دیگر لوازمات بھی ہیں دیکھنے کو ساتھ
بھرتی نہیں نظر اُسے جتنا بھی دیکھ لُوں

مُمکن ہے رنگِ خواب ہو کچھ اور اصل میں
دیکھا ہے اُس کے ساتھ جو، تنہا بھی دیکھ لُوں

شاید بدل چُکا ہو وہ اِتنے میں بیش و کم
دیکھا ہے ایک بار، دوبارہ بھی دیکھ لُوں

میں چل پڑا سفر پہ، مگر یہ نہ ہو سکا
منزل ہی طے کروں، کوئی رستہ بھی دیکھ لُوں

موجوں کے ساتھ میری لڑائی تو ہے بجا
لیکن، ہے کتنی دُور کنارہ بھی دیکھ لُوں

تصویر آنے والے دِنوں کی دکھاؤں گا
کُچھ اُس سے پیشتر یہ زمانہ بھی دیکھ لُوں

کوشش تو میں نے کی ہی تھی اپنی سی، اے ظفر
نکلا ہے کوئی اس کا نتیجہ بھی دیکھ لُوں

☆

تجھے پانا جو ایسا ہو ، تجھے کھونا ہی ایسا تھا
اُسے کیا روک سکتے ہم اگر ہونا ہی ایسا تھا

کوئی آب و ہوا دیکھی نہ مٹی کی کوئی خصلت
یہ بیج اُلفت کا ایسے میں یہاں بونا ہی ایسا تھا

کہیں آنکھوں میں آنسو تھے نہ چہرے پر اُداسی تھی
مری رنجش ہی ایسی تھی ، مرا رونا ہی ایسا تھا

پڑے رہنا وہ خواب اوڑھے ہُوئے آتے زمانوں کے
کسی کے منتظر موسم میں وہ سونا ہی ایسا تھا

مٹی تحریر اشکوں سے اُبھر آئی ہی تھی دل پر
کہ اس بارش نے اس دیوار کو دھونا ہی ایسا تھا

گراتے آئے ہیں رستے میں ہی اس کو زیادہ تر
کہ اپنا بوجھ تھا ، ہم نے اسے ڈھونا ہی ایسا تھا

کسی بھی رُت کا ہونا ہی نہ تھا کوئی اثر اس پر
دمک اس جسم کی دائم تھی ، وہ سونا ہی ایسا تھا

ہم اپنے آپ سے مل بیٹھنے کا سوچ بھی سکتے
نہ اس اتنے بڑے گھر میں کوئی کونا ہی ایسا تھا

ہمارے پاس توڑ اس کا ، ظفر ، تھا ہی نہیں کوئی
کہ وہ جادو ہی تھا اس طرح کا ، ٹونا ہی ایسا تھا

-☆-

کوئی کیا اوڑھتا اس کو بچھونا ہی کچھ ایسا تھا
نہ ہونے کے برابر اپنا ہونا ہی کچھ ایسا تھا

کہیں دیوارِ جاں پر رہ گیا ہے رنگ سا باقی
ہجومِ خواب میں یوں اُس کا کھونا ہی کچھ ایسا تھا

زیادہ ہو گئے تھے فاصلے کچھ اور آپس میں
ہمارا اُس کو اپنے میں سمونا ہی کچھ ایسا تھا

وہ اُس سے کھیلتا بھی ، توڑ بھی دیتا تھا جب چاہے
محبت اُس کے ہاتھوں میں کھلونا ہی کچھ ایسا تھا

کسی بھی تیسرے کی جس میں ہو سکتی ہو گنجائش
تعلّق اس دفعہ شاید تکونا ہی کچھ ایسا تھا

ہم آغوشی ہی طے پائی تھی شرطِ اوّل و آخر
ہوس کو تارِ ہستی میں پرونا ہی کچھ ایسا تھا

جو اُس کے جی میں تھا ، کرنا وُہی تھا ، اور پھر اُس نے
جہاں پانی نہیں ، مُجھ کو ڈبونا ہی کچھ ایسا تھا

اُسے بھی نیند تھی آئی ہُوئی ، ہم بھی تھکے ہارے
ہمارا رات اُس کے ساتھ سونا ہی کچھ ایسا تھا

ظفر ، ناراض ہونا ہی تھا اُس دریائے خُوبی نے
کہ اپنا خشک ہونٹوں کو بھگونا ہی کچھ ایسا تھا

-☆-

پھر کوئی شکل نظر آنے لگی پانی پر
سخت مشکل میں ہوں اس طرح کی آسانی پر

اُس کو پروا ہی نہیں ہے کہ وہ کس حال میں ہے
میں ہی محجوب ہوا خواب کی عریانی پر

کرتا رہتا ہوں میں اُس بُت کی پرستش ہمہ وقت
پھر بھی شک ہے اُسے اس جذبۂ ایمانی پر

اک صدا ہے کہیں راتوں میں سفر کرتی ہوئی
اک ہوا ہے کہیں آئی ہوئی جولانی پر

کوئی رُکتا ہوا دریا مرے قدموں میں کہیں
کوئی جھکتا ہوا سورج مری پیشانی پر

وہی مانوس تھپیڑے تھے مرے چاروں طرف
مجھے حیرت نہ ہوئی دھوپ کی تابانی پر

واپسی پر جو لگے ہیں مجھے اپنے جیسے
خوش ہوا ہوں در و دیوار کی ویرانی پر

ایک دن صبح جو اُٹھیں تو یہ دُنیا ہی نہ ہو
ہے مدار اب کسی ایسی ہی خوش امکانی پر

شعر ہوتے ہیں، ظفر، لطفِ سخن سے خالی
داد ملتی ہے مجھے اب تو خوش الحانی پر

☆

کیا تماشا ہے کہ اب تک بھی وہی کرتا رہوں
موت سے ڈرتا رہوں، اور، زندگی کرتا رہوں

کام تو دلچسپ ہے لیکن ذرا مشکل کہ میں
آپ تاریکی میں رہ کر روشنی کرتا رہوں

سوچنے ہی سوچنے میں خرچ ہو جائے گی عقل
سوچتا ہوں، سوچنے میں کچھ کمی کرتا رہوں

اب تو یہ کارِ محبت مجھ سے ہونے کا نہیں
یا کبھی تم درگزر کر لو، کبھی کرتا رہوں

مجھ کو نیکی کی خدا توفیق اگر دیتا نہیں
خوش رہے مجھ پر اگر یوں ہی بدی کرتا رہوں

کیسے ممکن ہے کرے کوئی نہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ
اور، میں ہر اک سے یوں ہی دل لگی کرتا رہوں

بات اچھی تو نہیں، لیکن مرا دھندا ہے یہ
یعنی میں ایسے ہی پیدا سنسنی کرتا رہوں

میری مجبوری ہے یہ، میرا عمل کچھ اور ہو
اور، میں باتیں ہمیشہ دوسری کرتا رہوں

یوں بھی عادت ہے مجھے مصروف رہنے کی، ظفر
یعنی چلتے پھرتے ہی کچھ سرسری کرتا رہوں

☆

برستا ہے کہیں اس کو نہ کھُل کر چھانے والا ہے
فلک پر ابر کوئی اور ہی لہرانے والا ہے

کوئی تازہ مصیبت آنے والی تو نہیں ، لیکن
یہ دل ہے ، اور ، اپنے آپ ہی گھبرانے والا ہے

محبت ملتوی کر دی ہے اس اُمید پر مَیں نے
کہ جلدی ہی کوئی اچھا زمانہ آنے والا ہے

ہمارا تو تقابل اُس سے کچھ ہو ہی نہیں سکتا
ہمارے ساتھ پھر وہ کس لیے ٹکرانے والا ہے

ہم اُس کو جانتے ہیں ، خُو تو کچھ ایسی نہیں اُس کی
اُسے لگتا ہے ، کوئی اور ہی اُکسانے والا ہے

بہت رنجیدہ ہیں یُوں تو ہم اُس کی سرد مہری سے
خیال اُس کا بہرصُورت لہُو گرمانے والا ہے

اسی میں تھی نہ کچھ خُوئے گدائی ، اور ، اب آخر
یہ دل ہی دامن اُس کے سامنے پھیلانے والا ہے

خزاں ویسے تو کافی دُور ہے ، لیکن بہت جلدی
میرے اندر کوئی موسم کہیں مُرجھانے والا ہے

ظفر ، تھک ہار کر تم خود ہی رُک جاؤ تو رُک جاؤ
وگرنہ قافلہ تو اور آگے جانے والا ہے

☆

سحر سے پیشتر ہی رات مَیں نے ختم کر دی ہے
ابھی باقی تھی ، لیکن ، بات مَیں نے ختم کر دی ہے

طریقِ تازہ کا آغاز کرنا ہے کوئی منظر
کہ یہ تصویرِ موجودات مَیں نے ختم کر دی ہے

کوئی اب اور ہے ہونے نہ ہونے کی ہواؤں میں
کہ اپنی درمیاں سے ذات مَیں نے ختم کر دی ہے

کہیں بے رنگیِ شام و سحر کو راستہ دے کر
کوئی رنگینیِ حالات مَیں نے ختم کر دی ہے

مرے آنسو کئی دن سے مرے اندر ہی گرتے ہیں
وہ باہر کی طرف برسات مَیں نے ختم کر دی ہے

مناسب ہے سہولت سے کسی بھی وقت رو لینا
کہ وہ پابندیِ اوقات مَیں نے ختم کر دی ہے

محبت اک نئے انداز سے کرنی ہے اب اُس سے
جو پہلے تھی ، اُسی کے ساتھ مَیں نے ختم کر دی ہے

اکیلے میں اُسے ملنے کی خواہش تھی بہت ، لیکن
سراسر وہ بھی لگتے ہاتھ مَیں نے ختم کر دی ہے

غزل کا ، اے ظفر ، چاروں طرف پھیلاو ہے کیسا
کہ اس کی حدِّ امکانات مَیں نے ختم کر دی ہے

☆

غلط کیا ہے مِرے ہونے میں ، کیسا ہوتا جاتا ہُوں
کہ جیسا چاہتے ہو مَیں تو ویسا ہوتا جاتا ہُوں

تُمھارے دیکھنے سے تھا بُرا ہونا ، اگر تھا بھی
دوبارہ دیکھتے ہو ، مَیں دوبارہ ہوتا جاتا ہُوں

تُمھیں بھی مسئلہ کوئی نہ ہو درپیش ، اور ، مَیں بھی
یُونہی رہ جاؤں ، تُم سے دُور اِتنا ہوتا جاتا ہُوں

اُترتے پانیوں میں ہے مِری تعبیر کی مچھلی
پریشاں رہنے والا خواب دریا ہوتا جاتا ہُوں

کوئی صُورت نئی اِیجاد ہونی چاہیے مُجھ میں
اِسی خاطر تو رفتہ رفتہ صحرا ہوتا جاتا ہُوں

لرزتا ہے عدم کی شاخ پر میرا وُجود اب بھی
مَیں اُتنا ہی نہیں ہوتا ہُوں جتنا ہوتا جاتا ہُوں

ابھی اِس شہر کا کُچھ کہہ نہیں سکتے کہ مَیں اِس میں
مُعزز ہوتا جاتا ہُوں کہ رُسوا ہوتا جاتا ہُوں

بصارت کم ہوئی جاتی ہے جُوں جُوں اہلِ دُنیا کی
اُسی نسبت سے اُتنا ہی تماشا ہوتا جاتا ہُوں

اثر اُلٹا ہی پڑتا ہے ، ظفرؔ ، مُجھ پر زمانے کا
وہ جتنا مارتا ہے ، اور زندہ ہوتا جاتا ہُوں

-☆-

پردۂ شب سے پرے چاند جھجکنے لگا
اِتنے اندھیرے میں بھی خواب چمکنے لگا

راستے روشن ہُوئے آتشِ وارفتہ سے
شام سُلگنے لگی ، شعلہ بھڑکنے لگا

ایک سمندر یہاں کھانے لگا پیچ و تاب
کوئی ستارہ کہیں آنکھ جھپکنے لگا

خُوں میں ہے گردش وُہی ، باغ میں رونق وُہی
دل جو مہکنے لگا ، پھول دھڑکنے لگا

راہ رواں تھی ، مگر ، کوئی رُکاوٹ بھی تھی
وہ بھی ٹھہرنے لگے ، مَیں بھی اٹکنے لگا

یاد کے صفحے سے وہ شکل ہی مِٹتی گئی
پھر در و دیوار سے آپ جھلکنے لگا

نام و نشاں کُچھ نہ تھا جس کی رہی جُستجو
شہر وہ جنگل تھا مَیں جس میں بھٹکنے لگا

جمع ہُوئی خلق سب میری حفاظت کو جب
ڈر کسی پتّے کی طرح مُجھ میں کھڑکنے لگا

چھیل چکے تھے ، ظفرؔ ، میرے کنارے بہت
آپ تماشا ، مگر ، اور چھلکنے لگا

-☆-

دل بجھ گیا تو کیا ہے کہ دنیا تو ہے ابھی
کچھ اور ہو نہ ہو یہ تماشا تو ہے ابھی

خود ہی بھٹک رہے ہیں بیابانِ خواب میں
باہر نکلنا چاہیں جو رستہ تو ہے ابھی

ممکن نہیں جو ہونٹ بھگونا تو کیا ہوا
خوش ہیں کہ اپنی راہ میں دریا تو ہے ابھی

جیسے رگوں میں خاک سی اُڑتی ہو دُور تک
دل میں بھی ایک صورتِ صحرا تو ہے ابھی

پانی حدوں سے باہر اُچھلنے کو ہے ، مگر
کچھ اُس کے راستے میں کنارہ تو ہے ابھی

اُس سے کبھی ہماری ملاقات ہو نہ ہو
ہم اُس کو دیکھ لیتے ہیں ، اتنا تو ہے ابھی

ایسا بھی رہ نہ پائے تو پھر کیا کریں گے ہم
ویسا اگر نہیں ہے وہ ، ایسا تو ہے ابھی

اک پھول اِس زمین پہ باقی تو ہے یہاں
اپنے فلک پہ کوئی ستارہ تو ہے ابھی

ڈرتا ہوں میں کہ وہ کہیں خود ہی نہ ہو ، ظفر
اُس بام پر چراغ سا جلتا تو ہے ابھی

☆

اگر اب بھی مری عزت نہیں کی جا سکتی
یوں کہو ترک یہ عادت نہیں کی جا سکتی

اہلِ دنیا میں تماشا نہ بنائیں مجھ کو
شاید اتنی بھی رعایت نہیں کی جا سکتی

سرسری ، اور ، بہت عام سی لگتی ہے ، مگر
بات وہ کہنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی

گوشۂ چشم میں اُس کے کہیں موجود تو ہے
وہ اجازت جو عنایت نہیں کی جا سکتی

ایک افسانہ و افسوں ہے جو ہونا میرا
کیوں بیاں اتنی حقیقت نہیں کی جا سکتی

آگے آیا ہے جو ، اپنا ہی کیا ہے یکسر
اس لیے کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی

بہت اچھا ہے زمانے سے جو محفوظ ہیں آپ
لیکن ، اتنی بھی حفاظت نہیں کی جا سکتی

آڑے آ جاتی ہے کچھ اُس کی شرافت ہر بار
کون سی ، ورنہ ، شرارت نہیں کی جا سکتی

بات بے بات بگڑ بیٹھتے ہو اُس سے ، ظفر
اس طرح سے تو محبت نہیں کی جا سکتی

☆

کرنے سے زیادہ ہُوں نہ کرنے میں نمودار
ہوتا ہُوں بہت کام سے ڈرنے میں نمودار

تھا پردۂ خوابِ گُزراں بیچ میں حائل
دُنیا ہُوئی دُنیا سے گُزرنے میں نمودار

یہ وقت کا رہوار ہے ایسا کہ شب و روز
چلنے میں ہے غائب تو ٹھہرنے میں نمودار

اوجھل ہُوں نظر سے، مُجھے ہونا ہے کسی دن
تصویرِ تماشا پہ بکھرنے میں نمودار

ظاہر نہیں کرتا مجھے یکسُو مرا ہونا
ہوتا بھی اگر ہُوں تو بکھرنے میں نمودار

مَیں سینۂ کہسار سے ہی پھُوٹ نکلتا
ہوتا کسی چشمے، کسی جھرنے میں نمودار

ہوتا تھا بہت گرم نوائی میں ہویدا
اب اور بھی ہوتا ہُوں نکھرنے میں نمودار

پوشیدہ رہا زندگی بھر سب کی نظر سے
اب جا کے ہُوا ہُوں کہیں مرنے میں نمودار

ٹُوٹا ہُوا تارا ہُوں، ظفرؔ، اور، سرِ شام
افلاک سے ہوتا ہُوں اُترنے میں نمودار

☆

موسم ہواؤں کا مرے اندر نہیں کھلا
دستک تو دے چُکا ہُوں، مگر، در نہیں کھلا

عکسِ خیال آئنۂ دل پہ بند ہے
آنکھوں کے گرد خواب کا منظر نہیں کھلا

بندش بھی رہ گئی ہے کشایش کے ساتھ ساتھ
دروازہ تو کھلا ہے، مگر، گھر نہیں کھلا

جھک کر ہی باریاب ہُوا بزمِ ناز میں
دروازہ میرے قد کے برابر نہیں کھلا

ایسا بھی ایک رازِ محبت ہے جو ابھی
اُس پر تو ہے کھلا ہُوا، مُجھ پر نہیں کھلا

جا بھی چُکی وہ رات، مگر، اس کے باوجود
اک روشنی کا راستہ دن بھر نہیں کھلا

دریا رواں تھا، ہونٹ مرے تر نہ ہو سکے
شب ہو گئی بسر، مرا بستر نہیں کھلا

کیسی وہ دھوپ تھی جو چمکتے ہی بُجھ گئی
کیسا یہ ابر ہے جو برس کر نہیں کھلا

نالاں ہُوں قُفلِ بابِ معانی سے، اے ظفرؔ
اکثر ہی سعی کرتا ہُوں، اکثر نہیں کھلا

☆

باقی تھا ابھی دن کہ بجی رات کی نوبت
آئی ہی تھی اک روز تو اس بات کی نوبت

کچھ سوچنے کا عشق میں موقع ہی نہیں تھا
آنے ہی نہیں پائی خیالات کی نوبت

اس شورِ مسلسل میں پتا کچھ نہیں چلتا
یہ نفی کی نوبت ہے کہ اثبات کی نوبت

درہم ہوا کچھ خوابِ قناعت کا قرینہ
مدھم ہوئی کچھ شامِ طلسمات کی نوبت

ایسے نہیں احوال جو کہتے پھریں تم سے
آئی نہیں فی الحال شکایات کی نوبت

چھانے لگا آنکھوں پہ کوئی ابر کا ٹکڑا
بجنے لگی چھت پر کسی برسات کی نوبت

ہو فکر جوابات کے بارے میں بھلا کیا
سنتا ہی نہیں کوئی سوالات کی نوبت

کر سکتا نہیں ٹھیک انھیں کوئی بھی اب تو
پہنچی ہے کچھ اس موڑ پہ حالات کی نوبت

نقارۂ دل پیٹتا رہتا ہے، ظفر، کون
اک عمر سے جاری ہے مری ذات کی نوبت

☆

مرے خیال میں جنگل گھنا بھی ہوتا ہے
تو اس کے بیچ کوئی راستہ بھی ہوتا ہے

کسی کے جانے کا غم اس لیے نہیں کرتے
کہ ساتھ ساتھ کوئی آ رہا بھی ہوتا ہے

رواں دواں خبر و خواب کے خرابے میں
مقام کوئی بہت پُرفضا بھی ہوتا ہے

یہ اور بات کہ باہر سے ہم گزر جائیں
وگرنہ در تو وہ اکثر کھلا بھی ہوتا ہے

در و دریچہ پہ نظریں جمی رہیں کہ یہاں
وہ پردہ پوش کبھی خود نما بھی ہوتا ہے

دل اس کی زلفِ تراشیدہ کا اسیر سہی
کبھی کبھار یہ قیدی رہا بھی ہوتا ہے

کچھ اس کے بجھنے کا خطرہ نہیں، علاوہ ازیں
دیے کے گرد حصار ہوا بھی ہوتا ہے

میں اپنے آپ سے رہتا بھی ہوں قریب، مگر
مرے وجود میں اک فاصلہ بھی ہوتا ہے

یہ لازمی ہے کہ دونوں کے درمیاں میں، ظفر
کسی طرف سے کوئی تیسرا بھی ہوتا ہے

☆

رُکاوٹ پڑی ہے ، روانی ملے
محبت کی مچھلی کو پانی ملے

بھلا اور کیا چاہیے اس کے بعد
جو ہم کو تری باغبانی ملے

کبھی تو یہ موسم بھی تبدیل ہو
کہیں تو وہ صورت سُہانی ملے

میں جاری ہی رکھوں گا اس کی تلاش
اگر پھر مجھے زندگانی ملے

فلک بھی لگے خاک جیسا کبھی
زمیں کو بھی رنگ آسمانی ملے

میں دونوں ہی طرفوں سے بیزار ہوں
طرف اب کوئی درمیانی ملے

بتاتی ہے میں نے اُسے کوئی بات
مجھے گر مری بے زُبانی ملے

اُٹھا لاؤ جا کر کہیں سے کوئی
نئی مل سکے یا پُرانی ملے

کناروں سے باہر پڑا ہوں ، ظفر
مجھے اور کیا بےکرانی ملے

☆

جو شور سا کوئی میری صدا کے اُوپر ہے
سو ، ایک اور ہوا بھی ہوا کے اُوپر ہے

سمیٹ دے کہ مجھے بے کنار رہنے دے
مری حدوں کا تعیُّن خُدا کے اُوپر ہے

دوائے درد سے مایُوس ہی مُجھے سمجھو
یہ انحصار جو میرا دُعا کے اُوپر ہے

کسی طرح تو پہنچتا ہے اس نے مُجھ تک بھی
جو روشنی کی ردا سی گھٹا کے اُوپر ہے

وہ ایک عید لہُو میں نہا کے نکلی ہُوئی
بنائے خواب اُسی کیمیا کے اُوپر ہے

اِک اور سلسلۂ نارسا بھی ہے جو کہیں
ہمارے سلسلۂ نارسا کے اُوپر ہے

اُسی کے دم سے منوّر ہیں شہر کی شامیں
یہ داغ سا جو ہماری قبا کے اُوپر ہے

کہیں لرزتا ہُوا موجِ سبزہ پر کوئی پھُول
کہیں پڑا ہُوا فرشِ صبا کے اُوپر ہے

زیادہ فرق نہیں مُجھ میں اور اُس میں ، ظفر
میں اِنتہا پہ ہوں ، وہ اِنتہا کے اُوپر ہے

☆

جیسے کتاب میں سوکھے پھول کی ایک مہک رہ جاتی ہے
ختم بھی ہو جائے جو محبت، کوئی کسک رہ جاتی ہے

آنسوؤں کے تھمتے ہی اُس کے رنگ بکھرتے ہیں دل پر
ابر برس کر کھل جاتا ہے، اور، دھنک رہ جاتی ہے

اِدھر اُدھر کی راہیں ساری ناپتا رہتا ہوں، لیکن
خواب کے اندر جانے والی کوئی سڑک رہ جاتی ہے

وہ تو ایک احساس ہے، اُس کو جیسا بھی محسوس کرو
دل سے ہاتھ اُٹھا بھی لے، پھر بھی ٹھنڈک رہ جاتی ہے

اپنا ڈوبنا اور اُبھرنا اک معمول کی بات سہی
دریا کے اندر بےچینی سی بے شک رہ جاتی ہے

جب بھی گزر جاتا ہے وہ بجلی سی گراتے ہوئے کبھی
دل میں دھواں بھر جاتا ہے، آنکھوں میں چمک رہ جاتی ہے

ایک پریشانی ہوتی ہے اُس کے آنے سے پہلے
اور کوئی اُلجھن سی اُس کے جانے تک رہ جاتی ہے

سبھی تکلف اُٹھ جاتے ہیں بزمِ خیال میں اُس کے ساتھ
پھر بھی کہیں رُکنا پڑتا ہے، کہیں جھجک رہ جاتی ہے

دل میں داخل ہو جاتی ہے رفتہ رفتہ شام، ظفر
آسمان پر جتنی دیر کے لیے شفق رہ جاتی ہے

-☆-

جلدی ہی ٹل گئی جو مصیبت ہی نہیں تھی
ایسے ہے جیسے اب کے محبت ہی نہیں تھی

صحرا کی سمت عزمِ سفر کر چکے جو ہم
دیکھا تو سر میں اگلی سی وحشت ہی نہیں تھی

مصروفیت ہی اتنی رہی کارِ عشق میں
ہم کو وصالِ یار کی فرصت ہی نہیں تھی

دل سے نکل گئی جو تمنا ہی تھی کہاں
سر سے گزر گئی جو قیامت ہی نہیں تھی

تحریرِ خوابِ وصل میں پڑھتا بھی کس طرح
خالی ورق تھا، کوئی عبارت ہی نہیں تھی

پایانِ کار جو بھی تھا، اُس کاروبار پر
کچھ فخر بھی تھا مجھ کو، ندامت ہی نہیں تھی

اِس جورِ ناروا کا سبب اُس سے پوچھتے
اتنی تو اُس کے سامنے ہمت ہی نہیں تھی

جس سے نکالنے کا ہمیں حکم تھا یہاں
اُس شہر میں تو اپنی سکونت ہی نہیں تھی

کی ہے محبت اُس سے غلط وقت پر، ظفر
فی الحال اُس کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی

-☆-

مُشکل میں پڑا ہُوں کسی آساں کی بدولت
ایماں ہے مرا خامیِ ایماں کی بدولت

رنگِ فلک سے تو اُترتے نہیں اتنے
گُل پھُول ہیں سب خوابِ گلستاں کی بدولت

ہے آمد و رفت اتنی جو دیوانوں کی ہر روز
آباد ہے یہ شہر بیاباں کی بدولت

تصویر تو موجود تھی قرطاس پہ، لیکن
غائب ہُوئی اک نقشِ نُمایاں کی بدولت

تھی موجِ محبت دلِ خالی کا کرشمہ
ملبُوس ہو جیسے تنِ عُریاں کی بدولت

مارے گئے ہم لوگ کہ تھے بے سروساماں
لُوٹے گئے باقی سروساماں کی بدولت

ہے خواب خزانہ کسی خواہش کے سبب سے
اور، دولتِ دل ہے کسی ارماں کی بدولت

مُمکن ہے کوئی کام لیا جانا ہو مُجھ سے
موجود ہُوں شاید کسی اِمکاں کی بدولت

وہ قافلہ معنی، ظفرؔ، دیر کے بعد اب
آیا ہے نظر گردِ گُریزاں کی بدولت

-☆-

پہنچنا ہے مجھے دریا کنارے راستے پر
مَیں چل سکتا نہیں ہوں اب تمھارے راستے پر

وہ گُم تھے، آپ منزل چل کے جس کے پاس آئی
پڑے ہیں آج بھی قسمت کے مارے راستے پر

کبھی ہجرت میں تھے، بھاگے ہُوئے شہروں سے اپنے
ملے ہیں دوست دُشمن سب ہمارے، راستے پر

مَیں سامانِ سفر کرتا رہا ہُوں جمع پہلے
اور، اُس کے بعد باقی دن گزارے راستے پر

نِکل آئے کبھی یادوں کے جگنو سے تمھارے
کبھی اُڑتے رہے میرے شرارے راستے پر

ہمیں رُخصت کریں گے چاند، سُورج، کہکشائیں
ہمارے منتظر ہوں گے ستارے راستے پر

یہاں تو دُھوپ کا طوفاں بپا رہتا تھا کوئی
کہاں سے آ گئے ہیں پیڑ سارے راستے پر

مُجھے پاگل سمجھ کر کُچھ نہیں کہتا ہے کوئی
غلط بھی کاٹتا ہُوں مَیں اشارے راستے پر

ظفرؔ، پہنچا ہُوں، خالی ہاتھ ہی گھر واپسی میں
کہ پیچھے رہ گئے سارے نظارے راستے پر

-☆-

ہیں صرف کناروں کے نہ دھاروں کے مخالف
ایسا ہے کہ اب لوگ ہیں ساروں کے مخالف

اوّل تو ہمارے ہی موافق نہیں اپنے
ہم اس سے زیادہ ہیں ہماروں کے مخالف

رکھتے ہیں سہاروں کی تلاش، اور، تمام
منہ سے ہیں بہرکیف سہاروں کے مخالف

کچھ لوگ چلے تھے جو یہاں پھول کھلانے
نکلے وہ زیادہ ہی بہاروں کے مخالف

ہونا تھا یہی حشر ہمارا جو رہے ہم
پھولوں کے طرفدار نہ خاروں کے مخالف

آخر ہمیں اُن پر بھی سفر کرنا پڑا اب
ہم لوگ تھے جن راہگذاروں کے مخالف

ہو سکتے کسی روز خلاف اُس کے بھی، اے کاش
ہم یوں تو رہے ہوں گے ہزاروں کے مخالف

ٹھہرا ہے ضروری ترا کچھ منہ سے بھی کہنا
ویسے تو نہیں ہم بھی اشاروں کے مخالف

سر میں تھا یہ شور اور طرح کا، ظفر، اب کے
ہوتے گئے ہم اپنے ہی پیاروں کے مخالف

☆

حسن اتنا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ!
حال ایسا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

ڈوب مرنا بھی نہیں ہے ممکن
یہ وہ دریا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

یہ جو آباد ہے اُن آنکھوں میں
ایک دُنیا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

چوم سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں
کیا سراپا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

پیش رفت اور تو کیا ہو ممکن
یہی سوچا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

بہتری دیکھتے رہنے ہی میں ہے
یہی اچھا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

دل میں اُڑتے ہیں بگولے کیا کیا
کوئی صحرا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

یہ نہ ہونا ہے کہ ہونا میرا
وہ تماشا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

کیا مدد کیجیے اُس کی کہ ظفر
یہی کہتا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

☆

سر بھی میرا نہیں ، وحشت بھی کسی اور کی ہے
کر رہا ہُوں جو محبت بھی کسی اور کی ہے

مَیں نے دیکھے تھے اِن آنکھوں سے کسی اور کے خواب
اور ترے خُوں میں امانت بھی کسی اور کی ہے

ایسے لگتا ہے کہ مَیں خُود بھی کوئی اور ہُوں اب
اور ، مرے دل کی یہ حالت بھی کسی اور کی ہے

ہے یہ مر جانے کی مُہلت مری اپنی ، ورنہ
زندہ رہنے کی مُصیبت بھی کسی اور کی ہے

صِرف افسانہ ہی میرا ہے یہاں چاروں طرف
درمیاں میں یہ حقیقت بھی کسی اور کی ہے

کھا رہا ہُوں مَیں زمانوں سے کسی اور کا رزق
میرے آگے ہے جو قسمت بھی کسی اور کی ہے

یہ کسی اور کا حق مار رکھا ہے مَیں نے
شاعری اور یہ شُہرت بھی کسی اور کی ہے

مَیں کہیں مُفت میں مارا ہی نہ جاؤں کہ دراصل
شخص ہے اور ، شکایت بھی کسی اور کی ہے

جتنی جِدّت سے مُجھے ہوتی ہے محسُوس ، ظفر
سچ کہوں تو یہ ضرورت بھی کسی اور کی ہے

☆

کس طرح کا یہ ، ظفر ، ذوق نمو آگے ہے
شاعری پیچھے رہی جاتی ہے ، تُو آگے ہے

اپنے ہی عکس میں تبدیل ہُوا جاتا ہُوں
کہ بہت پاس کوئی آئنہ رُو آگے ہے

اپنے ہی آپ سے خالی ہُوا پھرتا ہُوں یہاں
طوق تنہائی ابھی زیبِ گلو آگے ہے

پھُول کوئی نظر آتا نہیں چاروں جانب
ہے کوئی باس عقب میں ، کوئی بُو آگے ہے

ایک پس ماندگی ایسی ہے کہ اندر ہے رواں
پیش رفت اور ہی باہر ہمہ سُو آگے ہے

پیاس نے روک رکھا ہے مجھے رستے میں کہیں
اور ، بہت دُور یہاں سے لبِ جُو آگے ہے

خُوں سے پُر ہے جو بدن کی یہ صُراحی نزدیک
تو کسی اور ہی منزل پہ سبُو آگے ہے

فاصلے کا فقط احساس ہے ، کُچھ بھی نہیں اور
ورنہ جو کُچھ بھی ہے مجھ سے سر مُو آگے ہے

چیتھڑا چیتھڑا موجُود یہاں پر ہُوں ، ظفر
اور کوسوں ہی کہیں خواب رفُو آگے ہے

☆

شیشے کی شباہت کوئی پتھر سے نکالوں
اندر جو نہیں ہے اُسے اندر سے نکالوں

ساحل سے تماشا ہی نہ کرتا رہوں بے سُود
اور اُٹھ کے ستارے کو سمندر سے نکالوں

ہو جاؤں پھر اک بار اندھیرے کی علامت
پھر کوئی چراغ اپنے برابر سے نکالوں

کیسا رہے اس رات سے کر کے کوئی سازش
یہ صبح کا سودا ہی اگر سر سے نکالوں

آغوش میں رکھ کر کوئی خرمستی خاموش
آواز کو اس گنبدِ بے در سے نکالوں

گنجائش اب اتنی کہاں ، اے خواہشِ خوش خواب
گھر میں تجھے ڈالوں تو کسے گھر سے نکالوں

میں خود ہی جسے دیکھ کے ہو جاؤں پریشان
تصویر کچھ اس طرح کی منظر سے نکالوں

گم ہونے لگے ہیں مرے اجداد کے آثار
ٹوٹا ہوا رشتہ کوئی بندر سے نکالوں

بخشے جو ، ظفر ، زندگی کرنے کا سلیقہ
وہ لفظ کبھی موت کے منظر سے نکالوں

-☆-

دیتے آواز کبھی میرے پکارے ہوئے خواب
اور ، اُبھرتے وہ کسی تہ میں اُتارے ہوئے خواب

اک نئی نیند کے اندر سے نکالی ہوئی نیند
اور ، کسی خواب کے باہر سے گزارے ہوئے خواب

تاب لاتا بھی تو کیوں کر خس و خاشاک بدن
دیکھتے دیکھتے دم بھر میں شرارے ہوئے خواب

کہیں بے نام زمینوں پہ اُگے جا کے خیال
آسماں کوئی نہ تھا جس کے ستارے ہوئے خواب

اُڑ گئے کچھ مری آنکھوں سے کبوتر بن کر
چھوٹ کر کچھ مرے ہاتھوں سے غبارے ہوئے خواب

بہتا جاتا مری شہ رگ سے گرایا ہوا خون
بجھتے جاتے مری نظروں کے نکھارے ہوئے خواب

جس کا جتنا ہو مقدر ، اُسے مل جاتا ہے
گم ہوئے اور کسی کے تو ہمارے ہوئے خواب

کس نئی فتح کی دیتے ہیں بشارت مجھ کو
میری بچھڑی ہوئی خوشیاں ، مرے ہارے ہوئے خواب

اک رکاوٹ بھی رہی ساتھ روانی کے ، ظفر
پیاس ہوتی گئی پانی تو کنارے ہوئے خواب

-☆-

تنہا یہ بار خواب اُٹھانا پڑا مجھے
اور، اپنے بعد آپ ہی آنا پڑا مجھے

میں اُس کے راستے کی رکاوٹ تھا آپ ہی
دریا یہ پار کر کے ہی جانا پڑا مجھے

وہ دھوپ تھی کہ کچھ نظر آتا نہ تھا کہیں
پردہ یہ درمیاں سے ہٹانا پڑا مجھے

کب تک اُٹھائے پھرتا میں کاندھے پہ اپنا بوجھ
ساماں یہ راستے میں لُٹانا پڑا مجھے

خلقت بلاسبب ہی پریشاں تھی اس قدر
میں کچھ نہیں ہوں، سب کو بتانا پڑا مجھے

دشمن زمین ہی تھی مری، اور، ایک دن
اُس پر یہ آسماں ہی گرانا پڑا مجھے

مجھ کو کبھی پسند نہ تھا بستر سخن
آخر یہ بوریا ہی بچھانا پڑا مجھے

آخر تو میرے پاس تماشا تھا ایک ہی
اور، وہ بھی بار بار دکھانا پڑا مجھے

مجبوریاں تھیں وہ مری اپنی ہی، اے ظفر
ڈھانا پڑا کہیں کہ بنانا پڑا مجھے

☆

دکھایا اور کچھ تھا اور، اب کیا دے رہا ہوں
چلو دے ہی رہا ہوں، چاہے دھوکا دے رہا ہوں

محبت میں حساب بیش و کم ممکن نہیں ہے
کہ لے بیٹھا ہوں کیا کچھ، اور کتنا دے رہا ہوں

مرا دامن بھی خالی ہونے والا ہے، سو، اس وقت
غنیمت جان لو جو کچھ بھی، جیسا دے رہا ہوں

میں پورے بوسے کا احسان اُٹھا سکتا نہیں تھا
سو، آدھا رکھ لیا ہے، اور آدھا دے رہا ہوں

نیا کھاتا کھلے گا جب تو دیکھا جائے گا پھر
حساب اب تک تو میں اپنا پُرانا دے رہا ہوں

ہوں آپ اپنے لیے دیوار بھی، اور، گرتے پڑتے
کہیں تھوڑا بہت خود کو سہارا دے رہا ہوں

ضروری تھی یہ تبدیلی مرے اپنے لیے بھی
جو صحرا لے رہا ہوں اور، دریا دے رہا ہوں

میں خود پوری طرح بوسیدہ ہو جانے سے پہلے
دکھانے کو نیا خواب تماشا دے رہا ہوں

ظفر، لوٹا رہا ہوں قرض دُنیا سود کے ساتھ
لیا تھا جس قدر اُس سے زیادہ دے رہا ہوں

☆

کہیں اپنی رسائی میں تو وہ بے شک نہیں تھا
مگر اتنا حسیں ہونے کا اُس کو حق نہیں تھا

ابھی تو صرف جولانی تھی اور موجِ مسرّت
ابھی تو رنگ بھی چہرے کا اتنا فق نہیں تھا

محبت بھیک میں ہی دے سکے تھوڑی بہت وہ
مجھے شک تو بہت تھوڑا تھا، لیکن بک نہیں تھا

اگر باہر نہیں نکلا تو اچھا رہ گیا وہ
وہاں تو جیسے میں خود ہی پسِ دستک نہیں تھا

سجی تھیں مفت شوکیسوں میں اشیائے ضرورت
دکانِ شوق میں لیکن کوئی گاہک نہیں تھا

یقیں آتا نہیں اب بھی اُس اندازِ طلب پر
خیال اُس کا مجھے اُس وقت بھی مطلق نہیں تھا

خدا کو ہی نہ تھی منظور یہ کاوش، وگرنہ
نہیں تھا مختلف، یا میں بہت ان تھک نہیں تھا

بہت پیچھے کہیں پر رُک گیا تھا آتے آتے
کہ میرا خواب شاید اس زمانے تک نہیں تھا

ظفرؔ مجھ کو سمو سکتی وہ کیوں کر اپنے اندر
زمینِ شہر کا سینہ زیادہ شق نہیں تھا

☆

حسرت لیے پھرو، کبھی حیرت لیے پھرو
جو ہاتھ آئے حسبِ ضرورت لیے پھرو

مشکل ہے بارِیاب جو ہونے دے وہ کبھی
بے شک برائے نام اجازت لیے پھرو

پہنچا ہے دُکھ اگر تو بھلا دو کسی طرح
جو مل نہیں سکی وہ مسرّت لیے پھرو

ہونٹوں پہ ایک بوسۂ بے نام سے الگ
آنکھوں میں کوئی شکل و شباہت لیے پھرو

صورت کوئی اسی سے نکل آئے گی کبھی
لوحِ جبیں پہ نقشِ ندامت لیے پھرو

بہتر ہے چلتے پھرتے ہی کاٹو یہ صبح و شام
اور اپنے ساتھ ساتھ محبت لیے پھرو

جیسے بھی کر لیا ہے گوارا یہ رنجِ دل
جیسی بھی ہو گئی ہے یہ حالت لیے پھرو

ہم نے تو کچھ نکال لیا ہے کہیں سے کام
تم شوق سے یہ اپنی شرافت لیے پھرو

قائل اُسے تو کر نہ سکے ذرّہ بھر، ظفرؔ
چھوڑو یہ بحث اور، وکالت لیے پھرو

☆

قیامت آنے والی ہے یہ سارا کیا بنے گا
ہمارا کیا بنے گا ، اور ، تمھارا کیا بنے گا

وہ جس دن اپنی اپنی شکل پہچانیں گے سارے
وہ منظر کیا رہے گا ، اور ، نظارا کیا بنے گا

ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے کہ آئندہ ہماری
علامت کیا رہے گی ، استعارہ کیا بنے گا

سمندر سے نکل آنا ہی ناممکن ہے اپنا
سو ، ایسے حال میں ہم سے بچارہ کیا بنے گا

عبارت خوب ہے، جا کر کہیں کھو جائیں گے ہم
مگر ، گھر سے نکلنے کا اشارہ کیا بنے گا

ابھی تو لہر ہے ، اور ، دُوسری لہروں میں شامل
میں چاہوں بھی اگر تو اس کا دھارا کیا بنے گا

یہیں مُرجھا کے رہ جائے گا یہ دو چار دن میں
یہ غم اتنا سا ہے ، اس کا غبارہ کیا بنے گا

بہُت اچھی طرح یہ بات ہم بھی جانتے ہیں
بگاڑیں گے جو منظر وہ دوبارہ کیا بنے گا

ظفرؔ خود ڈھونڈتا پھرتا ہے جو دیوار کوئی
کسی بھی دُوسرے کا وہ سہارا کیا بنے گا

-☆-

کہیں تو جائیں جو یہ راستے نکالتا ہوں
کہ رائگاں ہی نئے زاویے نکالتا ہوں

جہاں تہاں کئی ڈر ہیں ، ابھی نہیں معلوم
کے بُلاتا ہوں اندر ، کسے نکالتا ہوں

نکالتا ہوں کسی چیز سے کئی چیزیں
یہ جانتا بھی نہیں کِس لیے نکالتا ہوں

مرے دماغ میں ہوتی ہے بُود و باش اُس کی
میں یاد رکھتا ہوں دل سے جسے نکالتا ہوں

بھری ہے یُوں تو بدی ہی بدی مرے اندر
جگہ ذرا سی ترے واسطے نکالتا ہوں

بدلتی رہتی ہے ، ترتیب اُلٹی رہتی ہے
سیاہ رکھتا ہوں اندر ، ہرے نکالتا ہوں

یہ کیا کہ صبح کو رہ جائے پھر بھی تُو باقی
کہ اپنے آپ سے شب بھر تُجھے نکالتا ہوں

نئے نکالنے کی مُجھ کو ہے کہاں فرصت
زیادہ تر وہی نکلے ہوئے نکالتا ہوں

اُنھی کے بیچ میں رکھتا ہوں سب بھلا کے ، ظفرؔ
میں پتھروں سے اگر آئنے نکالتا ہوں

-☆-

رونا جو ہے جُڑا ہُوا گانے کے ساتھ ساتھ
یُوں ہم بھی چل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ

اپنا یہ کوئی رنگِ طلب ہی نہ ہو کہیں
جانے لگے جو ہم ترے آنے کے ساتھ ساتھ

خوفِ فسادِ خلق بھی درپیش ہے مُجھے
کُچھ جو چھپا رہا ہُوں بتانے کے ساتھ ساتھ

دیتا ہُوں بھاگنے میں مدد بھی مَیں چور کو
باہر نکل کے شور مچانے کے ساتھ ساتھ

رکھتا ہُوں سب حساب کم و بیش رات دن
کرتا ہُوں اُس کو یاد بُھلانے کے ساتھ ساتھ

اُٹھتی ہے موجِ خُوں ہی سرِ ساحلِ ہوس
بجتا ہے طبلِ دِل بھی ترانے کے ساتھ ساتھ

آگے جو دیکھتا ہُوں تو پیچھے بھی ہے نظر
طرزِ سخن نیا ہے پُرانے کے ساتھ ساتھ

منظر کی جس میں ایک جھلک ہی دکھائی دے
پردے گرا رہا ہُوں اُٹھانے کے ساتھ ساتھ

ماحول ، اور ، آب و ہوا اور ہے ، ظفؔر
ہم بھی بدل چکے ہیں ٹھکانے کے ساتھ ساتھ

☆

کُفر سے یہ جو مُنوّر مری پیشانی ہے
ظاہر اس سے بھی مرا جذبۂ ایمانی ہے

یہ جو یکسُوئی مُیسّر ہے مجھے شام و سحر
سربسر میرے لیے وجہِ پریشانی ہے

اس کنارے پہ فقط مَیں ہُوں اکیلا خالی
نہر کے دُوسری جانب مری حیرانی ہے

خاک اُڑتی ہے تو ہر سُو مرے اندر ، ورنہ
جس طرف مَیں ہُوں وہاں چاروں طرف پانی ہے

جو سیہ فام ہے اندر کی طرف سے جتنا
اُس کے چہرے پہ یہاں اُتنی ہی تابانی ہے

موسموں سے ابھی مایُوس نہیں ہُوں یکسر
اک ہوا ہے جو ابھی میری طرف آنی ہے

دِل میں کیا صُورتِ حالات ہے ، کھُلتا نہیں کُچھ
کیا کمی ہے یہاں کِس شے کی فراوانی ہے

یہ عجب طرح کا بازارِ سخن ہے کہ جہاں
مَیں ہی نایاب ہُوں اور میری ہی ارزانی ہے

آزمائش میں ہی رکھتا ہُوں سدا خُود کو ، ظفؔر
میری مُشکل ہی سراسر میری آسانی ہے

☆

قافلے میں کہیں شامل بھی نہیں ہو سکتا
اور، میں راہ میں حائل بھی نہیں ہو سکتا

کس لیے بھاگتا پھرتا ہوں اسی کے پیچھے
وہ ہدف جو مجھے حاصل بھی نہیں ہو سکتا

یہ بھی سچ ہے کہ محبت نہیں مہلک، لیکن
اثر اس زہر کا زائل بھی نہیں ہو سکتا

خود نہ چاہے تو الگ بات ہے، لیکن، یہی کام
کوئی اُس کے لیے مشکل بھی نہیں ہو سکتا

عجز تو خو ہے مری، جس کا یہ مطلب بھی نہیں
کہ وہاں میں کسی قابل بھی نہیں ہو سکتا

راستہ روز بدل لیتا ہوں چلتے چلتے
اس لیے وہ مری منزل بھی نہیں ہو سکتا

منتخب خود ہی کیا میں نے سفر کی خاطر
جو سمندر کبھی ساحل بھی نہیں ہو سکتا

کوئی تسلیم بھی کرتا نہیں اس کو ہرگز
اور، دعویٰ مرا باطل بھی نہیں ہو سکتا

حسن ہے ایک حصار اپنے لیے خود ہی، ظفر
میں تو اُس شہر میں داخل بھی نہیں ہو سکتا

☆

منظر کوئی اس گہنہ فضا سے نہیں نکلا
میں اس لیے بھی دشتِ دعا سے نہیں نکلا

سرمست ہوا پھرتا ہوں میں جس کی مہک سے
وہ پھول ابھی میری صدا سے نہیں نکلا

پتا سا اُڑا پھرتا ہوں میں یوں ہی بلا سمت
اک عمر ہوئی اپنی ہوا سے نہیں نکلا

اک پانو پھنسا رہ گیا پایانِ سخن میں
اک پیچ مری طبعِ رسا سے نہیں نکلا

بیماریٔ دل راس تو آئی ہے کسی طور
خوش ہوں کہ مرا کام دوا سے نہیں نکلا

خلقت پہ ترس کھا کے بھی چھوڑی ہے یہ بستی
میں ورنہ کسی خوفِ خدا سے نہیں نکلا

تصویرِ تماشا کہ الگ سے نہیں چمکی
مہتابِ محبت کہ خدا سے نہیں نکلا

کافی تھا بہت میرے خس و خار کی خاطر
شعلہ جو مری طرزِ ادا سے نہیں نکلا

دل میں جو، ظفر، بند کیا تھا کبھی خود کو
میں آج تک اس غارِ حرا سے نہیں نکلا

☆

سربسر محسوس اپنی ہی کمی ہونے لگی ہے
اس سے پہلے تو نہ تھی لیکن ابھی ہونے لگی ہے

زندگی کے گھُپ اندھیرے میں کہیں پر تھوڑی تھوڑی
اُس کے ہونٹوں کی چمک سے روشنی ہونے لگی ہے

رفتہ رفتہ اجنبیت کا لبادہ تو اُتارا
دُشمنی کرنے لگا ہے ، دوستی ہونے لگی ہے

رنگ لانے تو لگی ہیں پھر مساعیِ محبت
اور ، حاصل پھر وُہی لاحاصلی ہونے لگی ہے

اب وہ دکھلاتا نہیں اچھے دِنوں کے خواب مجھ کو
صُورتِ حالات میں کچھ بہتری ہونے لگی ہے

عُمر کے آخر میں جینے کی ہوس نے مار ڈالا
دِل ہُوا ہے جب سے غائب دِل لگی ہونے لگی ہے

چار سُو چیزوں کے بارے فِکرمندی سی دِلوں میں
اس سے پہلے جو نہیں تھی ، اب وُہی ہونے لگی ہے

اِک نمی سی جمع ہونے لگ گئی آنکھوں میں آ کر
یہ زمیں کچھ موسموں سے بھُربھُری ہونے لگی ہے

حق پرستی سے ، ظفرؔ ، دامن چھُڑوایا ، اور ، جب سے
جھُوٹ سچ باہم ہوئے ہیں ، شاعری ہونے لگی ہے

-☆-

کُلفت ہوا نہ کسی آئنے کو مِلتا ہے
جو عکس آب یہاں رِستے کو مِلتا ہے

وُجُود وقت کو رکھتا ہے منجمد یکسر
وہ لُطفِ خام جو اک تابیے کو مِلتا ہے

بکس اہتمام سے تکتی ہے خواب کو خواہش
بکس اشتیاق سے جلا ہرے کو مِلتا ہے

کسی طلب کی تہیں ٹوٹتی ہیں خاک بہ خاک
کسی یقیں کا گُماں واہمے کو مِلتا ہے

ضرُور غور کریں گے ہوائے ہستی پہ
ذرا بھی وقت اگر سوچنے کو مِلتا ہے

اب اُس کے جھُوٹ کے جھُرمٹ سے پھُوٹتا ہے کہیں
جو اِعتبار ہمارے کہے کو مِلتا ہے

لطیفہ یہ ہے کہ لِکھا مرے مُقدّر کا
مرے بجائے کسی دُوسرے کو مِلتا ہے

دِکھائی دیتا ہے بازار میں کوئی گاہک
نہ رہ نورد کِسی راستے کو مِلتا ہے

وہ چُومنے کے لیے دستیاب کیا ہو ، ظفرؔ
یہی بہُت ہے اگر دیکھنے کو مِلتا ہے

-☆-

رُکا ہوا ہوں کہ آگے کہیں رواں ہوں میں
کبھی یہ وقت ہی بتلائے گا کہاں ہوں میں

مری تلاش میں دُنیا ہے ، اور ، میں خود بھی
وہاں بھی ہو نہیں سکتا ہوں اب جہاں ہوں میں

کوئی کہاں مرا اندازہ کر سکے ، کہ ابھی
کبھی زمیں ہوں ، کسی وقت آسماں ہوں میں

جو فکرمند ہیں ارزاں ہوں یا گراں ہوں بہت
انھیں خبر ہی نہیں ہے کہ رائگاں ہوں میں

ابھی تو میں ہوں اِسی شک و شبہ میں شامل
ابھی یہ خود بھی نہیں کہہ رہا کہ ہاں ہوں میں

ہے معجزہ مرا ہونا ہی اس زمانے میں
ہے میری اپنی بھی ہمت اگر یہاں ہوں میں

کبھی جو تھے وہ کنارے بھی مجھ میں ڈُوب چکے
یہی سبب ہے بظاہر جو بے کراں ہوں میں

جو کارواں میں کہیں پر نظر نہیں آتا
تو اس لیے کہ فقط خوابِ کارواں ہوں میں

ہوں ایک سُلجھی ہوئی زُلف کا اسیر ، ظفرؔ
تو ایک اُلجھی ہوئی بات کا بیاں ہوں میں

☆

سُننے کے لیے ہوں نہ سُنانے کے لیے ہوں
شاید میں کسی اور زمانے کے لیے ہوں

میں تو یہی سمجھا ہوں کہ اس دُھند میں تنہا
یہ بار تماشا ہی اُٹھانے کے لیے ہوں

اس خطۂ خاموش میں کیا ہے مرا مصرف
خود شور ہوں ، یا شور مچانے کے لیے ہوں

میں آنکھ لڑانے کے لیے تھا سرِ محفل
یہ حال ہے اب ، آنکھ چُرانے کے لیے ہوں

کرنا ہے مجھے اک نئی تحریر کا آغاز
لکھا ہوا جو بھی ہے ، مٹانے کے لیے ہوں

اس آب و ہوا میں کسی چُپ چاپ زمیں پر
آواز کا اِک پھول کھلانے کے لیے ہوں

دیکھو تو کبھی سو نہ سکو دیکھ کے اُس کو
ایسا ہی کوئی خواب دکھانے کے لیے ہوں

آندھی بھی شب و روز بُجھاتی ہے بہت رنگ
کچھ میں بھی یہاں گرد اُڑانے کے لیے ہوں

پہنچوں گا تو دیکھوں گا ، ظفرؔ ، کیا ہے مرا کام
میں تو ابھی اس عہد میں آنے کے لیے ہوں

☆

لگ رہا ہے یہ محبت کا تماشا کیا کیا
بات کچھ بھی نہیں، اور، شور ہے برپا کیا کیا

دم بخود رہتے ہیں خاموش کنارے دن رات
غل مچاتا ہے اُچھلتا ہوا دریا کیا کیا

وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا اُس وقت
اسی دوران میں مَیں نے اُسے دیکھا کیا کیا

ناخنِ پا سے سرِ زُلف تک اُس شب مَیں نے
پُوچھ کر اُس سے، یہ مت پُوچھیے، چُوما کیا کیا

ڈوبتا تھا جب اندھیرے میں سفینہ اُس رات
جھلملاتا تھا بہت دُور ستارہ کیا کیا

یہ جو اس وقت خرابہ سا نظر آتا ہے
موسمِ خواب پسِ خاک پہ اُترا کیا کیا

رُک گیا کچھ تو ہمارے ہی سبب سے یہ فساد
ہم نہ ہوتے تو یہاں اور بھی ہوتا کیا کیا

اک ہوا سی اگر اس کو نہ اُڑا لے جاتی
تو اسی دشت پہ یہ ابر برستا کیا کیا

تھی تو معمول کی وہ ایک مُلاقات، ظفر
اُس سے تبدیل ہُوئی ہے مری دُنیا کیا کیا

☆

آر میں آئی ہے، پار میں آئی ہے
پھر قیامت نمودار میں آئی ہے

ایک دھوپ اور اُترنے لگی شہر پر
اک ہوا اور گُلزار میں آئی ہے

بند ہونے کے آثار ہیں سر بسر
یہ جو گرمی سی بازار میں آئی ہے

واقعہ وہ ہُوا ہی نہیں ہے ابھی
جس کی تفصیل اخبار میں آئی ہے

ایک تمثیل میرے نہ ہونے کی پھر
میرے ہونے کے آثار میں آئی ہے

اک رُکاوٹ جو پیدا روانی میں تھی
کچھ سہولت سی دُشوار میں آئی ہے

ایک طاقت مرے اپنے اندر کہیں
آئی بھی ہے تو ناچار میں آئی ہے

خشتِ اوّل جو ٹیڑھی رکھی تھی کبھی
شان کیسی یہ دیوار میں آئی ہے

مَیں نے کہنی تھی کچھ اور، لیکن، ظفر
بات کچھ اور اظہار میں آئی ہے

☆

غلط بھی ہونے سے انکار تو نہیں کرتا
میں اپنی بات پہ اصرار تو نہیں کرتا

ہیں میری اپنی حدوں تک یہ میرے عیب و ثواب
میں دوسروں کو گنہگار تو نہیں کرتا

مرے خلاف ہی بولے مگر، کہے کچھ تو
میں اس کو اپنا طرف دار تو نہیں کرتا

ہوں آخر اپنے سیاہ و سفید کا مالک
یہ رنگ بازیاں ناچار تو نہیں کرتا

یہ خود ہیں آ کے بسیرا کیے ہوئے مجھ میں
میں طائروں کو گرفتار تو نہیں کرتا

میں پوچھتا ہوں جو آنکھوں کو بند کر کے اُسے
حریص تو نہیں، دیدار تو نہیں کرتا

اگر وہ بوجھ بٹاتا مرا محبت میں
میں اپنے سر پہ یہ انبار تو نہیں کرتا

ٹھہر کے اس نے کہیں اور اگر سنی ہوتی
یہ عرض میں سرِ بازار تو نہیں کرتا

یہ کیا کہ اہلِ دکاں پر ہی مر مٹے ہو، ظفر
تجھے اس طرح سے خریدار تو نہیں کرتا

☆

میرے شش جہات کی ہا و ہُو کے علاوہ ہے
یہ جو شور ہے تری آرزو کے علاوہ ہے

وہ جہاں ہے اُس نے کہاں چھپا کے رکھا ہوا
جو ہمارے آپ کے رنگ و بُو کے علاوہ ہے

کوئی زاویہ ہے تمام زاویوں سے الگ
کوئی اک طرف کہیں سُو بہ سُو کے علاوہ ہے

مجھے اب بھی اُس کی تلاش ہے جو کہیں نہیں
جو بلا ہے مجھ کو وہ جستجو کے علاوہ ہے

یہ طلسم خانۂ خواب ہے کہ ہے اور کچھ
یہاں جو بھی کوئی ہے رُوبرُو کے علاوہ ہے

کوئی دشمنی کسی دوستی میں چھپی ہوئی
کہ عدو بھی ہے تو یہاں عدو کے علاوہ ہے

کوئی اور طرح کی جوڑ جمع ہے اُس طرف
کہ وہاں تو کام ہی سب رفو کے علاوہ ہے

کسی نام پر کسی اور نقش کا ہے گماں
کوئی شکل اور بھی ہو بہ ہو کے علاوہ ہے

کوئی ایک بات کچھ اس طرح کی بھی ہے، ظفر
جو کسی بھی سطح کی گفتگو کے علاوہ ہے

☆

کچھ دنوں سے میری ہر جانب جو حیرانی سی ہے
یہ محبت بھی نہیں ہے، بس پریشانی سی ہے

ہم اگر اُس سے نہ ملتے ہی تو اچھا تھا بہت
دل کے اندر یہ خوشی ہے یا پشیمانی سی ہے

اپنا دریا بہتا رہتا ہے سکوں سے رات دن
لیکن، اس میں بھی کہیں اک لہر طوفانی سی ہے

یوں تو مجھ میں ہر طرف اک ریت ہے پھیلی ہوئی
دور سے دیکھو تو ساری ہی چمک پانی سی ہے

اپنی قیمت ہم نے لگوائی تو یہ ظاہر ہوا
اس گرانی میں بھی کچھ چیزوں کی ارزانی سی ہے

حُسن اُس کا ہے حساب و حد سے باہر آج کل
کچھ تو ہے اس شہر میں جس کی فراوانی سی ہے

یہ جو دشواری مجھے درپیش ہے شام و سحر
دیکھیے تو یہ بھی مجھ کو ایک آسانی سی ہے

بے یقینی کے بھنور میں ہے مری سعیِ سخن
کچھ اگر ہے بھی تو اس میں بات امکانی سی ہے

کوئی دانائی برآمد کر سکوں اس سے، ظفر
یہ جو میرے دل کے اندر ایک نادانی سی ہے

☆

کبھی کسی کا ہماری کتاب میں ہونا
کہیں پہ اپنا کسی کے حساب میں ہونا

ہوں ایک اپنے لہو سے بھری صراحی سی
اسی سے ہے مرا شغلِ شراب میں ہونا

بہت زیادہ ضروری ہے مچھلیوں کی طرح
یہ رات دن مری آنکھوں کا آب میں ہونا

یہ ہو بھی سکتا ہے، لیکن ابھی نہیں ممکن
کبھی کبھار مرا اُس کے خواب میں ہونا

یہ خیمہ گر نہ پڑے ایک دن کہ چاہیے ہے
کوئی تو زور بدن کی طناب میں ہونا

کہاں تک اور ٹھہرتی یہ جاں مرے اندر
کہ تھا ہی یہ تو ہوا کا حباب میں ہونا

میں اپنے آپ پہ ظاہر نہیں ہوا اب تک
ابھی ہے میرا مقدر حجاب میں ہونا

تنازعات کی تصویر بن چکا ہوں کوئی
وہی ہے میرا سوال و جواب میں ہونا

وہ چاند مجھ میں چمکتا ہے رات بھر جو، ظفر
تو کیوں نہ ہو یہ مرا پیچ و تاب میں ہونا

☆

کرتے تو ہیں سبھی وہ حماقت جو ہم نے کی
تھی اور ہی طرح کی محبت جو ہم نے کی

اُس میں کچھ اقتدار تھا کوئی نہ اختیار
اک دُوسرے کے دل پہ حکومت جو ہم نے کی

بنیاد ہی نہیں تھی کوئی اُس کو دستیاب
تعمیر اپنے طور عمارت جو ہم نے کی

تھی وہ بھی دُور دُور ہی رہنے کے واسطے
پیدا کسی طرح کی بھی قُربت جو ہم نے کی

سارا خُدا پہ چھوڑ دیا تھا مُعاملہ
ضائع ہی سب چلی گئی محنت جو ہم نے کی

تھی وہ بھی اک طرح کی توجّہ ہی اصل میں
آپس میں روز روز کی غفلت جو ہم نے کی

دیکھا تو فاصلے ہی بہُت درمیاں میں تھے
تھوڑا قریب ہونے کی نیت جو ہم نے کی

یُوں مسئلہ تو اور زیادہ اُلجھ گیا
تھوڑی سی اُس کے پاس وضاحت جو ہم نے کی

گھر سے بھی اُس کے ایسے ہی لوٹ آئے ہیں، ظفر
برعکس اپنی وضع کے زحمت جو ہم نے کی

-☆-

کچھ اُس نے سوچا تو تھا، مگر کام کر دیا تھا
جو میرے خوابوں کو اتنے رنگوں سے بھر دیا تھا

غبار میں بھیگ سی گئی تھی فضا، کسی نے
رُکی ہُوئی رات کو وہ رنگِ سحر دیا تھا

اسی کے اندر تھی ساری پیچیدگی کہ اُس نے
کہاں کھڑا تھا میں، اور، اشارہ کدھر دیا تھا

چلو، اس اثنا میں میری آنکھیں تو کھل گئی ہیں
کبھی جو اُس نے مجھے فریبِ نظر دیا تھا

کسی بھی دن بیٹھ کر یہ دُنیا حساب کر لے
کہ مُجھ سے کتنا لیا ہے اور کس قدر دیا تھا

میں کر سکوں سب کے سامنے اپنی عیب جُوئی
یہ دینے والے نے خاص مُجھ کو ہُنر دیا تھا

اسی میں تھا ڈوبنا اُبھرنا مرا مقدّر
لہُو کے اندر مُجھے اک ایسا بھنور دیا تھا

جو دھوپ کی آگ اُس نے برسائی تھی زمیں پر
تو چھاؤں میں بیٹھنے کی خاطر شجر دیا تھا

یہ اُس کی مرضی کہ لے لیا ہے اُسی نے واپس
ظفر، مری شاعری کو جس نے اثر دیا تھا

-☆-

آنکھوں کو آنسوؤں پہ جمانے سے آئے گا
جو عکس اُس کے آئنہ خانے سے آئے گا

پگھلے گی برف خواب نشیبوں سے دُور دُور
پانی بھی آئے گا تو بہانے سے آئے گا

مَیں آج اگر بلند کروں نعرۂ سخن
آوازہ ایک اور زمانے سے آئے گا

نایاب تو نہیں ہے سکونِ دلِ خراب
رونے سے آئے گا کبھی گانے سے آئے گا

وہ آئے گا تو خود ہی چلا آئے گا کبھی
خواہش پہ آئے گا نہ بُلانے سے آئے گا

کوشش یہ ہے جُدا ہو مُلاقات سربسر
موقع کچھ اِس طرح کا بنانے سے آئے گا

آگے تو کچھ بڑھے گی کسی زاویے سے بات
اک حوصلہ تو ہاتھ لگانے سے آئے گا

پوشیدہ ہیں اِسی میں کئی طرح کی دُھنیں
یہ سازِ دل ہے ، اور ، بجانے سے آئے گا

اِک اِنقلاب ساتھ ہی لایا تھا مَیں ، ظفرؔ
ایک اِنقلاب اب مرے جانے سے آئے گا

-☆-

کرتا ہُوں سفر راہگزاروں سے بہُت دُور
چڑھتا ہُوا دریا ہُوں کناروں سے بہُت دُور

سب جانتا بھی ، اور ، سمجھتا بھی ہے ، لیکن
رہتا ہے ابھی میرے اشاروں سے بہُت دُور

کچھ فاصلے ویسے بھی تھے آپس میں زیادہ
کچھ خواب تمھارے تھے ہماروں سے بہُت دُور

یُوں اُس نے سبھی جمع کیے ایک جگہ پر
اور ، پھینک دیا ہے مجھے ساروں سے بہُت دُور

موسم ہے کوئی اور ہی چھایا ہُوا مجھ میں
پت جھڑ سے الگ ، اور ، بہاروں سے بہُت دُور

تنہا کوئی طوفان بپا کرتا ہے مجھ کو
رہتا ہُوں تبھی اپنے ہی دھاروں سے بہُت دُور

جاری ہے جہاں میرے پہنچنے کی تگ و تاز
ایک اور ہی منظر ہے نظاروں سے بہُت دُور

درکار ہے مجھ کو کوئی دیوار ، کوئی دوست
مَیں رہ نہیں سکتا ہُوں سہاروں سے بہُت دُور

گردش ہے ، ظفرؔ ، سب کی اِسی ایک خلا میں
اور ، اپنے ستارے ہیں ستاروں سے بہُت دُور

-☆-

آوارۂ سفر ہُوں ٹھکانا کہیں نہیں
مَیں اس کے باوُجود روانہ کہیں نہیں

اچھا ہے ، بیٹھ جائے بالآخر کسی طرف
اب مَیں نے یہ غبار اُڑانا کہیں نہیں

وہ شام ہو کہ شیر ، مرے سامنے جو آئے
اس بار مَیں نے خُود کو بچانا کہیں نہیں

پیچھے ہی رہ گیا ہے کہ آگے نکل گیا
اب صِرف مَیں ہُوں ، میرا زمانہ کہیں نہیں

اُس کی تلاش رکھنی ہے جاری یہاں وہاں
وہ مِل بھی جائے تو اُسے پانا کہیں نہیں

اِنکار دُوسروں کی حقیقت سے ہو جسے
دُنیا میں اُس کا اپنا فسانہ کہیں نہیں

خُود سے چھپا کے رکھنا ہے یُوں ہی ابھی اُسے
پردہ یہ درمیاں سے ہٹانا کہیں نہیں

دُنیا ہے جس طرح کی بھی ، منظور ہے مُجھے
ڈھانا نہیں ہے کُچھ بھی ، بنانا کہیں نہیں

کرتا ہُوں سیر اپنے ہی آثار کی ، ظفرؔ
آنا کہیں نہیں مرا جانا کہیں نہیں

-☆-

کہتے رہو ، باتوں میں اثر کُچھ نہیں آتا
دیکھو گے بہت اُس کو ، نظر کچھ نہیں آتا

ہر خواب میں وہ چاند ، وہ سُورج ، وہ ستارے
آتے نظر آئیں گے ، مگر ، کُچھ نہیں آتا

یہ دُھوپ تو دورانِ سفر یُوں ہی رہے گی
وہ سِلسِلۂ شاخ و شجر کُچھ نہیں آتا

اِتنا بحفاظت نہ رکھو شیشۂ دِل کو
یہ ٹُوٹ بھی جائے تو ضرر کُچھ نہیں آتا

آتا ہے تو آئے گا پسِ در ہی کبھی کُچھ
رہنے دو ، سرِ راہگُزر کُچھ نہیں آتا

پہلے ہی کب آتی ہے کوئی چیز وہاں سے
اپنے لیے اِس بار اگر کُچھ نہیں آتا

ڈرنا بہت اچھا ہے مگر یہ بھی ہے معلوم
یُوں کام ہمارے تو یہ ڈر کُچھ نہیں آتا

یہ رات یُونہی چھائی رہے گی مرے دل پہ
اور ، اِس میں کبھی رنگِ سحر کُچھ نہیں آتا

پلّے سے ظفرؔ ، باندھ کے رکھنا یہ مری بات
بے عیب رہو گے تو ہُنر کُچھ نہیں آتا

-☆-

اپنی جو اُس کے ساتھ عداوت ہی رہ گئی
سمجھو تو اک طرح سے محبت ہی رہ گئی

اک خواب کے بجائے بچا ہے خیال سا
اُس شکل کی جگہ یہ شباہت ہی رہ گئی

اپنی تو ہم صفائی ہی دیتے رہے اُسے
کچھ اُس کے پاس اپنی وضاحت ہی رہ گئی

اہلِ ہوس بالآخر اُڑا لے گئے اُسے
اور، اپنے پاس اُس کی عقیدت ہی رہ گئی

باقی نہیں وہ کارِ محبت کا زور شور
مصروفیت کے بدلے فراغت ہی رہ گئی

بازار میں لگے ہیں خریدار جب مرے
میں خود کہیں نہ تھا، مری قیمت ہی رہ گئی

دریا نے دُور سے ہی کہیں رُخ بدل لیا
لوگوں کو ڈوب مرنے کی حسرت ہی رہ گئی

اچھا ہُوا کہ اُس نے توجّہ نہ کی اِدھر
اُس بزمِ ناز میں مری عزت ہی رہ گئی

اب شاعری تو قصۂ ماضی ہُوئی، ظفرؔ
لے دے کے اپنے ہاتھ یہ شہرت ہی رہ گئی

☆

کیا اُتر آئے سارے مرے ہر طرف
ناچتے ہیں ستارے مرے ہر طرف

کیا نکل پاؤں گا ان سے میں، یہ جو ہیں
دائرے سے تمھارے مرے ہر طرف

میں کوئی راکھ کا ڈھیر تھا وسط میں
اُڑ رہے تھے شرارے مرے ہر طرف

وہ کسی اور سے کر رہا تھا سخن
بن رہے تھے نظارے مرے ہر طرف

خود جو آنا نہیں تھا تو اُس نے وہاں
راستے کیوں گزارے مرے ہر طرف

آ گیا اور اُس نے کسی حُسن کے
قافلے سے اُتارے مرے ہر طرف

مجھ کو سونے نہیں دے رہے تھے وہاں
جلتے بجھتے اشارے مرے ہر طرف

جیسے باہر ہی باہر چھلک جاؤں گا
ٹوٹتے ہیں کنارے مرے ہر طرف

میں وہی رہ گیا، اور، اُس نے ظفرؔ
نقش کیا کیا نکھارے مرے ہر طرف

☆

تسلیم بھی کیا اُسے ، بیعت بھی ہم نے کی
پھر، اُس کے ہی خلاف بغاوت بھی ہم نے کی

کچھ بھی نہ تھا ہمارے لیے اُس کے پاس اگر
اس بے مروّتی پہ قناعت بھی ہم نے کی

تھا شہر اُس کی آنکھوں کے اندر بسا ہُوا
جلدی ہی اُس دیار سے ہجرت بھی ہم نے کی

انداز تھا کچھ اُس کی محبت کا مختلف
اپنے مسائل اور تھے، عُجلت بھی ہم نے کی

موسم پہ گفتگو کی ذہانت کے باوُجود
اظہارِ آرزو کی حماقت بھی ہم نے کی

یُوں اُس کا احترام بھی ہم کو رہا بہت
تھوڑی سی اُس کے ساتھ شرارت بھی ہم نے کی

حق پر نہیں تھے دوست ہمارے جہاں جہاں
ناچار دُشمنوں کی حمایت بھی ہم نے کی

لا لا کے دل میں جمع کیے رنج و غم تمام
پھر ان امانتوں میں خیانت بھی ہم نے کی

نفرت کے دائرے سے بھی نکلے نہیں ، ظفر
مجبور ہو کے اُس سے محبت بھی ہم نے کی

☆

گھر بھی مطلوب ہے، آنگن بھی مجھے چاہیے ہے
اور ، ہوا کے لیے دامن بھی مجھے چاہیے ہے

دل پہ موجود ہے اک پیرہنِ خستہ ، مگر
اک ترے حُسن کی اُترن بھی مجھے چاہیے ہے

میرے نُسخے میں ہے شامل ترے رُخسار کا سیب
اور ، یہ ہونٹ کا جامن بھی مجھے چاہیے ہے

ایک دو پھول تو فی الحال کریں ارزانی
لازمی طور پہ گلشن بھی مجھے چاہیے ہے

کبھی اُس چہرے کو ان ہاتھوں سے پیالہ ہی کروں
پیاس بھی لگتی ہے ، برتن بھی مجھے چاہیے ہے

مَیں سفر مانگ رہا ہُوں کوئی محفوظ ، مگر
راستے میں کوئی رہزن بھی مجھے چاہیے ہے

وحشت میں صورتِ ایجاد اگر ہوں تو کہیں
شاخِ دریا پہ نشیمن بھی مجھے چاہیے ہے

ایک یکسُوئی بھی درکار ہے مجھ کو ہمہ وقت
مُستقل ہی کوئی اُلجھن بھی مجھے چاہیے ہے

مَیں جو خُود کو نہ جلاؤں تو کروں کیا کہ ، ظفر
آگ کے واسطے ایندھن بھی مجھے چاہیے ہے

☆

سفر کا اپنے بہانہ ہی اور ہوتا ہے
یہ قافلہ تو روانہ ہی اور ہوتا ہے

بھرے جہاں سے الگ ہے مدار بھی اپنا
ہمارے ساتھ زمانہ ہی اور ہوتا ہے

اُمید رکھتے ہیں اُس چشمِ ناز سے، جس کا
خطا بھی ہو تو نشانہ ہی اور ہوتا ہے

کبھی سنو تو ہم ایسے ہواپرستوں کا
ترنّم اور، ترانہ ہی اور ہوتا ہے

ہمیشہ رہتا کسی کے لہو کی گردش میں
ہمارا ٹھورٹھکانا ہی اور ہوتا ہے

جہاں وہ زُلف بکھرتی ہے آج کل جا کر
وہ شام، اور، وہ شانہ ہی اور ہوتا ہے

پڑے پڑے ہی بدلتا ہے منظرِ معنی
بیاں نہ ہو تو فسانہ ہی اور ہوتا ہے

فغاں بھی کرتے ہیں، آواز بھی نہیں ہوتی
کہ اپنا شورِ شبانہ ہی اور ہوتا ہے

وفا ہے گھر سے بھی لازم، مگر، دلوں میں، ظفرؔ
محبتوں کا تو خانہ ہی اور ہوتا ہے

☆

کوئی اُس کی خبر نہیں آتی
اب وہ صورت نظر نہیں آتی

آخری بات کہہ سکیں اُس سے
اس کی نوبت، مگر، نہیں آتی

سامنے اُس کے ہو نہیں سکتا
اور، کوئی بات کر نہیں آتی

عمر کے عرصۂ دراز میں وہ
مُہلتِ مختصر نہیں آتی

ہم نے کرنی بھی ہے خوشامدِ حسن
جو ہمیں عمر بھر نہیں آتی

راستے آئیں گے سفر میں تمام
ایک وہ رہگزر نہیں آتی

کیا محبت پہ زور ہے اپنا
اُس کے دل میں اگر نہیں آتی

ہے بلا کون سی جو اپنے لیے
آسماں سے اُتر نہیں آتی

ہوں اک ایسی شبِ جدائی، ظفرؔ
کبھی جس کی سحر نہیں آتی

☆

تھوڑے تھوڑے ہی، سارے نہیں تھے
یہ بھی انداز تُمھارے نہیں تھے

ہو گئے ہو جو کسی کے، پھر کیا
تُم تو پہلے بھی ہمارے نہیں تھے

پیڑ تھے یُوں ہی پھلوں سے بوجھل
پھول شاخوں سے اُتارے نہیں تھے

یہی دیواریں تھیں اور، ان کے سوا
کہیں بھی اپنے سہارے نہیں تھے

ابھی آئی تھیں وہ راتیں ساری
دن ابھی تک وہ گُزارے نہیں تھے

یہ سمندر یہاں موجود نہ تھا
اور، فلک پہ یہ ستارے نہیں تھے

کشتیاں بھاگ رہی تھیں بے سمت
دُور و نزدیک کنارے نہیں تھے

یُوں تو پانی کی فراوانی تھی
میرے دریاؤں میں دھارے نہیں تھے

ابر کُھل کر نہ برستے تھے، ظفر
ایسے جل تھل کبھی کیارے نہیں تھے

-☆☆-

جہاں قیام ہے اُس کا، وہیں سے ہٹ کر ہے
کہ ہے زمیں پہ ہی، لیکن، زمیں سے ہٹ کر ہے

غُبارِ خواب ہے دونوں میں ایک سا، لیکن
وہ باغِ بوسہ بہشتِ بریں سے ہٹ کر ہے

ذرا سا اُس کی پرستش کا زاویہ ہے الگ
کہ داغِ سجدہ ہمارا جبیں سے ہٹ کر ہے

جہاں سے آگے نُقوشِ قدم نہیں اُس کے
یہاں تک آئے ہیں، اور، وہ یہیں سے ہٹ کر ہے

وہ فاصلہ بھی رکھے گا ابھی محبت میں
کہ ہم نشیں ہے، مگر، ہم نشیں سے ہٹ کر ہے

ہنوز راہِ سخن مل نہیں رہی ہم کو
اگرچہ اُس کی نہیں بھی نہیں سے ہٹ کر ہے

اب اس میں اور کسی کا قصور کیا ہے بھلا
مکان خُود ہی جو اپنے مکیں سے ہٹ کر ہے

نظر پڑی ہے کچھ اپنی بھی اس پہ دیر کے بعد
کہیں بجا ہے یہ دُنیا، کہیں سے ہٹ کر ہے

ظفر، محاذِ محبت سے اپنی پسپائی
کسی بھی قافلہ واپسیں سے ہٹ کر ہے

-☆☆-

برائے نام ہے یا سربسر محبت ہے
وہ مُنہ سے کیوں نہیں کہتا اگر محبت ہے

بظاہر اُس کو ہے پروا مری ، نہ اُس کی مجھے
یہ ہے تو کوئی بطرزِ دگر محبت ہے

کچھ اردگرد کی تو اطلاع کیا ہوتی
خود اپنے آپ سے بھی بے خبر محبت ہے

رواں تو رہتی ہے ، جاتی کہیں نہیں لیکن
کچھ اور طرح کی یہ رہگزر محبت ہے

سُراغ آپ لگاتا ہے ایک دن اُس نے
کہ آپ ہے وہ کدھر ، اور ، کدھر محبت ہے

اس آرزو میں تو مُشکل ہے سانس لینا بھی
اُسی قدر ہے دُھواں ، جس قدر محبت ہے

کریں گے اب گزر اوقات جس طرح ہو گی
طویل رات ہے ، اور ، مختصر محبت ہے

وہ ہم ہی اور طرف کو نکل گئے ، ورنہ
یہ دل تو ہے اُسی جانب جدھر محبت ہے

یہ اور بات کہ رہتے نہیں ہم اس میں ، ظفر
ازل سے ، ورنہ ، ہمارا تو گھر محبت ہے

☆

نفع ہے یا ضرر ہے ، یا کچھ اور
یہ دُکان ہنر ہے یا کچھ اور

یہ جلاتا بھی ہے بُجھاتا بھی
اپنے خس میں شرر ہے یا کچھ اور

میرے سینے میں کیا ہے دل کی جگہ
اور ، کاندھوں پہ سر ہے یا کچھ اور

یہ رُکاوٹ ہے کیا روانی میں
سامنے رہگزر ہے یا کچھ اور

وہ جو پہلے بھی ایک بار ہُوا
وُہی بارِ دگر ہے یا کچھ اور

میرے اندر جو بج رہی ہے ابھی
کوئی زنجیرِ در ہے یا کچھ اور

روتے روتے جو ہنسنے لگتا ہوں
ابھی اُس کا اثر ہے یا کچھ اور

میرے ہر سُو رواں دواں دن رات
خواب ہے یہ ، خبر ہے ، یا کچھ اور

آگے بڑھتا ہوں ، پیچھے ہٹتا ہوں
اے ظفر ! یہ سفر ہے یا کچھ اور

☆

خسارہ جانچنا ہے ، اور ، منافع دیکھنا ہے
حساب اب تک کا جو کچھ بھی ہے ، سارا دیکھنا ہے

محبت رنگ تھا چہرے پہ اُس کے ، دیکھتے تھے
وُہی باقی نہیں ہے اب تو اب کیا دیکھنا ہے

وہ خود زحمت اُٹھائے ، دُوسروں سے پوچھنا کیا
اگر عیب و ہنر اُس نے ہمارا دیکھنا ہے

محبت نے ہمیں اب تک بنایا ہے تماشا
اور ، اب ہم نے محبت کا تماشا دیکھنا ہے

بہت دیکھا ہے ، اور ، بے سُود ہی دیکھا ہے اُس کو
نہیں معلوم اُسے اب اور کتنا دیکھنا ہے

یہ کیسی دُھند ہے میرے اور اُس کے درمیاں میں
نظر آتا نہیں ہے وہ ، یہ کیسا دیکھنا ہے

کچھ اُس میں آ چکی ہو کوئی تبدیلی بھی شاید
سو ، اُس دیکھے ہُوئے کو اب دوبارہ دیکھنا ہے

مسائل کا ہمارے بھی کوئی اندازہ کرتا
کہ صحرا سوچنا ہے ، اور ، دریا دیکھنا ہے

ظفرؔ ، وہ سب کے ساتھ آیا ہے اتنی دیر کے بعد
اور ، اُس کو ہم نے تھوڑی دیر تنہا دیکھنا ہے

☆

اکثر تو یہ اُفتاد طبیعت نہیں پڑتی
پڑ جائے تو سہ جاؤں ، یہ ہمت نہیں پڑتی

رنگت ہی اُڑی رہتی ہے چہرے کی سراسر
اظہار محبت کی ضرورت نہیں پڑتی

لفظوں میں سُنائی نہیں دیتا ترا آہنگ
لوگوں میں دکھائی تری صُورت نہیں پڑتی

خُوش ہوں کہ بہت دیر سے ہوتی ہے مُلاقات
اچھا ہے کہ اِس کی مجھے عادت نہیں پڑتی

کِس روز رُلاتا نہیں مجھ کو مرا ہونا
کِس رات مُجھے اپنی مُصیبت نہیں پڑتی

خاموش جو رہتا تو کہیں بیچ ہی نکلتا
انکار نہ کرتا تو یہ آفت نہیں پڑتی

بے کار نہیں بیٹھتا ، کرتا ہوں بصد شوق
ہر کام کہ جس میں کوئی محنت نہیں پڑتی

رہ جاتی ہے کیوں بیچ میں تعمیر تماشا
دیوار اُٹھا لیتا ہوں ، اور ، چھت نہیں پڑتی

گرمی بھی ، ظفرؔ ، آئے گی بازارِ سخن میں
بیٹھا ہوں کہ جب تک مری قیمت نہیں پڑتی

☆

گھر میں ہو گا کوئی زخموں کے سوا اور چراغ
شام گہری ہوئی جاتی ہے ، جلا اور چراغ

ہم ہی دونوں کا گزارہ وہاں کیوں کر نہ ہوا
جہاں رہتے رہے مِل جُل کے ہوا ، اور ، چراغ

رات بھر باغ میں ہلچل تھی کوئی چاروں طرف
جلتے بجھتے ہی رہے پھول ، صبا ، اور ، چراغ

لہر پر ایک چراغ ، اور ، پھر اُس لہر کے بعد
ایک لہر اور تھی ، اُس لہر پہ تھا اور چراغ

ایک ہی رُخ پہ لرزتے رہے دونوں ، لیکن
جب رُکی موج ہوا کانپ گیا اور چراغ

ایک آواز کی آہٹ سی پھر آئی یک دم
اور ، دیوار تماشا سے گرا اور چراغ

پھر بھی چھایا رہا کیوں اتنا اندھیرا ہر سمت
دونوں روشن تھے یہاں ، میری صدا ، اور ، چراغ

یوں تو نادار بہت ہوں ، مگر ، اتنا بھی نہیں
ہیں ابھی تک میرے ہاتھوں میں دُعا ، اور ، چراغ

جل رہا ہے مرا دل بھی ، مری آنکھیں بھی ، ظفر
اس چکاچوند میں اب چاہیے کیا اور چراغ

☆

نکل نہیں پاؤں گا جہاں جا کے پھنس گیا ہوں
مَیں اپنے اندر کسی خرابے میں بس گیا ہوں

رہا ہوں آنکھوں میں خوابِ شبنم کی طرح سے مَیں
غرور کے سر سے مثالِ موجِ ہوس گیا ہوں

جہاں لگاتے ہیں لوگ آنکھوں سے ہاتھ میرے
وہیں ترے پانو چومنے کو ترس گیا ہوں

کہاں سے اُتری تھی شام وہ تیز دھوپ جیسی
وہ چھانو کیسی تھی جس میں آ کر جھلس گیا ہوں

مَیں سوچتا ہوں کہ وہ تو مُحسن نہیں تھا میرا
جسے مَیں لہرا کے پہلی فُرصت میں ڈس گیا ہوں

مرے کمالِ ہُنر کا ہے بوجھ میرے سر پر
مَیں اتنا اُبھرا نہیں ہوں جتنا کہ دھنس گیا ہوں

کبھی تو لگتی ہے رائیگاں ہی یہ سعی ساری
کہ ابر تھا ، اور ، پانیوں پر برس گیا ہوں

کیا نہ ہو بے شک اور کچھ اس جہاں میں آ کر
یہی بہت ہے مَیں کھُل کے خود پر تو ہنس گیا ہوں

ظفر ، مرا لمحہ لمحہ اُس کے حساب میں ہے
مَیں دائیں بائیں ہوا ہوں یا پیش و پس گیا ہوں

☆

محبت سے مُکر جانے کی گنجایش نہیں ہے
مجھے لگتا ہے، گھر جانے کی گنجایش نہیں ہے

یہ موجوں کا نظارا ہی غنیمت جانیے گا
سمندر میں اُتر جانے کی گنجایش نہیں ہے

لہو بن کے رگوں میں دوڑتی ہے خواہشِ وصل
کہیں اِس میں ٹھہر جانے کی گنجایش نہیں ہے

مجھے رکھتی ہے یکسو اک پریشانی شب و روز
ابھی مجھ میں بکھر جانے کی گنجایش نہیں ہے

پھنسا ہُوں کب سے ایسی بھیڑ میں آ کر، جہاں پر
ذرا سی بھی گزر جانے کی گنجایش نہیں ہے

اُدھر کو ہی گیا ہُوں اور، کافی دور تک بھی
اصولاً بھی جدھر جانے کی گنجایش نہیں ہے

مجھی پر ختم ہوتا ہے طریقِ خاص میرا
کہ اس کو عام کر جانے کی گنجایش نہیں ہے

نہیں ہے اور کوئی راستہ اِس کے علاوہ
مَیں جیتا ہُوں کہ مر جانے کی گنجایش نہیں ہے

ظفر، پیدا ہُوا اِتنا بگاڑ اندر ہی اندر
کہ اب اپنے سنور جانے کی گنجایش نہیں ہے

-☆-

دریا دُور نہیں، اور، پیاسا رہ سکتا ہُوں
اُس سے ملے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہُوں

اُس کی بےتوفیق محبت کے جنگل میں
آدھا گُم ہو کر بھی آدھا رہ سکتا ہُوں

کیسا رہتا ہُوں مت پُوچھو، شہر میں اُس کے
ویسا ہی رہتا ہُوں جیسا رہ سکتا ہُوں

تنہا رہنے میں بھی کوئی عذر نہیں ہے
لیکن، اُس کے ساتھ ہی تنہا رہ سکتا ہُوں

وہ بھی دامن چھوڑنے کو تیار نہیں ہے
مَیں بھی ابھی اُس شاخ سے اُلجھا رہ سکتا ہُوں

کُچھ مُجھ کو خود بھی اندازہ ہونا چاہیے
کِتنا ضائع ہو کر کِتنا رہ سکتا ہُوں

جس حالت سے نکل آیا ہُوں کوشش کر کے
اُس میں وہ چاہے تو دوبارہ رہ سکتا ہُوں

ایک انوکھے خواب کے اندر سوتے جاگتے
رہتا ہُوں مَیں، اور، ہمیشہ رہ سکتا ہُوں

جتنے فاصلے پر رکھتا ہے، ظفر، وہ مُجھ کو
رہ بھی سکتا ہُوں، لیکن، کیا رہ سکتا ہُوں

-☆-

صرف آنکھیں تھیں، ابھی اُن میں اشارے نہیں تھے
دل پہ موسم یہ محبت کے اُتارے نہیں تھے

جیسی راتوں میں سفر ہم نے کیا تھا آغاز
سر بہ سر سمتیں ہی سمتیں تھیں، ستارے نہیں تھے

اب تو ہر شخص کی خاطر ہُوئی مطلوب ہمیں
ہم کسی کے بھی نہیں تھے جو تمھارے نہیں تھے

جب ہمیں کوئی توقّع ہی نہیں تھی تُم سے
ایسے اُس وقت بھی حالات ہمارے نہیں تھے

مُہلتِ عُمر میں رہنے دیے اُس نے شامل
جو شب و روز کبھی ہم نے گزارے نہیں تھے

جب نظارے تھے تو آنکھوں کو نہیں تھی پروا
اب انہی آنکھوں نے چاہا تو نظارے نہیں تھے

ڈوب جانا ہی مقدّر تھا ہمارا کہ وہاں
جس طرف دیکھیے پانی تھا، کنارے نہیں تھے

کیوں نہیں عشق یہاں ہر کس و ناکس کا شعار
اس تجارت میں، اگر اتنے خسارے نہیں تھے

ٹھیک ہے، کوئی مدد کو نہیں پہنچا، لیکن
یہ بھی سچ ہے کہ ظفر، ہم بھی پکارے نہیں تھے
-☆-

ویسے تو بھرے شہر میں کیا کیا نہیں چلتا
کچھ اُس کے بغیر اپنا گزارہ نہیں چلتا

دھوکا ہمیں اُس نے تو کئی بار دیا ہے
اُس پر ہی فریب اپنا دوبارہ نہیں چلتا

حق اپنا کوئی مان کے دے گا نہیں اُس پر
دُنیا کی عدالت میں یہ دعویٰ نہیں چلتا

خُود پر تو کبھی تھا ہی نہیں عشق میں قابُو
اُس پر بھی کوئی زور ہمارا نہیں چلتا

کیوں سامنے آ جاتی ہے ماضی کی محبت
یہ وقت کا چکّر اگر اُلٹا نہیں چلتا

پڑتی ہے بہت دُور کہیں منزلِ موہُوم
آگے کی طرف خواب تماشا نہیں چلتا

ہو جاتا ہے صحرا بھی روانہ کسی لمحے
رُکنے پہ جو آ جائے تو دریا نہیں چلتا

میں بھی تو زمانے سے الگ ہو کے چلا ہوں
کیا ہے جو مرے ساتھ زمانہ نہیں چلتا

کچھ نہ، ظفر، معنی و مضموں کا تردّد
بازار میں اب اور یہ سکّہ نہیں چلتا
-☆-

دھند میں دھوپ سی کھڑکیوں سے نکل آئی ہے
کوئی کونپل پرانی جڑوں سے نکل آئی ہے

چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے ہر اک شے یہاں
ایسے جیسے زمیں گردشوں سے نکل آئی ہے

یہ سفر تھا کہ خوابِ سفر، جو بھی تھا، خوب تھا
میری منزل انہی راستوں سے نکل آئی ہے

تیرے دریا میں شاید کوئی لہر ایسی بھی تھی
جو اُچھل کر ترے ساحلوں سے نکل آئی ہے

جونہی باہر اندھیرا بہت زور کرنے لگا
روشنی سب نے دیکھا، گھروں سے نکل آئی ہے

میں تو سمجھا تھا اس کی محبت ملی ہے تو اب
زندگی درد کے دائروں سے نکل آئی ہے

ایک دُوری بھی موجود تھی اس ملاقات میں
کوئی قُربت بھی ان فاصلوں سے نکل آئی ہے

تیز بارش کا طوفاں جو وادی میں داخل ہوا
شور کرتی ہوا جنگلوں سے نکل آئی ہے

ایک اُلجھن ہے ایسی کہ جس کی یہ دولت، ظفرؔ
یہ طبیعت کئی اُلجھنوں سے نکل آئی ہے

☆☆

جو سامنے نہیں، لگتا بھی تیرے سامنے ہے
تری نظر کا یہ دھوکا بھی تیرے سامنے ہے

اب انتخاب ہے تیرا، جسے بھی چاہے تُو
یہ دل ہے، اور، یہ دُنیا بھی تیرے سامنے ہے

اب اس میں تیرے ارادے کا دخل ہے سارا
کنارِ آب بھی، پیاسا بھی تیرے سامنے ہے

یہاں تو سامنے ہونا ہی کم نہیں، یعنی
قبول کر اسے، جیسا بھی تیرے سامنے ہے

کچھ اور بھی ہیں وہ پیچھے خموش بیٹھے ہوئے
لگا ہُوا یہ تماشا بھی تیرے سامنے ہے

چھپی ہوئی نہیں تجھ سے یہ دُھند، اور، یہ دُھوپ
یہ سب اندھیرا اُجالا بھی تیرے سامنے ہے

اگر سراب کو پانی سمجھ لیا جائے
یہ دشت ہی نہیں، دریا بھی تیرے سامنے ہے

تری نگاہ میں آئے گا پیش منظر کیا
کہ یہ تنا ہُوا پردہ بھی تیرے سامنے ہے

اگرچہ تجھ سے چھپا کر رکھا گیا ہے، ظفرؔ
سو، یہ بھی کم نہیں، جتنا بھی تیرے سامنے ہے

☆☆

جو کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں
وہی سب سے چھپانا چاہتا ہوں

نہیں کوئی تماشائی بھی، اور، میں
تماشا بھی دکھانا چاہتا ہوں

نئی دیوار اٹھائی ہے کہیں پر
کوئی پردہ ہٹانا چاہتا ہوں

بہت عزت ملی ہے، اور، اب میں
کوئی تہمت اٹھانا چاہتا ہوں

جو تجھ سے دور رہتا ہوں تو دراصل
ترے نزدیک آنا چاہتا ہوں

ہے اپنا امتحاں بھی مجھ کو درپیش
تجھے بھی آزمانا چاہتا ہوں

میں سارا خرچ ہو کر بھی کسی طور
محبت کو بچانا چاہتا ہوں

میں صحرا خاک اڑا بیٹھا ہوں، اور، اب
کوئی دریا بہانا چاہتا ہوں

ستارہ سا، ظفر، اس کے فلک پر
گھڑی بھر جھلملانا چاہتا ہوں

☆

ہم نے سامانِ سفر میں تری حسرت رکھ لی
خاک اس شہر کی بھی حسبِ ضرورت رکھ لی

اور خانوں میں تو نفرت ہی بھری تھی دل کے
ایک خالی تھا، سو، اس میں یہ محبت رکھ لی

راستہ اس نے دیا بھی، مگر، آگے نہ بڑھے
طاقِ نسیاں پہ کہیں اس کی اجازت رکھ لی

پانو چادر سے نکالے نہیں باہر ہم نے
اس کا صحرا اسے واپس کیا، وحشت رکھ لی

فرق باقی نہیں مجبوری و مختاری میں
زندگی چھوڑ کے مر جانے کی مہلت رکھ لی

اس تجارت سے ہمیں نفع ہے اب بھی، جس میں
مال اس نے نہ دیا، مال کی قیمت رکھ لی

میں ہی شائستۂ رسوائی جو ٹھہرا سرِ بزم
آخرِ کار خدا نے مری عزت رکھ لی

کوئی موقع تو خیانت کا ملے گا آخر
دل نے یہ سوچ لیا، اور، امانت رکھ لی

سخت ناخوش تھا، مگر، یہ بھی غنیمت ہے، ظفر
اس نے پڑھ کر مری تحریر شکایت رکھ لی

☆

رفتہ رفتہ کسی راکھ میں ڈھلتا رہتا ہے
دل سگرٹ کی طرح سُلگتا جلتا رہتا ہے

رستہ آپ نکالا اُس نے اندر کی جانب
پھر بھی باہر باہر کہیں ٹہلتا رہتا ہے

سب سے چھپ کر پانی، دُھوپ، ہوا سے بے پروا
دل کے پچھواڑے اک پودا پلتا رہتا ہے

آہٹ باہر ہوتی ہے دُوری، نزدیکی میں
اندر اندر کوئی خواب دہلتا رہتا ہے

رہ رہ کر تہ میں جیسے طوفان اُٹھتا ہے کوئی
پانی برتن سے باہر جو اُچھلتا رہتا ہے

کوشش کر کے آگ بُجھا تو دی میں نے، پھر بھی
کسی نہ کسی طرف سے دُھواں نکلتا رہتا ہے

اس سے زیادہ اچھے دن کیا ہوں گے اور بھلا
بُرا وقت آتا ہے، آ کر ٹلتا رہتا ہے

کبھی توجہ سے پیش آنا، کبھی تغافل سے
میرے لیے وہ روز لباس بدلتا رہتا ہے

وہ مزدوری ہو کہ محبت، اپنا کام، ظفر
رُکتا بھی رہتا ہے، لیکن، چلتا رہتا ہے

٭

اُسے خبر نہیں جو اتنا لاتعلق ہے
کہ یہ تو سب سے الگ اور جُدا تعلق ہے

جو دُور رہتے ہیں اس طرح اجنبی بن کر
بجائے خود ہی یہ اتنا بڑا تعلق ہے

تعلقات کا ہوتا ہے اپنا اپنا ہی رنگ
کہیں ہے زرد، کہیں پر ہرا تعلق ہے

کسی قدر اُسے محسوس کر تو سکتے ہیں
مگر، بتا نہیں سکتے ہیں کیا تعلق ہے

اسے بھی دیکھتے ہیں لوگ خاص نظروں سے
ہمارا اُس کا جو یہ عام سا تعلق ہے

ابھی تو اس کو تعلق بھی کہہ نہیں سکتے
یہ کچھ دنوں سے جو میرا ترا تعلق ہے

بکھر نہ جائیں یہ وابستگی کے خواب ابھی
کہیں قریب، کہیں دُور کا تعلق ہے

بظاہر ایک عداوت ہے اور کچھ بھی نہیں
جو سوچیے تو یہ اچھا بھلا تعلق ہے

بندھے ہیں دیر سے دونوں اسی کے ساتھ، ظفر
یہ درمیاں میں جو ٹوٹا ہوا تعلق ہے

٭

کھلتے ہیں جب آشفتہ بیانی کے معانی
میں ڈھونڈنے لگتا ہوں معانی کے معانی

آتی گئی انجام کے نزدیک تو آخر
ہوتے گئے معدوم کہانی کے معانی

جب تک کہ سمندر سے میں باہر نہیں نکلا
پوشیدہ ہی مجھ سے رہے پانی کے معانی

آدھا یہاں پہنچا ہوں تو باقی ہوں وہیں پر
ہیں اب کے یہی نقلِ مکانی کے معانی

افشا نہیں مجھ پر سفرِ خواب کا مطلب
روپوش رہے مجھ سے روانی کے معانی

یوں ہی تو یہ اُمید نہیں باندھی ہے اس پر
ہوں گے ہی کچھ اِس تازہ کہانی کے معانی

بازارِ محبت جو ہوا تیز تو ہم کو
کچھ کچھ سمجھ آئے ہیں گرانی کے معانی

اشعار سے ہٹ کر بھی سنو کچھ مری باتیں
لکھے سے زیادہ ہیں زبانی کے معانی

اسرار کئی ہیں، ظفر، اس نقش کے اندر
ہوتے ہیں بہت ایسی نشانی کے معانی

☆

کوئی گرا ہوا منظر سنبھل کے دیکھتا ہوں
اور، اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھتا ہوں

مرے وجود کے اندر کہیں پہ رات گئے
درخت سا کوئی اُکھڑا ہے، چل کے دیکھتا ہوں

نکل کے دیکھ لیا دشت سے بگولہ، تو اب
پہاڑ سے کوئی چشمہ اُبل کے دیکھتا ہوں

کہیں وجود ہے اُس کا نہ شکل ہی کوئی
میں سوچتا ہی نہیں اُس کو، بلکہ دیکھتا ہوں

یہ میری سعی سے ماحول تو نہیں بدلا
اب اپنے آپ کو ہی کچھ بدل کے دیکھتا ہوں

خیال و خواب کی صورت گری بہت کی ہے
اب آپ بھی کسی سانچے میں ڈھل کے دیکھتا ہوں

مجھے گذشتہ و موجود سے نہیں مطلب
کہ میں تو سارے مناظر ہی کل کے دیکھتا ہوں

پسند یہ بھی نہیں ہے مرے کناروں کو
کبھی کبھار جو باہر اُچھل کے دیکھتا ہوں

جلا ہوں، اور، وجود و عدم پہ شک ہے مجھے
میں اپنی راکھ، ظفر، مُنہ پہ مل کے دیکھتا ہوں

☆

یہ کیا طراوتِ دریا سے واپس آیا ہوں
کہ لگ رہا ہے میں صحرا سے واپس آیا ہوں

یہی سبب ہے جو کھلتیں نہیں مری آنکھیں
میں ایک خوابِ تماشا سے واپس آیا ہوں

کبھی تو اُس کی جھلک سے بھی میں رہا محروم
کبھی اُسی کے سراپا سے واپس آیا ہوں

ابھی اُداس رہوں گا میں اپنی دُنیا میں
نیا نیا تری دُنیا سے واپس آیا ہوں

میں اپنے ماضی و موجود کی محبت میں
فضائے فرصتِ فردا سے واپس آیا ہوں

یہاں پہ بھول گیا ہوں پھر اپنی چیز کوئی
اسی لیے تو دوبارہ سے واپس آیا ہوں

پلٹنے والوں میں تُو نے کیا نہیں جو شمار
یہی سمجھ کہ بقایا سے واپس آیا ہوں

اب اس کے فرشِ رضا پہ قیام ہے میرا
میں آسمانِ تمنا سے واپس آیا ہوں

غبارِ گُم شدگی کی طرف رواں ہوں، ظفر
کسی ہجومِ ہویدا سے واپس آیا ہوں

☆

جو خُوش ہو رہے تھے، خفا کر دیے ہیں
وہ کیا تھے، مگر، ہم نے کیا کر دیے ہیں

جُدا تھے اگر راستے میرے اُس کے
تو کچھ میں نے خُود بھی جُدا کر دیے ہیں

نہیں دل میں اب خواہشیں پھڑپھڑاتیں
وہ سارے پرندے رہا کر دیے ہیں

بالآخر بچا کر کسی سے دل و جاں
کہیں اور ہی مُبتلا کر دیے ہیں

ضرُوری نہیں اور رہنا یہاں پر
کہ قرض ہم نے ادا کر دیے ہیں

مسائل وُہی حل کرے گا ہمارے
کہ سارے سپُرد خُدا کر دیے ہیں

سمجھتے رہے ناروا جن کو اب تک
وہ سب کام ہم نے روا کر دیے ہیں

بری ہو گئے ہیں سب اقبالی مُلزم
جو مشکوک تھے وہ سزا کر دیے ہیں

ذرا فاصلے سے دکھا کر یہ منظر
ظفر، اور بھی خُوش نُما کر دیے ہیں

☆

جیسا بھی ہے احوال ، سُنانے کے نہیں ہم
ناراض نہ ہو ، تیرے زمانے کے نہیں ہم

درکار ہیں صدیاں ہی کہ ظاہر ہوں دوبارہ
جلدی بھی یہاں لوٹ کے آنے کے نہیں ہم

اُٹھے گی کہاں ہم سے یہاں منتِ احباب
اپنا بھی جہاں بوجھ اُٹھانے کے نہیں ہم

سُننا ہو جسے شوق سے اب بھی یہ زمانہ
کردار کسی ایسے فسانے کے نہیں ہم

جو یاد رہا ، اُس کو کبھی یاد نہ کر پائے
جو بھول چُکا اُس کو بھلانے کے نہیں ہم

ویسا ہی رکھا ہے یہ محبت کا بچھونا
کچھ اور ابھی اس کو بچھانے کے نہیں ہم

آ جائے تو گھر اُس کا یہ اپنا ہے بہرطور
اب خود تو بُلا کر اُسے لانے کے نہیں ہم

رہ جائے گا اک شور ہمارا جو یہاں پر
جا کر بھی یہاں سے کہیں جانے کے نہیں ہم

کی ہے بہُت آمیزشِ اشیا ، سو ، ظفر اب
کچھ اور کسی شے میں ملانے کے نہیں ہم

☆

نیا ہے یا پُرانا ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے
یہ ہے کیسا زمانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

مُسلسل ہی بھلا کیوں آ رہا ہے میرے درپیش
یہی آئینہ خانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

زمین و آسماں کے درمیاں ہے میری پرواز
کدھر ہے آشیانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

فسانہ ہے حقیقت ، یا کہیں اس کے علاوہ
حقیقت ہے فسانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

سفر کے سلسلے ہی سلسلے ہیں دور و نزدیک
کہیں ہے بھی ٹھکانا ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

میں سر تو ڈھونڈ لایا ہوں بڑی ہی مشکلوں سے
کہاں ہے آستانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

دوبارہ کیا کروں اپنے نہ ہونے کی وضاحت
بتاؤں کیا بہانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

قیام اپنا کدھر ہے آج کل ، ہیں بے خبر ہم
کوئی ہے آنا جانا ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

ظفر ، یہ عاجزی تھی آپ کی ، یا اس کے برعکس
روش تھی باغیانہ ، کچھ پتا چلتا نہیں ہے

☆

کوئی بتاؤ ، کہاں اور کدھر گزار چکا ہوں
میں اپنی عمرِ طبیعی اگر گزار چکا ہوں

اک ایسی رات ہے، چل پھر کے جو کسی کی گلی میں
میں مانتا تو نہیں ہوں ، مگر ، گزار چکا ہوں

جہاں نہیں تھا کہیں کوئی فرق رات سے دن کا
کچھ اس طرح کے بھی شام و سحر گزار چکا ہوں

کئی برس تو گزر ہی نہیں سکے کہیں مجھ سے
بہت ہی کم ہیں جنھیں سربسر گزار چکا ہوں

امید خاص ہو باہر کی سمت دیکھنے سے کیا
تمام عمر خرابی تو گھر گزار چکا ہوں

کہاں شریک اسے کرتا کہ سیلِ خوابِ جوانی
میں اپنے آپ سے بھی بے خبر گزار چکا ہوں

ہے ایک بے ہنری کی طویل شب مرے آگے
میں اپنے حصے کی شامِ ہنر گزار چکا ہوں

نئی سی لگتی ہے پھر بھی ، اگرچہ ایک زمانہ
پھٹی پرانی اسی خاک پر گزار چکا ہوں

غبار سا کوئی باقی ہوں اے ظفرؔ ، کہیں پیچھے
میں اپنا قافلہ مختصر گزار چکا ہوں

☆

جیسے ہو کسی دشت سے آہو کا نکلنا
ہے یاد مجھے پھول سے خوشبو کا نکلنا

آنچل کا ابھرنا وہ دھندلکے میں سرِ شام
اور ، سبزہ گہِ خواب سے گیسو کا نکلنا

تبدیل سا کر دیتا ہے موسم کو اچانک
بازار میں یک دم کسی خوش رو کا نکلنا

کونپل کا اچھلنا وہ کسی آنکھ سے ہر روز
ہر صبح کسی پیڑ سے آنسو کا نکلنا

طغیانی نوں سے مجھے اتنا ہی رہا یاد
چہرے کا جھلکنا ، کہیں بازو کا نکلنا

میری تو سمجھ میں ہی نہیں آئے گا شاید
اس دل کی سیہ رات میں جگنو کا نکلنا

چڑیوں کا بہت شور مچانا وہ یکایک
جنگل سے اسی لمحے وہ سادھو کا نکلنا

ہر بات پرانی بھی ہے، اور، یہ بھی ہے ممکن
ہر بات سے پھر اک نئے پہلو کا نکلنا

بے سمت مجھے کر کے بالآخر ، ظفرؔ ، اس دن
کیسا تھا مرے ہاتھ سے ہر سو کا نکلنا

☆

زمیں کم ہے تو جا کر آسماں پر چومنا ہے
جہاں وہ ہو نہیں سکتا وہاں پر چومنا ہے

خدا وہ وقت اگر لایا تو پہلے مرحلے میں
ہمیں معلوم ہے اُس کو کہاں پر چومنا ہے

جو ناممکن ہے وہ مُمکن بھی ہو سکتا ہے اک دن
کبھی اُس بے نشاں کے ہر نشاں پر چومنا ہے

ابھی کُچھ منکشف ہونا ہے پہلی بار ہم پر
ابھی ہم نے کسی نقشِ نہاں پر چومنا ہے

بھلے ہی یہ خیالِ خام ہو اپنا ابھی تک
مگر، اُس کو محبت کے گُماں پر چومنا ہے

کسی کی خامشی کی داد بھی دینی ہے جا کر
کسی کو اُس کے اندازِ بیاں پر چومنا ہے

حُباب آسا اگر یہ زندگانی ہے تو بروقت
کسی کے محرمِ آبِ رواں پر چومنا ہے

جھلک ہم کو نظر آتی ہے اس میں صاف اُس کی
ہمیں اپنے بھی رنگِ رائگاں پر چومنا ہے

ظفر، ہم نے ابھی غرقاب ہو جانے سے پہلے
کہیں اپنے دریدہ بادباں پر چومنا ہے

☆

یہ کشف سب کے لیے عام بھی نہیں ہوتا
اگرچہ شاعری الہام بھی نہیں ہوتا

اُترنے لگتے ہیں کیوں دل میں یہ دُھندلکے سے
یہاں تو سلسلۂ شام بھی نہیں ہوتا

مَیں جا نکلتا ہوں روزانہ اُس گلی میں، جہاں
کسی طرح کا مجھے کام بھی نہیں ہوتا

ہزار طرح کی تکلیف اگر نہ پہنچائے
کوئی کسی کا دل آرام بھی نہیں ہوتا

بچا ہُوں بے سروسامانِ آرزو ہو کر
نہیں ہے دانہ جہاں، دام بھی نہیں ہوتا

پڑا ہُوا ہُوں شب و روز اُسی کے پیچھے کیوں
جو کام مجھ سے سرانجام بھی نہیں ہوتا

ہے کامیاب تو ہونا بہت ہی دُور کی بات
کہ مَیں تو عشق میں ناکام بھی نہیں ہوتا

بغیر مصلحت آتی نہیں وضاحت بھی
بلاسبب کوئی الزام بھی نہیں ہوتا

کیا ہمیں نے یہ کارِ فضول جس میں، ظفر
سزا بھی کُچھ نہیں، انعام بھی نہیں ہوتا

☆

کسی طرح کا کوئی اہتمام بھی نہیں تھا
مقابلے میں ہمارا تو نام بھی نہیں تھا

ہم آ گئے تھے شمار و قطار میں کیوں کر
کچھ آپ سے تو سلام و پیام بھی نہیں تھا

ہم اُس کے گھر کا پتا پوچھنا بھی چاہتے تھے
اور، اُس کے ساتھ ہمیں کوئی کام بھی نہیں تھا

ہمیں یہ عزت رُسوائی کیوں ملی ہے یہاں
کہ شہر میں تو ہمارا قیام بھی نہیں تھا

خیالِ وضع ہمیں خود ہی چاہیے تھا وہاں
کہ عرضِ حال ہمارا مقام بھی نہیں تھا

بھٹکتا پھرتا رہا درمیاں میں ہی کہیں عشق
نہ تھا شروع، کہیں اختتام بھی نہیں تھا

بہت ہی دُور رہا آس پاس ہوتے ہُوئے
وہ حُسن زار جو ہم پر حرام بھی نہیں تھا

کہاں سے آئے تھے دریا وہ راہ میں اتنے
کہ فاصلہ تو وہاں ایک گام بھی نہیں تھا

مہک رہا تھا کوئی شام شام چہرہ، ظفر
کچھ اس طرح سے کہ دیدار عام بھی نہیں تھا

☆

پانا ہے کوئی چیز نہ کھونا کسی کے ساتھ
ہے اصل بات عشق میں ہونا کسی کے ساتھ

اوقاتِ کار کی ہے یہ تقسیم بھی عجب
سونا کسی کے ساتھ ہے، رونا کسی کے ساتھ

اک مشقِ رائیگاں ہی رہی، کیا بتایئے
پانی سا بار بار بلونا کسی کے ساتھ

ہنسنا وہ مل کے، اور، اُسی وقت، اُسی گھڑی
تکیہ سا خواہشوں کا بھگونا کسی کے ساتھ

اک نیند کے بہاؤ میں رہنا، اور، اُس کے بعد
اک ناؤ پانیوں میں ڈبونا کسی کے ساتھ

دیوار تکیہ بیچ میں کر لی گئی بلند
ہم نے بچھا دیا جو بچھونا کسی کے ساتھ

ہم بستری ہے اپنی ہمارے لیے بہت
مُدت سے جاگنا ہے نہ سونا کسی کے ساتھ

موجودگی سی جیسے کسی اور کی بھی ہو
منظر جو بن رہا ہے تکونا کسی کے ساتھ

سارا یہ کاروبار ملاوٹ کا ہے، ظفر
اک چیز دوسری میں سمونا کسی کے ساتھ

☆

ممکن ہے کہ وہ صاف اِشارہ بھی نہ سمجھے
سمجھائیں اُسے ، اور ، دوبارہ بھی نہ سمجھے

یہ شور تگ و تاز ہی اِتنا ہے کہ شاید
ایسے میں وہ پیغام ہمارا بھی نہ سمجھے

پانی نے خود اِنصاف کیا اپنا بہرطور
اور ، ہم تو کنارے کو کنارہ بھی نہ سمجھے

اپنے بھی معانی نہ کھلے ہم پہ کسی طور
مفہوم کوئی خاص تمھارا بھی نہ سمجھے

بس فائدہ ہی اُس نے ہر اک بات میں دیکھا
اور ، ہم تو خسارے کو خسارہ بھی نہ سمجھے

دروازہ تھا ، اور ، اُس سے نکل کر نہیں دیکھا
دیوار تھی ، اور ، اُس کو سہارا بھی نہ سمجھے

ہم دُور سے ہی دیکھ لیا کرتے ہیں اُس کو
اِتنا وہ ہمیں ہجر کا مارا بھی نہ سمجھے

منکر تو نہیں اُس کی محبت سے کسی طرح
ہم پر وہ ، مگر ، اپنا اجارہ بھی نہ سمجھے

پروانے ہیں جس شمعِ تماشا کے ، ظفر ، ہم
دُشمن بھی نہ جانے ہمیں ، پیارا بھی نہ سمجھے

-☆-

مواد جو بھی ہے سارا کہاں سے آتا ہے
اور ، اُس میں نام ہمارا کہاں سے آتا ہے

جو سب سے دُور خسِ خواب سا لرزتا ہوں
تو بیچ میں یہ شرارہ کہاں سے آتا ہے

میں بند آنکھوں سے کس طرح دیکھتا ہوں اُسے
نظر نہ ہو تو نظارا کہاں سے آتا ہے

حساب کر کے پریشان ہو گیا ہوں بہت
یہ منفعت میں خسارہ کہاں سے آتا ہے

نکال دیتا ہوں اُس کے خیال کو دل سے
پتا نہیں یہ دوبارہ کہاں سے آتا ہے

یہاں تو ڈوب کے مرنا بھی ہو گیا مشکل
خبر نہیں یہ کنارہ کہاں سے آتا ہے

جہاں کہیں کوئی دیوار تک نہیں ہوتی
وہاں وہاں بھی سہارا کہاں سے آتا ہے

زمیں پہ شام تو ہوتی ہے اُس کی رنگت سے
مگر ، فلک پہ ستارہ کہاں سے آتا ہے

میں اُس کو خود میں جو دریافت کر رہا ہوں ، ظفر
تو جانتا ہوں اِشارہ کہاں سے آتا ہے

-☆-

بہت مصروف ہُوں چھوٹا سا کوئی گھر بنانے میں
کہیں وہ بھی کسی دل کے بہت اندر بنانے میں

اُسے کہنا کہ میری طرح کے خُوش باش بندے کو
لگے گا وقت ایسے رنج کا خُوگر بنانے میں

محبت اس لیے بے حد ضروری ہے کہ مَیں اس سے
مدد لیتا ہُوں اپنے آپ کو بہتر بنانے میں

کہ وہ تصویر میں موجُود بھی ہو، اور، غائب بھی
لگا رہتا ہُوں مَیں ایسا ہی اک منظر بنانے میں

کوئی دل میں دریچہ کھولنے کی سعی میں رہنا
اور، اک دیوار اپنے آپ سے باہر بنانے میں

طریقہ ہے غلط یا مَیں بہت جلدی میں ہوتا ہُوں
بگڑ جاتے ہیں سارے کام کیوں اکثر بنانے میں

ہم اُس محفل کی پچھلی ہی صفوں میں ٹھیک ہیں، ورنہ
وہاں کچھ لوگ خاصے تیز ہیں نمبر بنانے میں

عمارت خواب ہستی کی بنانا ہی اگر ٹھہری
تو ہے کیا حرج اوروں سے ذرا ہٹ کر بنانے میں

ظفر، لَو پھُوٹتی ہے اُس کے شام آلُود چہرے سے
وہ خُود شامل ہے یہ دن رات کا چکّر بنانے میں

-☆-

نہیں معلوم کہ ہے کس لیے ہونے والی
کوئی گڑبڑ ہے مرے سامنے ہونے والی

یُوں ہی دیوار نے گرنا تھا مکاں کے اندر
یہ تباہی تھی اسی راستے ہونے والی

مَیں نجومی تو نہیں ہُوں، مگر، اتنا سُن لو
کوئی تخریب ہے اس خاک پہ ہونے والی

یُوں تو صحت مری رہتی ہے بہت ٹھیک، مگر
ایک تکلیف ہے جلدی مجھے ہونے والی

دل میں دیوار سی اُٹھتی ہُوئی لگتی ہے کوئی
گھر کی تقسیم ہے اک طرح سے ہونے والی

ابر اُمنڈتا ہُوا آتا ہے، گزر جاتا ہے
ایک بارش تو مجھے چاہیے ہونے والی

تھے تغافل کے تو اطوار ہمیشہ ہی وہاں
مہربانی بھی کوئی دیکھتے ہونے والی

غائبانہ کا بھی امکان تو تھا ہی، لیکن
یہ محبت تھی اُسے دیکھ کے ہونے والی

مَیں تو چپ ہُوں، سو، کسی اور ذریعے سے، ظفر
میری حالت کی خبر ہے اُسے ہونے والی

-☆-

یہ آنکھیں اور ہوئی تھیں ، تماشا اور ہونا تھا
ہمارے سامنے خواب تمنا اور ہونا تھا

ہمارا ڈوبنا تو بات کچھ ایسی نہیں ، لیکن
یہ پانی اور ہونے تھے ، یہ دریا اور ہونا تھا

بظاہر تو یہاں ہونا ہمارا کچھ نہ تھا ، پھر بھی
نہ ہوتے ہم تو پھر یہ رنگِ دُنیا اور ہونا تھا

ابھی تو سرسری ہی تھی ملاقات اُس کے ساتھ اپنی
محبت اور اگر ہوتی تو جھگڑا اور ہونا تھا

ہُوا کیا کچھ ہمارے ساتھ محفل سے نکلنے تک
ٹھہر جاتے تو کیا معلوم کیا کیا اور ہونا تھا

ہم اپنی موج میں پانی وہیں سر سے گزار آئے
ابھی سیلاب تو جتنا ہے اُتنا اور ہونا تھا

کسی نے تو بغاوت ایک دن کرنی ہی تھی آخر
نہ ہوتا مَیں تو کوئی میرے جیسا اور ہونا تھا

مَیں خود ہی آ گیا ہوں اور بہت خوش بھی نہیں آ کر
کہ میرے بعد کوئی آنے والا اور ہونا تھا

ظفر، لاہور سے آپ اتنی جلدی یُونہی لوٹ آئے
ابھی اُس شہر کی سڑکوں پہ رُسوا اور ہونا تھا

☆

ہم نے کاغذ پہ اگر حشر بپا کر لیا ہے
ایک دُنیا تو یہی کہتی ہے کیا کر لیا ہے

سفر اپنا یُونہی جاری ہے خُود اپنی جانب
تھک گئے ہیں جہاں ، رستے کو عصا کر لیا ہے

اور تو ہم سے تردّد کوئی کیا ہو سکتا
ہم نے اک بات پُرانی کو نیا کر لیا ہے

روک رکھا ہے لرزتی ہُوئی دیواروں کو
صحن میں سُوکھا ہُوا پیڑ ہرا کر لیا ہے

جو بھی انجام ہمارا ہو کہ ہم نے تو یہاں
عکس کو آئنہ ، خلقت کو خُدا کر لیا ہے

آہ و اشک اپنی طبیعت کے مُطابق تو نہیں
یُوں ہی اک سِلسلۂ آب و ہوا کر لیا ہے

اُس کے جادُو سے نکلنا کوئی آساں بھی نہ تھا
جیسے خُود کو کسی زنداں سے رہا کر لیا ہے

دُور سے دیکھ لیا کرتے ہیں تعبیر کے رنگ
خواب کو ہم نے ذرا خواب نُما کر لیا ہے

اب وہ کیوں جھانکتا ہے دل کے دریچے سے، ظفر
راستہ اُس نے اگر ہم سے جُدا کر لیا ہے

☆

پھر کوئی سی سخن ساز کہاں سے کریں ہم
بات ٹوٹی ہوئی آغاز کہاں سے کریں ہم

جن میں کچھ مطلب و معنی ہی نہیں ہے موجود
اُن خیالات کو الفاظ کہاں سے کریں ہم

راستے میں تو پڑیں گے وُہی دریا، وُہی کوہ
مسئلہ یہ ہے کہ پرواز کہاں سے کریں ہم

دن کے دوران بھی کچھ کام کے قابل رہ جائیں
خود کو اس طرح پس انداز کہاں سے کریں ہم

خواہشِ وصل کو سر پر بھی چڑھا سکتے ہیں
لیکن اس درجہ تگ و تاز کہاں سے کریں ہم

دل ہمارے کبھی کہنے میں تو رہتا ہی نہیں
آپ کی خاطر اسے باز کہاں سے کریں ہم

راکھ سی بن کے بکھر جائے گی ہر روز کی طرح
آرزو ہے، اسے آواز کہاں سے کریں ہم

مُردہ لفظوں میں بھلا جان بھی پڑ سکتی ہے
تُم ہی بتلاؤ، یہ اعجاز کہاں سے کریں ہم

سب جسے عیب سمجھتے ہیں سمجھنے والے
اُس ہُنر پر، ظفر، اب ناز کہاں سے کریں ہم

-☆-

بات ایسی بھی کوئی نہیں کہ محبت بہت زیادہ ہے
لیکن، ہم دونوں سے اس کی طاقت بہت زیادہ ہے

آپ کے پیچھے پیچھے پھرنے سے تو رہے اس عُمر میں ہم
راہ پہ آ بیٹھے ہیں، یہ بھی غنیمت بہت زیادہ ہے

عشق اُداسی کے پیغام تو لاتا رہتا ہے دن رات
لیکن ہم کو خُوش رہنے کی عادت بہت زیادہ ہے

کام تو کافی رہتا ہے، لیکن، کرنا ہے کس نے یہاں
بے شک روز اِدھر آ نکلو، فرصت بہت زیادہ ہے

کیا کچھ ہو نہ سکا ہم سے، اور، ہونے والا ہے کیا کچھ
حسرت بھی کافی ہے، لیکن، حیرت بہت زیادہ ہے

سیر ہی کر کے آ جائیں گے پھر بازار تماشا کی
جس شے کو بھی ہاتھ لگائیں، قیمت بہت زیادہ ہے

اُس کی توجّہ حاصل کی، اور، بیچ میں سب کچھ چھوڑ دیا
حکمت جتنی بھی ہو اس میں، حماقت بہت زیادہ ہے

عشق ہے کس کو یاد کہ ہم تو ڈرتے ہی رہتے ہیں سدا
حُسن وہ جیسا بھی ہے، اُس کی دہشت بہت زیادہ ہے

ایک چیز جو اپنی رسائی سے باہر ہے کہیں، ظفر
سچ پُوچھو تو اُس کی ہمیں ضرورت بہت زیادہ ہے

-☆-

ثمراں عُروج نہیں سکتا ہے ، خواب آ نہیں سکتا
اب اس زمیں پہ کوئی انقلاب آ نہیں سکتا

تمام راستے خُود بند کر کے بیٹھے ہُوئے ہیں
سوال ہو بھی تو کوئی جواب آ نہیں سکتا

اب آتے جاتے رہیں گے کچھ اور اور ہی موسم
یہ شاخِ دل ہے ، سو ، اس پر گلاب آ نہیں سکتا

حجاب محرم آب رواں ہے بیچ میں حائل
حُباب کے جو برابر حُباب آ نہیں سکتا

وہ چہرہ دُور ہے ، اور ، حسرتیں شمار سے باہر
کتاب پڑھ نہیں سکتے ، حساب آ نہیں سکتا

اِدھر کو آئی ہُوئی رات میں نے روک رکھی ہے
یہاں سے گُزرا ہُوا آفتاب آ نہیں سکتا

ہے آپ ہی کی یہ ہمت ، ہو آپ ہی کو مُبارک
ہمیں تو پھر بھی یہ طرزِ خطاب آ نہیں سکتا

اب اس سے کم تو مری قدر اور ہو نہیں سکتی
اب اس سے بڑھ کے تو کوئی عذاب آ نہیں سکتا

چلو سلام کریں جا کے آپ ہی ، ظفر ، اُس کو
ہمارے گھر تو وہ عزت مآب آ نہیں سکتا

-☆-

ہر طرف پھیلتی خُوشبو کی حفاظت کرنا
غیر ممکن ہے ابھی تُجھ سے محبت کرنا

وصل ہو گا کہ نہیں ، چھوڑ دیا قسمت پر
عشق میں بھی ہمیں آیا نہیں محنت کرنا

اپنے اپنے تھے اُصُول ، اور ، نہیں تھا ممکن
ایک کا دُوسرے سے کوئی رعایت کرنا

بات اگر کچھ بھی نہیں تھی تو یہ کیا تھا آخر
آتے جاتے ہُوئے آنکھوں سے اِشارت کرنا

اتنے مجبور ہیں ، لیکن ، کبھی ملنے نہ گئے
نہ ہی اُس سے یہ کہا ہے ، کبھی زحمت کرنا

چُومنا چاہتے تھے ہم اگر آنکھیں اُس کی
محض مطلوب تھا اظہارِ عقیدت کرنا

دل کا پھیلاو اگر چاروں طرف ہے موجُود
پھر مُناسب ہے اسی دشت میں وحشت کرنا

ہم کو اُستاد نے پہلا یہ پڑھایا تھا سبق
کام جو سہل نظر آئے کبھی مت کرنا

ترکِ اُلفت ہی کیا ہم نے کہ مُشکل تھا ، ظفر
اک غلط سوچ کی تا دیر حمایت کرنا

-☆-

دور ہی دور ترسنے کی ضرورت کیا ہے
جب ملاقات نہیں ہے تو محبت کیا ہے

دل میں کچھ اس کے بھی ہے، لیکن، ابھی کیا معلوم
اس میں افسانہ ہے کیا، اور حقیقت کیا ہے

بزدلوں کے لیے ہوتی نہیں یہ نعمتِ عشق
مل کے چلنا ہی نہیں ہے تو شراکت کیا ہے

ہیں جو اپنے ہی شب و روز میں مصروف اتنے
اس طرف دیکھنے کی آپ کو فرصت کیا ہے

جب کیا ہی نہیں کچھ بھی تو ندامت کیوں ہو
کچھ توقع ہی نہیں تھی تو شکایت کیا ہے

دور جاتے بھی نہیں، پاس پھٹکتے بھی نہیں
کچھ پتا بھی تو چلے آپ کی نیت کیا ہے

اور جا جا کے بتاؤ اُسے حالتِ دل کی
بات ہی وہ نہیں سنتا ہے تو حیرت کیا ہے

خاک ہی ہم کو اڑانی ہے تو کیا اس سے غرض
دشت کہتے ہیں کسے، اور، یہ وحشت کیا ہے

جان پہچان نہیں کوئی، جدھر جاؤ، ظفر
شہر میں اس سے بڑی اور سہولت کیا ہے

-٭-

نہ جینا چاہتے ہیں، اور، نہ مرنا چاہتے ہیں
کچھ اور ہی سا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں

وہ راستہ ہی تو ہے جس قدر بھی ہو دشوار
ہم ایک بار اُدھر سے گزرنا چاہتے ہیں

قدم قدم ہمیں چل کر ہی پار اترنا ہے
جو سطحِ آب پہ ہم پانو دھرنا چاہتے ہیں

پتا نہیں ہمیں پہنچا دیا ہے کس نے یہاں
ہم اس مقام سے نیچے اترنا چاہتے ہیں

کسی زمانے میں پھر یاد آ سکیں ہم لوگ
سو، اس ہوا میں دلوں سے بسرنا چاہتے ہیں

یہاں کے لوگ تو اچھے نہیں، مگر، پھر بھی
ہم اس نواح میں کچھ دن ٹھہرنا چاہتے ہیں

سبق بہت ہمیں حاصل ہوا ہے، اس لیے ہم
نہ کرنا چاہتے ہیں، اور، نہ بھرنا چاہتے ہیں

وہ سبزہ زار ہمارے لیے نہیں ہے اگر
تو کیوں ضرور وہاں چگنا چرنا چاہتے ہیں

وہ خدوخال جو دل سے مٹا دیے تھے، ظفر
کسی بہانے دوبارہ اُبھرنا چاہتے ہیں

-٭-

اندر سے دیکھتا نہ ہی باہر سے دیکھتا
وہ صرف مجھ کو میرے برابر سے دیکھتا

اک تھرتھری سی پھیلتی جاتی بدن کے بیچ
میں اُس کو شوق سے تو کبھی ڈر سے دیکھتا

دالان میں لگی ہوئی رونق ، منڈیر پہ
بیٹھے ہوئے سیاہ کبوتر سے دیکھتا

آئینے سے جُڑے ہوئے ہوتے ہر ایک سمت
اور ، میں کسی پڑے ہوئے پتھر سے دیکھتا

اس تیرگی کے سارے کنارے کسی طرح
ہر رات ایک خوابِ منوّر سے دیکھتا

ہوتا اسی طرح سے تناظر ذرا درست
باہر کی کوئی چیز جو اندر سے دیکھتا

نظارہ ہی کچھ ایسا عجیب و غریب ہے
میں اُس کو دیکھتا بھی تو اکثر سے دیکھتا

کرتا اُسے تلاش جو ہوتا نہیں کہیں
اور ، اپنے آسماں و زمیں پر سے دیکھتا

پہلے کسی بُجھی ہوئی تصویر سے ، ظفر
پھر میں کسی مٹے ہوئے منظر سے دیکھتا

☆

اس حاضر و غائب میں خلل ہے مرا ہونا
اپنا ہی کوئی ردِعمل ہے مرا ہونا

ہونا ہے کسی اور شب و روز میں مجھ کو
دراصل تو کچھ آج نہ کل ہے مرا ہونا

اس رنگِ ہوا میں کوئی دم ہے مری ہستی
اس نقشِ نوا میں کوئی پل ہے مرا ہونا

اک عمر سے تھے منتظرِ خواب و خبر لوگ
لگتا ہے کسی صبر کا پھل ہے مرا ہونا

ہوتے ہی روانہ ہوں نہ ہونے کے سفر پہ
میرے لیے پیغامِ اجل ہے میرا ہونا

طے کرنی ہے کس نے مرے حصے کی مسافت
اس رات کے رستے پہ اٹل ہے مرا ہونا

ہیں چاروں طرف ریت کے ٹیلے مرے اندر
پھیلے ہوئے ، جیسے کوئی تھل ہے مرا ہونا

ہوں آپ ہی میں اُلجھی ہوئی ایک بُجھارت
کس عقدۂ پیچیدہ کا حل ہے مرا ہونا

مجھ کو بھی ، ظفر ، ٹھیک سے معلوم نہیں کچھ
ایسا ہی کوئی ردوبدل ہے مرا ہونا

☆

جواب اور بھی دینا مُحال ہو گئے ہیں
یہاں کچھ ایسے ہی پیدا سوال ہو گئے ہیں

وُہی جو دست و گریباں تھے چار دن کہیں پہلے
پڑا ہے وقت ، سو ، کیا ہم خیال ہو گئے ہیں

محبت ، اور ، یہ مہنگائی اس قدر ہیں زیادہ
کہ اب تو دن ہی گزرنا مُحال ہو گئے ہیں

خود آپ سے بھی ملے ایک عُمر بیت گئی ہے
اُسے بھی دیکھے ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں

تمہارے خواب ہوئے ہیں زمین پر کئی لمحے
کچھ آسمان پہ گرد ملال ہو گئے ہیں

اِسی قدر ہے فسانہ ہمارے ہونے کا اب تو
ہوئے بھی ہیں تو کہیں خال خال ہو گئے ہیں

نہ جانے کب سے گزرتے ہیں روند روند کے خود کو
بُری طرح سے جو یُوں پائمال ہو گئے ہیں

وُہی بنیں گے ہمارے لیے زوال کا باعث
ہمارے ہاتھوں سے جو بھی کمال ہو گئے ہیں

مُعطلی میں پڑے ہیں ، ظفر ، ہم ایک ہی تنہا
کہ اور جو بھی تھے سارے بحال ہو گئے ہیں

☆

بھلا سا تھا کوئی ، مَیں اُس کا نام بھول گیا ہُوں
جو صبح یاد رکھا ہے تو شام بھول گیا ہُوں

اِسی نواح میں ہو گا کہیں مکانِ محبت
وہ صحن یاد نہیں ، اور ، بام بھول گیا ہُوں

کسی کے آنے کا طے ہو چکا تھا کون سا لمحہ
کیا ہُوا تھا کہاں اِنتظام ، بھول گیا ہُوں

پڑا ہُوا ہے کوئی کام اُس کے ساتھ ضرُوری
کبھی ملا بھی ہُوں اُس سے تو کام بھول گیا ہُوں

سفر کچھ اور طرح کا تھا ایک بار جو مَیں نے
شرُوع کر لیا ، اور اختتام بھول گیا ہُوں

بھٹک رہا ہُوں نئے شہر میں نہ جانے کب سے
کیا ہُوا ہے کہاں پر قیام ، بھول گیا ہُوں

یہ لوگ ایک سے لگتے ہیں اب تو سارے کے سارے
تمیزِ مرتبہ خاص و عام بھول گیا ہُوں

کچھ اس طرح کا تھا اُسلوبِ گفتگو وہ کسی کا
کہ مَیں تو اپنا ہی طرزِ کلام بھول گیا ہُوں

مَیں شہسوارِ سخن ہُوں ، ظفر ، عجیب طرح کا
کہ جب بھی زین کسی ہے ، لگام بھول گیا ہُوں

☆

کسی لرزتے ہوئے ستارے پہ جا رہا تھا
میں کوئی خس تھا، مگر، شرارے پہ جا رہا تھا

تھی ہر گھڑی پھولتی ہوئی کائنات نیچے
کسی طرف میں اسی غبارے پہ جا رہا تھا

پروں میں اک پیاس تھی کئی خشک موسموں کی
جو میں کسی تازہ آب پارے پہ جا رہا تھا

وہیں وہیں میرے سامنے تھی کوئی رُکاوٹ
جہاں جہاں میں ترے اِشارے پہ جا رہا تھا

نظر میں تھے میری دُور کے تابناک اندھیرے
جو روشنی کے سیاہ دھارے پہ جا رہا تھا

مرا منافع تھا جیسے اُس کی نظر سے اوجھل
وہ خُوش بہت تھا جو میں خسارے پہ جا رہا تھا

میں اپنے ہی زور میں چلا جا رہا تھا، لیکن
یہ لگ رہا تھا کسی سہارے پہ جا رہا تھا

مرے لہو میں خلوص تھا کوئی اندر اندر
میں سب سے آگے بس ایک نعرے پہ جا رہا تھا

گُزر گئی تھی مجھے کُچل کر، ظفر، کوئی شے
وگرنہ میں تو کہیں کنارے پہ جا رہا تھا

☆

تماشا

تھا سُرخ پوش وہ گُل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر
(مصحفی)

تھی اگر ختم تو پھر بات بڑھائی کیوں ہو
جرم اقبال کیا ہے تو صفائی کیوں ہو

تم ہی انصاف سے کہہ دو کہ محبت کرنا
اگر اچھائی نہیں ہے تو بُرائی کیوں ہو

اور اگر کوئی سہولت نہیں دینی ہو تو پھر
راستے سے یہ رُکاوٹ بھی ہٹائی کیوں ہو

بات اگر کچھ بھی نہیں میرے تمہارے مابین
یہ ہوائی کسی دُشمن نے اُڑائی کیوں ہو

حُسن اگر عام ہے اس شہرِ تماشا میں تو پھر
ایک ہی شکل یہاں دل میں سمائی کیوں ہو

کس لیے روک رکھا ہو کوئی خواب آنکھوں میں
اور ، دیوار پہ تصویر لگائی کیوں ہو

سانس لینا بھی ہے باہر کی فضا میں مشکل
قید جیسی بھی ہے ، اب ، اس سے رہائی کیوں ہو

جو ہوا ہی نہیں پیدا وہ مرے گا کیوں کر
کبھی ملنا ہی نہیں ہے تو جدائی کیوں ہو

اُس نے آنا ہی نہیں تھا تو اُسولا بھی ، ظفر
دل نے اُس کے لیے یہ بزم سجائی کیوں ہو

☆

میاں جاوید اقبال ارائیں کے جگر گوشوں
علی، اوسامہ اور رافع کے لیے

ہنسی ہنسی میں جو اُس رات وہ جُدا ہُوا ہے
اُسی مقام پہ خوابِ ہوس رُکا ہُوا ہے

وہ بات ہم نے بتائی نہیں کسی کو ابھی
وہ بوسہ ہم نے چھپا کر کہیں رکھا ہُوا ہے

درخت کٹ گئے ، روشیں بھی ہو گئیں برباد
وہ باغ ایک طرف سے ابھی بچا ہُوا ہے

دراصل اس کو تعلق بھی کہہ نہیں سکتے
کسی کے ساتھ جو اِک تار سا بندھا ہُوا ہے

مرے وُجود کا جھونکا سا اس گلستاں میں
کہیں سے آیا ہُوا ہے ، کہیں گیا ہُوا ہے

یہ مَیں ہوں تاکہ تُم آرام کر سکو دم بھر
جو فرش پر ہی بچھونا سا اِک بچھا ہُوا ہے

اُنھی دنوں میں ارادہ سا تجھ سے ملنے کا
یہیں کہیں مرے اسباب میں پڑا ہُوا ہے

نمی بہم ہوئی اس سرزمین کو ، آخر
یہ سبزہ اب کے بہت دیر میں ہرا ہُوا ہے

مَیں اِک خمارِ خوشی میں بھی رہا ہوں ، ظفر
مرے وُجود سے اِک حشر بھی بپا ہُوا ہے

☆

زمیں پہ ایڑی رگڑ کے پانی نکالتا ہوں
مَیں تشنگی کے نئے معانی نکالتا ہوں

وہی برآمد کروں گا جو چیز کام کی ہے
زباں کے باطن سے بے زبانی نکالتا ہوں

فلک پہ لکھتا ہوں خاکِ خوابیدہ کے مناظر
زمین سے رنگ آسمانی نکالتا ہوں

کبھی کبوتر کی طرح لگتا ہے ابر مجھ کو
کبھی ہوا سے کوئی کہانی نکالتا ہوں

بہت ضروری ہے میرا اپنی حدوں میں رہنا
سو ، بحر سے خود ہی بے کرانی نکالتا ہوں

کبھی ملاقات ہو میسّر تو اس سے پہلے
دماغ سے ساری خوش گمانی نکالتا ہوں

جو چھیڑتا ہوں نیا کوئی نغمۂ محبت
تو سازِ دل سے دُھنیں پرانی نکالتا ہوں

کوئی ٹھہر کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں منظر
اسی لیے طبع سے روانی نکالتا ہوں

ظفر ، مرے سامنے ٹھہرتا نہیں ہے کوئی
تو اپنے پیکر سے اپنا ثانی نکالتا ہوں

☆

شدید شور کے اندر، غبار کے نیچے
کھڑا ہوں جیسے کسی آبشار کے نیچے

اداے سلسلۂ سبزہ زار کے اوپر
ہواے ہمہمۂ انتظار کے نیچے

کبھی ہوں سایۂ آبِ رواں کے ساتھ ہی ساتھ
کبھی میں شعلۂ ابرِ بہار کے نیچے

ابھی تھا ہالۂ گرداب کے بہت اندر
ابھی ہوں اٹھتی ہوئی تیز دھار کے نیچے

جمی تھی دھوپ بہت چوٹیوں کے چاروں طرف
کھلے تھے پھول بہت کوہسار کے نیچے

فریب دینے سے بہتر فریب کھانا تھا
جو آ گیا ہوں کسی اعتبار کے نیچے

اٹھا کے بسترِ خوابِ سفر سے کیوں مجھ کو
بٹھا گئے شجرِ سایہ دار کے نیچے

میں زینہ زینہ جو اندر اتر کے دیکھتا ہوں
قرار بھی ہے دلِ بے قرار کے نیچے

ہمارے وہم و گماں سے بھی دور تھا کہ ظفر
پڑے ہیں آپ بھی دیوارِ یار کے نیچے

☆

نفع سمجھو اسے یا خسارہ، بس اتنا ہی تھا
اس محبت میں حصہ ہمارا بس اتنا ہی تھا

صرف پانی ہی پانی ہے میرے پس و پیش میں
ڈوبنے کے لیے یہ کنارہ بس اتنا ہی تھا

اصل منظر تو وہ تھا جو خود ہم نے دیکھا نہیں
جو میسر ہوا ہے دوبارہ، بس اتنا ہی تھا

ہم سمجھ کر بھی اچھی طرح جس کو سمجھے نہیں
اس کی آنکھوں کے اندر اشارہ بس اتنا ہی تھا

اس کے خوابوں خیالوں کی تو کوئی حد ہی نہ تھی
وہ زمانہ جو ہم نے گزارا، بس اتنا ہی تھا

تم ہو آنکھوں سے اوجھل تو صبر آ گیا دل کو بھی
دل وفادار تھا جو تمھارا، بس اتنا ہی تھا

ایک دیوار تھی، اور کچھ بھی نہیں تھا کہیں
حاصلِ عمر اپنا سہارا بس اتنا ہی تھا

اب تو اندر بھی ہے خامشی اور باہر بھی ہے
دل کے اطراف میں شور سارا بس اتنا ہی تھا

اک چمک سی دکھا کر جو گم ہو گیا ہے کہیں
اے ظفر، شاعری کا شرارہ بس اتنا ہی تھا

☆

وہ خواب انتظار بسر ہی نہیں ہُوا
دُنیا سے جیسے میرا گُزر ہی نہیں ہُوا

مَیں خُود ہی ایک شورِ مُسلسل ہُوں، کیا بتاؤں
تنہائیوں کا مُجھ پہ اثر ہی نہیں ہُوا

رختِ سفر ہی اتنا زیادہ تھا اب کی بار
کوشش کے باوجُود سفر ہی نہیں ہُوا

مَیں شام کی پناہ میں رہتا ہُوں، اور، کبھی
سُورج کے آگے سینہ سپر ہی نہیں ہُوا

آنکھوں کے آس پاس لرزتا تھا کِس لیے
جو شُعلہ میرے خس میں شرر ہی نہیں ہُوا

یہ شیشہ دیکھ بھال سے رہتا ہے بے نیاز
ٹُوٹا بھی ہے تو کوئی ضرر ہی نہیں ہُوا

دالانِ دل میں اب تو بڑی دیر سے کبھی
ہنگامۂ خیال و خبر ہی نہیں ہُوا

لوگوں کو اپنے عیب دِکھانے چلا تھا مَیں
مُجھ سے کسی طرح یہ ہُنر ہی نہیں ہُوا

آنکھوں کی آب و تاب میں محفوظ ہے، ظفرؔ
منظر کبھی جو پیشِ نظر ہی نہیں ہُوا

☆

ہوا تھی، اور، گرہ در گرہ خیال اُس کے
بکھر رہے تھے کہیں نرم و خشک بال اُس کے

مَیں اُس کو دیکھ تو سکتا نہیں مگر، دن رات
مرے لہُو میں لرزتے ہیں خدوخال اُس کے

دلوں کا ربط مُلاقات پر نہیں موقُوف
کہ میری ذات سے رشتے ہیں لازوال اُس کے

دیا فریب تو بدلے میں لے لیا سب کُچھ
کبھی سنو تو کرشمے ہیں بے مثال اُس کے

مَیں اُس سے بچ کے نکلنا تو چاہتا تھا، مگر
روش روش یہاں پھیلے ہُوئے تھے جال اُس کے

جواب تھا بھی تو مَیں نے اُسے دیا ہی نہیں
وگرنہ ایسے بھی مُشکل نہ تھے سوال اُس کے

اِدھر اُدھر کی خبر اُس کے پاس ہے ساری
مرے ہی ساتھ نہیں رابطے بحال اُس کے

اگر وُہی ہے تو بتلاؤ کِس طرح آخر
مرے بغیر گُزرتے ہیں ماہ و سال اُس کے

ملے تو چُوم لُوں اُس کی اُداسیاں کہ، ظفرؔ
عزیز تر مجھے اُس سے بھی ہیں ملال اُس کے

☆

ہجر کے سارے عذابوں سے گزر جانا ہے
مَیں نے اس بار اُسے دیکھ کے مر جانا ہے

لا کے دوراہے پہ وہ چھوڑ گیا ہے مُجھ کو
آ کے بتلائے کہ اب مَیں نے کِدھر جانا ہے

دل کی کیا پُوچھتے ہو ، رنج تو گھر ہے اس کا
یہ کوئی زخم نہیں ہے جسے بھر جانا ہے

ٹوٹ جانا ہے خیالوں نے ، خبر ہے مُجھ کو
مجھے معلوم ہے خوابوں نے بکھر جانا ہے

وعدۂ وصل کو سچ مان لینا ہے مَیں نے
اور ، پہلے کی طرح اُس نے مُکر جانا ہے

آخری فیصلہ کر کے پلٹ آنا ہے ، مگر
ایک بار اُس نے پُکارا تو ٹھہر جانا ہے

شعر کہتا ہوں اب اُس شوخ کی فرمائش پر
عیب تھا میرا جسے اُس نے ہُنر جانا ہے

خلق سے دُور ، تو خُود سے بھی الگ ہو کے یہاں
کام ایسا ہی کوئی مَیں نے بھی کر جانا ہے

اس سے پہلے کہ کوئی کھینچ لے اس کو آ کر
مَیں نے سیڑھی سے ، ظفر ، خُود ہی اُتر جانا ہے

☆

مجھے شام تماشا سے نکالا کس لیے ہے
اندھیرا کیوں ہے اِتنا ، اور اُجالا کس لیے ہے

مرے افسانہ خواب اسیری میں نہ جانے
ہواؤں ، اور ، باغوں کا حوالہ کس لیے ہے

کسی نے اس قدر آسانیاں دے دی ہیں کیوں کر
مجھے اِس طرح سے مُشکل میں ڈالا کس لیے ہے

کسی بھی طرح سے جانچا نہ پرکھا ، اور ، اُس کو
کسی بھی سمت سے دیکھا نہ بھالا کس لیے ہے

محبت ہو رہی تھی ، اُس سے پیچھا کیوں چُھڑوایا
مُصیبت آ رہی تھی ، اُس کو ٹالا کس لیے ہے

جو مَیں اپنی نئی تشکیل کرنا چاہتا ہُوں
تو دُنیا کو مرے سانچے میں ڈھالا کس لیے ہے

جو سب کُچھ ہو چُکا ہے ، کیا سبب اُس کا ہے آخر
اور ، اُس کے بعد اب یہ ہونے والا کس لیے ہے

جو سب کے فائدے ہی کے لیے تھا کام سارا
تو پھر سب سے یہ اِتنا بالا بالا کس لیے ہے

ظفر ، میرا زمیں سے رابطہ جو کٹ گیا تھا
مجھے گرنے ہی دینا تھا ، سنبھالا کس لیے ہے

☆

چاند سا کوئی لبِ بام بھی آ جاتا ہے
کم نُما بھی ہے ، سرِعام بھی آ جاتا ہے

یُوں تو بیکار بہت ہُوں ، مگر ، اس اثنا میں
اکثر اکثر مجھے آرام بھی آ جاتا ہے

مَیں کہیں بھی نہیں ہوتا ہُوں، یہاں، اور، نہ وہاں
کبھی اس طرح کا ہنگام بھی آ جاتا ہے

رات کا راستہ روشن نہیں رہتا ، لیکن
اس اندھیرے میں کوئی نام بھی آ جاتا ہے

بادلوں ، اور ، ہواؤں کا مُسافر ہی سہی
طائرِ خواب تہِ دام بھی آ جاتا ہے

کبھی آغاز کا ملتا ہی نہیں کوئی سُراغ
ایک دم سامنے انجام بھی آ جاتا ہے

دُھوپ کی دُھول اُڑا کرتی ہے دن بھر ، لیکن
ساتھ ہی سلسلۂ شام بھی آ جاتا ہے

گھاس بھی تُو نے کسی دن نہیں ڈالی ہم کو
اور ، ہم پہ ترا الزام بھی آ جاتا ہے

روز بے کار ہی پھرتے ہیں محبت میں ، ظفر
اور ، ایسے میں کوئی کام بھی آ جاتا ہے

☆

یہ دُنیا ہے تو پھر اس کے کنارے کون سے ہیں
ہمارے کون سے ہیں اور تُمھارے کون سے ہیں

اگر کوئی نہیں بھی ہے تو آخر کیوں نہیں ہے
جو سارے ہیں تو یہ سارے کے سارے کون سے ہیں

زمیں پہ خاک زادے کس قدر ہیں ، دیکھ لو خُود
اور ، اِن میں آسمانوں سے اُتارے کون سے ہیں

مُروّت ہے سراسر اس جگہ رہنا بھی اپنا
وگرنہ شہر پہ دعوے ہمارے کون سے ہیں

رواں ہیں سب کے سب، اور، دیکھتا کوئی نہیں ہے
کہ رُکنے ، اور ، چلنے کے اشارے کون سے ہیں

یہ پیش از وقت ہی اندازہ کرنا چاہیے تھا
خس و خاشاک ہے کتنا ، شرارے کون سے ہیں

سفینوں کو سفر کی رات پروا ہی نہیں تھی
سمندر کس طرف ہے ، اور ، ستارے کون سے ہیں

ہماری عُمر سے بہا کے بیٹھے ہو جن کو
ابھی وہ روز و شب ہم نے گزارے کون سے ہیں

ظفر ، جھگڑا اب اُس کے ساتھ بس اس بات پہ ہے
نظر آتے نہیں ہیں جو نظارے کون سے ہیں

☆

سانسیں جو ہُوئیں ختم ، ہوا نے مجھے دیکھا
بارش سے ذرا پہلے گھٹا نے مجھے دیکھا

اُس بھیڑ بھڑکے سے مفر بھی نہیں تھا کوئی
میں نے اُسے ، اور ، جنگی جا نے مجھے دیکھا

وادی تھی کوئی ، جس میں پکارا تھا کسی کو
جب لوٹ کے آئی تو صدا نے مجھے دیکھا

غائب رہا تا دیر میں اس رُوئے زمیں پر
اک روز مرے دستِ دُعا نے مجھے دیکھا

کچھ کہتے ہُوئے مجھ سے بکھرتے ہُوئے پتّے
موسم نے بدلنے کے بہانے مجھے دیکھا

بھاگا ہُوں زر و مال کے پیچھے تو اُسی دم
حیرت سے مری لغزشِ پا نے مجھے دیکھا

چھوڑی ہے اگر سعیِ سخن ، چھوڑ ہی رکھی
اک عمر مری طبعِ رسا نے مجھے دیکھا

تخریب پہ مائل تھا جو تعمیر سے بڑھ کر
افسوس کیا ، اور ، خُدا نے مجھے دیکھا

مامُور تھا مَیں اپنی حفاظت پہ ظفر ، آپ
سب نے ہی یہاں میرے سرہانے مجھے دیکھا

☆

کشتیاں رہتی ہیں دھارے سے الگ
اور ، دریا ہے کنارے سے الگ

مَیں وہ خس ہُوں کہ نہیں رہ سکتا
ایک لمحہ بھی شرارے سے الگ

کچھ تعلّق تو رکھوں گا باقی
کیسے ہو سکتا ہُوں سارے سے الگ

تا کہ وہ اور نمایاں ہو جائے
مَیں ہُوا خود ہی نظارے سے الگ

گرنے ہی والی ہے دیوارِ بدن
ہونے والا ہُوں سہارے سے الگ

میری منزل ہی جُدا ہے ، یعنی
چلتا رہتا ہُوں ہمارے سے الگ

ہے خبر اس کی ہمیں بھی ساری
کر رہے ہو جو ہمارے سے الگ

تیسری بار بہم ہونے کو
ہو رہا ہُوں مَیں دوبارے سے الگ

مُنھ سے کہنا نہ پڑا اُس کو ، ظفر
ہو گئے ایک اشارے سے الگ

☆

کیسے کیسے منظرِ مہتاب تھے چاروں طرف
کُچھ نئے اور کچھ پُرانے خواب تھے چاروں طرف

وُسعتِ صحرا کی تھیں اپنی بھی کُچھ پابندیاں
بند ہوتے اور کُھلتے باب تھے چاروں طرف

یا تھکاوٹ تھی جہانِ خاک پر پھیلی ہُوئی
یا مرے بکھرے ہُوئے اعصاب تھے چاروں طرف

درمیاں میں اک پُرانی پیاس تھی ، اور ، دُور دُور
آبِ تازہ کے کئی تالاب تھے چاروں طرف

تیرہ و تاریک تھی سرسبز جنگل کی ہوا
ٹہنیوں پر جا بجا سُرخاب تھے چاروں طرف

مَیں نے ہی رکھا نہیں ہے پانو پانی میں کبھی
ورنہ دریا تو کبھی پایاب تھے چاروں طرف

سہل تھا میرا تو ملنا اِس فراخی میں کہیں
اور سب میرے ہوا نایاب تھے چاروں طرف

سربسر جلدی میں تھے اور جانتا کوئی نہ تھا
سارے آخر کس لیے بے تاب تھے چاروں طرف

اک فصیلِ کفر تھی گھیرے ہُوئے مُجھ کو ، ظفر
اور ، اُس دیوار میں محراب تھے چاروں طرف

☆

قصہ اُٹھا ہُوا اُس کے قدوقامت سے بھی تھا
اور ، کُچھ اُس کا تعلّق مری شامت سے بھی تھا

اُس کے چہرے پہ اُمنڈتا ہُوا وہ رنگِ بہار
غنچہء لب کی بہت شوخ علامت سے بھی تھا

اُس کی آواز کا جادُو تھا مرے چاروں طرف
مَیں تو خاموش کُچھ اپنی ہی ندامت سے بھی تھا

اُس کے پیکر کی نزاکت کا کوئی رشتہء خاص
اُس کے ہر سمت کتابوں کی ضخامت سے بھی تھا

رنگِ زرد اپنا کسی ساحلِ دُشوار کے ساتھ
سر پٹختی ہُوئی اک موج ملامت سے بھی تھا

یہ جو آمیزہء اُلفت ہے تو کُچھ اِس کا خمیر
اُس کی جدّت سے بھی اور اپنی قدامت سے بھی تھا

ہم سمجھتے رہے اعجازِ محبت جس کو
درحقیقت وہ کسی اور کرامت سے بھی تھا

آخری عشق تھا وہ ، اور کہیں گرتے پڑتے
ربط اُس کا کوئی آشوبِ قیامت سے بھی تھا

سلسلہ اُلجھا ہُوا اُس کے تغافل کا ، ظفر
اپنی ہجرت سے بھی ہے ، اور ، اقامت سے بھی تھا

☆

جہاں نہیں کوئی اس خاکداں کے چاروں طرف
کہ آسماں ہے کبھی آسماں کے چاروں طرف

میں اُس کی کوئی نشانی بتا نہیں سکتا
مکاں تھے اور بہت اُس مکاں کے چاروں طرف

لپک رہی ہیں کسی اور کے لیے شاید
یہ بجلیاں سی مرے آشیاں کے چاروں طرف

یہیں کہیں سے ملے گا کبھی سُراغ اُس کا
بھٹک رہا ہوں کسی بے نشاں کے چاروں طرف

کہیں مرا کوئی کردار تو نہیں، لیکن
دھڑک رہا ہوں میں اس داستاں کے چاروں طرف

شفق پڑی ہوئی راہوں پہ دُور دُور کہیں
شجر کھڑے ہوئے خوابِ رواں کے چاروں طرف

کچھ اور ہے جسے اک شکل دی گئی ہے یہاں
کچھ اور تھا مرے وہم و گماں کے چاروں طرف

اس ایک میں ہیں کئی اور طرح کے اطراف
یہ کوئی اور طرف ہے، کہاں کے چاروں طرف

پڑا ہوں اُس کے مضافات میں، جدھر دیکھو
سو، میں ہی میں ہوں، ظفر، درمیاں کے چاروں طرف

☆

دُنیا کی طرف سے، کبھی عقبیٰ کی طرف سے
کیا ڈر سے لگے رہتے ہیں کیا کیا کی طرف سے

پانی سا چمکتا ہُوا صحرا میں بہت دُور
اور خاک سی اُڑتی ہُوئی دریا کی طرف سے

ہر دم ہے مرے ماضی و موجود کی اُلجھن
اک عالمِ تشویش ہوں فردا کی طرف سے

معدُوم ہُوئی جاتی ہے کیا کیا مری ہستی
کیا لوٹ کے آیا ہوں سراپا کی طرف سے

دُنیا کو اگر میں نے دیا کچھ نہیں اب تک
پھر کیا ہو شکایت مجھے دُنیا کی طرف سے

میں خود جو نہیں ہوں تو ہے میرے لیے پیغام
پیدا کی طرف سے نہ ہویدا کی طرف سے

اک خاک خموشی کے مقابل میں شب و روز
اک شور رہا ادنیٰ و اعلیٰ کی طرف سے

بے رامش و بے رنگ ہے ویسا ہی یہ منظر
آیا نہ کوئی طاق تماشا کی طرف سے

پہنچا ہے یہاں تک بھی ظفر سیلِ سفر میں
اک شعلہ مرے خوابِ دوبارہ کی طرف سے

☆

دھویں میں لتھڑی ہوئی گفتگو زیادہ ہے اب کے
فضائے شہر میں ڈیزل کی بُو زیادہ ہے اب کے

ضروریات ہی اتنی سمٹ گئی ہیں کہ دیکھو
ہوائے تشنہ کو ایک آبجُو زیادہ ہے اب کے

ہر ایک چیز میں کچھ اور طرح کی ہے ملاوٹ
کہ میں تو ہوں ہی، مگر، مجھ میں تُو زیادہ ہے اب کے

کچھ اپنی شکل و شباہت ہی اور ہو گئی ، اس پر
جو آئنہ ہی نہیں ، رُوبرُو زیادہ ہے اب کے

کہاں سے آئی ہے بُہتات اس نواح میں اتنی
کبھی جو کم تھا وہی سُو بسُو زیادہ ہے اب کے

یہ آگ پھیلتی جاتی ہے اور بھی مرے اندر
یہ شور اُٹھتا ہوا کُوبکُو زیادہ ہے اب کے

لہو میں معرکہ برپا ہے کوئی اور ہی شاید
اگر یہ خوابِ سُخن دُوبدُو زیادہ ہے اب کے

میں اس کو آپ ہی پہچانتا نہیں ہوں ، وگرنہ
یہ تھرتھری تو وہی ہوبہو زیادہ ہے اب کے

ظفر ، میں اپنا توازن ہی کھو چکا ہوں سراسر
کہ میرے دل میں کوئی آرزو زیادہ ہے اب کے

-☆-

کچھ اب کی بار بطرزِ دگر نکال رہا ہوں
اس آبِ خواب سے کیا کیا گُہر نکال رہا ہوں

بھلے ہی لوگ تو افواہ ہی اسے کوئی سمجھیں
یہاں میں اپنے تئیں جو خبر نکال رہا ہوں

کچھ اہلِ دہر پہ ظاہر نہیں ہوا ہوں ابھی تک
میں اپنی خاک میں تھا ، اور سر نکال رہا ہوں

میں جس پہ چار قدم چل کے چھوڑ دوں گا اچانک
پھر ایک بار نئی رہگزر نکال رہا ہوں

بُرے کے ساتھ بھلے کو ملائے رکھتا ہوں باہم
سو ، یُوں قضیہ عیب و ہنر نکال رہا ہوں

بلند بانگ بلا وجہ ہی نہیں ہوں یہاں پر
کہ شامِ دشت میں یُوں اپنا ڈر نکال رہا ہوں

یہ کانٹ چھانٹ بھی اک تجربہ ہے جس کے ذریعے
نیا تعلّقِ شاخ و شجر نکال رہا ہوں

زمین پر جو یہ سب کچھ ہے ، فالتو ہے ، سو ، اس سے
تمام سلسلہ خشک و تر نکال رہا ہوں

یہ کس طرح کا ، ظفر ، گھر بنا رہا ہوں کہ جس میں
دریچہ چھوڑ رہا ہوں نہ در نکال رہا ہوں

-☆-

سفر کیا نہیں ، رنجِ سفر وُہی کچھ ہے
مَیں کب سے خانہ بدر ہُوں ، سو، گھر وُہی کچھ ہے

وہاں بھی صُورتِ احوال ہے وُہی کی وُہی
یہاں بھی سلسلۂ خشک و تر وُہی کچھ ہے

مجھے ہی کِس لیے تبدیل کر رہا ہے کوئی
اُسی جگہ پہ ہے خُود بھی اگر وُہی کچھ ہے

اُسی طرح کا کوئی شور ہے جو پہلے تھا
ہُوا ہے ، اور ، یہاں دربدر وُہی کچھ ہے

کہیں بھی لے کے نہ جائے کسی کو، اور، اس پر
کوئی چلے نہ چلے، رہگزر وُہی کچھ ہے

قبول کرنے لگے ہیں اُسے بھی ناچار
جو اتنی دیر سے، اور، اِس قدر وُہی کچھ ہے

یہ شہرِ خواب اِسی رنگ میں ہے، اور، اس میں
خیال اور بھی ہے تو خبر وُہی کچھ ہے

دُکانِ شوق بڑھا دینی چاہیے اب تو
کہ نفع خاک نہیں، اور، ضرر وُہی کچھ ہے

ہماری سعیِ سخن کی یہ کیفیت ہے ، ظفرؔ
کہ عیب میں ہے اِضافہ ، ہُنر وُہی کچھ ہے

☆

سخت مشکل ہے کسی اور طرح کا ہونا
وُہی باقی ہے ابھی اور طرح کا ہونا

صُورتِ حال ہے یکساں مرے باہر کی طرف
اور ، اندر ہے کئی اور طرح کا ہونا

ایک ہی طرح کے ہونے میں بھی ممکن ہے بہت
غلطی سے ہی سہی ، اور طرح کا ہونا

مَیں جو بدلُوں تو بدل جاتے ہیں سب ہی مرے ساتھ
میری حسرت ہی رہی اور طرح کا ہونا

میرا ہونا ابھی رہتا ہے ، رہے گا ہمہ وقت
وہ کسی اور ، نئی اور طرح کا ہونا

میرے ہونے میں کسر اور تو کوئی نہیں اب
یہی رہتی ہے کمی ، اور طرح کا ہونا

مَیں ہُوا اور طرح کا تو مری طبع رواں
اور بھی ہونے لگی اور طرح کا ہونا

ہے بدستور اُسی طرح سے یہ خطۂ خاک
اس کی تقدیر نہ تھی اور طرح کا ہونا

ہو گیا مَیں بھی ، ظفرؔ ، اور طرح کا شاید
اور ، خواہش تھی مری اور طرح کا ہونا

☆

ہے راس بہت اپنے ہی آثار میں ہونا
ٹوٹے ہوئے در میں کبھی دیوار میں ہونا

وہ خواب ہوا ہو کے لرزتا مرا ہر سمت
بھولا نہیں مجھ کو گل و گلزار میں ہونا

اندازہ کوئی خود ہی لگا سکتا ہے اب تو
کس طرح کا ہو سکتا ہے ناچار میں ہونا

چیزیں ہوئی جاتی ہیں سبھی ایک ہی جیسی
آزاد بھی ہونا ہے ، گرفتار میں ہونا

اک بے خبری ہی کی خبر تھی سحر و شام
سونے ہی کی صورت رہی بیدار میں ہونا

ہونے کا مزہ تب ہے کہ شامل رہیں سب ہی
ورنہ کوئی ہونا نہیں دو چار میں ہونا

پتوں کی جھلک ہے کہیں شاخوں کی شباہت
الفاظ میں چلنا ہے کہ اشجار میں ہونا

دُنیا بھی مرے واسطے رکھتی ہے یہی کچھ
مجھ کو بھی پسند آئے گا دشوار میں ہونا

قیمت نہیں لگتی تو، ظفر، گھر ہی پلٹ جاؤ
بے فائدہ کیا گرمیِ بازار میں ہونا

☆

اک بار اُلجھ کر وہ دوبارہ سے اُلجھنا
دُنیا ، جو نہیں تھی ، اُسی دُنیا سے اُلجھنا

تقسیم کیے رکھنا وہ ٹکڑوں میں بدن کو
پھر ، اپنے ہی بکھرے ہوئے اعضا سے اُلجھنا

زنداں ہوا توڑ کے آنا وہ سرِ شام
اور ، رات گئے تک تنِ تنہا سے اُلجھنا

اُس پار اُترنے کی غرض تھی بھی اگر کچھ
تھا کس لیے پھر بیچ میں دریا سے اُلجھنا

ہٹ کر وہ کسی موجِ خموشی سے شب و روز
خود شور میں رہنا ، کسی غوغا سے اُلجھنا

اک عمر یہاں خود سے اُلجھنے میں گزاری
باقی ابھی کیا کچھ ہے بقایا سے اُلجھنا

ہونے کے برابر میں نہ ہونا اُسی لمحے
سونے کی طرف خواب تماشا سے اُلجھنا

ہر سمت اگر خاک ہی اُڑتی ہے یہاں پر
آساں ہے بہت صورتِ صحرا سے اُلجھنا

اک طرح کا سُلجھاو ، ظفر ، یہ بھی ہے شاید
آپس ہی میں اُلجھی ہوئی اشیا سے اُلجھنا

☆

وہی دریا تھا، مگر، اور ہی گہرائی میں تھا
فرق اب کے جو وہاں اپنی پذیرائی میں تھا

تازہ تر تھے وہ کسی اور کے چُومے ہُوئے ہونٹ
رنگ ایک اور بھی اُس شوخ کی رعنائی میں تھا

تھا بھی ہر لحظہ بدلتا ہوا منظر موجود
شہر سا یُوں بھی کوئی چشمِ تماشائی میں تھا

پھونک ڈالے خس و خاشاکِ محبت جس نے
اجنبیت وہ شرر اُس کی شناسائی میں تھا

پیش رفت ایسی اگر تھی بھی مری قابلِ دید
ایک انداز الگ بھی مری پسپائی میں تھا

بعض اوقات وہ مایُوس بھی کرتا تھا بہت
جو شریک آپ مری حوصلہ افزائی میں تھا

دشت میں جس سے ہُوئی ہو کوئی صُورت ایجاد
داغ ایسا بھی کہیں لالۂ صحرائی میں تھا

کُچھ تو پرہیز بھی لازم تھا اُن آنکھوں سے ہمیں
اور، کُچھ شک بھی ہمیں اُس کی مسیحائی میں تھا

تھے مرے چاروں طرف خواب و خیال اُس کے، ظفر
یعنی وہ آپ بھی شامل مری تنہائی میں تھا

☆

اپنے مشاغل سے یُوں آپ جو فرصت میں ہیں
ہم تو ابھی تک اسی چیز کی حیرت میں ہیں

میرے سبب سے ہُوئی قدر شناسی تو کُچھ
فائدہ کُچھ تو ہُوا، کُچھ تو سہولت میں ہیں

نغمۂ نفرت ہے کیوں ساری فضا میں رواں
اُن سے ذرا پُوچھنا، وہ جو محبت میں ہیں

کس لیے مانیں بُرا، سب ہمیں معلوم ہے
یہ بھی تو شامل بھی آپ کی عادت میں ہیں

رنگ ہمارا چڑھے کیسے یہاں آپ پر
آپ تو کب سے کسی اور ہی صحبت میں ہیں

اُس کی مذمت میں ہیں یُوں تو بیاناتِ دل
ساری دلیلیں، مگر، اُس کی حمایت میں ہیں

لاکھ سہی بے خبر، ساری خبر ہے اُسے
ہم پہ گزرتی ہے کیا، کون سی حالت میں ہیں

ہم سے ملا بھی نہیں، جو کہیں تھا بھی نہیں
اُس کے لیے ہیں اُداس، اور، حقیقت میں ہیں

اُس نے اُڑا بھی دیے غم کے غبارے، ظفر
ہم یہ سمجھتے رہے اُس کی حفاظت میں ہیں

☆

اس مرے جسم نے اب تک تو سنبھالی مری جاں
اندر آیا وہ مرے ، اور ، نکالی مری جاں

ایسا لگتا ہے کہ اس خاک و خواہش میں کوئی
واہمہ تھا مرا دل ، اور ، خیالی مری جاں

رہ نہ سکتا تھا کسی دھیان سے دوری میں یہ دل
ہو نہ سکتی تھی کسی خواب سے خالی مری جاں

مجھ تک آتی تھی کسی باغ سے اک تازہ ہوا
میرے چاروں طرف ایسی رہی جالی مری جاں

بھیک دینے کو رکا بھی تھا وہ شاید ، لیکن
بڑھ گئی آپ ہی آگے یہ سوالی مری جاں

سب سمجھ سے مری باہر ہیں تقاضے ان کے
ہے انوکھا مرا جی ، اور ، نرالی مری جاں

پاس ہوتے ہوئے اک دوسرے سے دور رہیں
صورتِ حال تو ہے یہ بھی مثالی ، مری جاں

برگ و بار اس پہ اگر آ نہیں سکتے ہیں تو پھر
کاٹ ہی ڈالنی بہتر ہے یہ ڈالی ، مری جاں

کیوں نہ دم توڑتی ، یک طرفہ محبت تھی ، ظفر
دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے تالی ، مری جاں

-☆-

شرم سے دور ، شرافت کے بغیر
رنج دیتا ہے وہ راحت کے بغیر

کبھی نکلے نہیں اس بزم سے ہم
ٹھیک سی خاطر و خدمت کے بغیر

ختم ہو سکتا ہے یوں بھی سب کچھ
یہ تباہی تھی قیامت کے بغیر

ہار کر بیٹھ گئے ایک طرف
کسی تردید و وضاحت کے بغیر

رابطہ ہی نہیں رکھتے کوئی
ساتھ ہوتے ہیں رفاقت کے بغیر

کچھ اثر ہی نہیں اس کا باقی
وہ خدا ہے کسی قدرت کے بغیر

کرنی پڑتی ہے خوشامد سب کی
کام ہوتا نہیں رشوت کے بغیر

مانتا ہی نہیں کوئی مجھ کو
میں نبی ہوں ، مگر ، امت کے بغیر

دل بھی محفوظ ہے ، عزت بھی ، ظفر
ہم بہت خوش ہیں محبت کے بغیر

-☆-

مصیبتوں کے مُضافات سے نکال دیا
جو خُود کو اُس کے طلسمات سے نکال دیا

فضا کو صاف کیا وہمِ عشق سے ہم نے
پھر، اپنے دائرۂ ذات سے نکال دیا

ہم اپنے رنج میں تھے، اس طرح سے چُپ رہ کر
جواب اُس کے سوالات سے نکال دیا

ہوائے وصل کہ اُمید دید ہو، دل کو
کبھی پُرانی رُسومات سے نکال دیا

بالآخر آ گئے ہم خُود ہی سامنے کُھل کر
اُسے بھی سارے حجابات سے نکال دیا

ذرا سی ہم نے کسی دن سے دُھوپ منہا کی
کوئی ستارہ کسی رات سے نکال دیا

بہار سے جو کسی پھول کو کیا باہر
تو ایک ابر کو برسات سے نکال دیا

قریب و دُور نہ تھا جس کا شائبہ بھی کہیں
وہ مطلب اُس نے مری بات سے نکال دیا

فساد اُس کا بڑھا میری سوچ میں جو، ظفر
تو اُس کو اپنے خیالات سے نکال دیا

☆

جھڑپ، اور، جھگڑا تو ہونا ہی تھا
محبت میں اتنا تو ہونا ہی تھا

کسی دُوسرے کا نہ ہوتا اگر
ہمارا تُمھارا تو ہونا ہی تھا

بالآخر تو کُھلنے تھے باتوں کے بھید
کسی دن اکٹھا تو ہونا ہی تھا

وہ نیت کا اتنا بُرا ہے اگر
طبیعت کا اچھا تو ہونا ہی تھا

چڑھی ہے جو سر کو ہوائے ہوس
کبھی میں نے بُوڑھا تو ہونا ہی تھا

غلط کام کرتے رہے ہیں تو پھر
کچھ اُس کا نتیجہ تو ہونا ہی تھا

جسے ہم نے ہونے دیا ایک بار
اُسے اب دوبارہ تو ہونا ہی تھا

اگر بارِ دُنیا اُٹھاتے نہ ہم
کسی نے اُٹھایا تو ہونا ہی تھا

محبت تو چوری کا گُڑ ہے، ظفر
یہ میٹھا زیادہ تو ہونا ہی تھا

☆

ملتا نظر آئے بھی تو حاصل نہیں کرنا
اس خواب میں اب اور اُسے شامل نہیں کرنا

آساں نہ سہی مرحلۂ حسرت ہستی
مشکل کو ، مگر ، اور بھی مشکل نہیں کرنا

اُس کے بھی ہو باغوں کی ہوا اُس کو مبارک
ہم نے بھی کبھی دشت کو اب دل نہیں کرنا

ناحق اُسے حق ہی نظر آتا ہے تو ہم نے
خود جا کے تو ہرگز اُسے قائل نہیں کرنا

ہو جائیں گے چپ چاپ شرافت سے الگ ہم
خود کو کسی طور اُس کے مقابل نہیں کرنا

اُس کے بھی سمندر کی وہ سُن گُن نہیں رکھنی
اپنا بھی سفینہ سرِ ساحل نہیں کرنا

اس شہر پہ اُترے ہیں عذاب اتنے کہ ہم نے
اب اپنی طرف سے کوئی نازل نہیں کرنا

ہم آپ ہی آ جائیں جو آڑے تو بھلا اور
کب تک کسی دیوار کو حائل نہیں کرنا

اس بزم میں ہم پر ہی ظفر فرض نہیں کچھ
جب اور کسی نے اُسے باطل نہیں کرنا

☆

شاید کسی موہوم اشارے پہ کھڑا ہوں
جیتا ہوں نہ مرتا ہوں ، کنارے پہ کھڑا ہوں

دروازہ ہے، اور، اُس سے لگی ہیں مری آنکھیں
دیوار ہے، اور، اُس کے سہارے پہ کھڑا ہوں

جلنے پہ بھی آمادہ ہوں، بجھنے کو بھی تیار
میں اپنی ہی قسمت کے ستارے پہ کھڑا ہوں

اب دیکھیے لے جائے کدھر، اور، کہاں تک
منہ زور ملاقات کے دھارے پہ کھڑا ہوں

ایسا ہے کہ سب کچھ ہے مرے پانو کے نیچے
لگتا ہے کہ میں اب بھی غبارے پہ کھڑا ہوں

منظر کوئی بے رامش و بے رنگ سہی میں
لیکن کسی خوش خواب نظارے پہ کھڑا ہوں

پہچانتے ہیں میرے ارادوں سے مجھے لوگ
ہوں ورنہ پرِ کاہ ، شرارے پہ کھڑا ہوں

استادہ رہا تو ہوں بہت پانو پہ اپنے
اب میں کسی اقرار تمھارے پہ کھڑا ہوں

بھاگا ہوں اگر کارِ محبت سے تو کہہ دو
قائم ہوں ، ظفر ، اور ، خسارے پہ کھڑا ہوں

☆

دور و نزدیک بہت اپنے ستارے بھی ہوئے
ہم کسی اور کے تھے ، اور تمھارے بھی ہوئے

خواب جیسا کوئی موسم تھا جب اُس نے مجھ کو
کچھ زبانی بھی کہا ، اور ، اشارے بھی ہوئے

ایک میں ہی نہ ہوا باغِ تماشا کا مکیں
میری نظریں بھی ہوئیں ، اور ، نظارے بھی ہوئے

عاجزی میں کہیں پیچھے سے نکل جاتا تھا
ورنہ میرے تو مقابل مرے دھارے بھی ہوئے

کچھ اُچھالے بھی ہوئے پھول زمیں سے کسی رات
آسمانوں سے کئی چاند اُتارے بھی ہوئے

یہ کسی اور طرح کی ہے سجاوٹ اُس کی
بال بکھرائے ہوئے بھی ہیں ، سنوارے بھی ہوئے

کبھی نکلے ہی نہیں اپنی حدوں سے باہر
خود ہی دریائے رواں ، خود ہی کنارے بھی ہوئے

شہر میں ساتھ کسی کے نہ بنا کر رکھی
دیکھتے دیکھتے دشمن وہ ہمارے بھی ہوئے

منکرِ خاص کبھی اُس کی خدائی کا ، ظفر
پہلے میں ایک ہوا ، پھر یہاں سارے بھی ہوئے

☆

ناچار اعتبار تمھارا ہی کرتے ہیں
پہلے نہیں ہوا تو دوبارہ ہی کرتے ہیں

ملتی کبھی تو کوئی پس و پیش کی خبر
کہتے نہیں ہیں کچھ وہ ، اشارہ ہی کرتے ہیں

آواز کے بغیر بھی ہوتی ہے اک صدا
اپنے تئیں ہم اُس کو پکارا ہی کرتے ہیں

گالی گلوچ ہے جو زد و کوب کے بجائے
سب میں وہ احترام ہمارا ہی کرتے ہیں

خوش ہیں کسی پہ اور نہ خفا ہیں کسی سے ہم
جیسا بھی ہو رہا ہے ، گزارہ ہی کرتے ہیں

دروازہ ہے تو اُس سے نکلنا ہی چاہیے
دیوار ہے تو اُس کو سہارا ہی کرتے ہیں

مرتے ہیں قسط وار جو ہم لوگ ، کم سے کم
کچھ بوجھ زندگی کا اُتارا ہی کرتے ہیں

اکثر زمیں کو ذرہ ہی کرتے رہے ، سو ، اب
سورج کو ایک بار ستارہ ہی کرتے ہیں

ممکن نہیں ہے ڈوب کے مرنا تو ، اے ظفر
ان گہرے پانیوں سے کنارہ ہی کرتے ہیں

☆

قیمت سے پرے، خواب خریدار سے ہٹ کر
بک جائیں گے، ہم گرمیِ بازار سے ہٹ کر

کٹ کر بھی مرا رابطہ موجود ہے تجھ سے
انکار میں کیا شے تھی وہ انکار سے ہٹ کر

دروازہ تو تھا ہی نہیں، البتہ مرے گرد
دیوار تھی ایک اور بھی دیوار سے ہٹ کر

میں ہوں تو بہت دور ہے مجھ سے مرا محور
تو ہے تو کہیں اپنے ہی آثار سے ہٹ کر

موجود تھی خود میرے لہو میں جھلک اس کی
میں دیکھ رہا تھا اسے دیدار سے ہٹ کر

سنتا ہوں کوئی نغمہ سماعت سے الگ بھی
کہتا ہوں کوئی بات میں اظہار سے ہٹ کر

بھوتوں سے یہاں پانو ہی غائب ہیں کسی کے
سر ڈھونڈ رہا ہے کوئی دستار سے ہٹ کر

اس حال میں کیا ہم پہ توجہ کوئی کرتا
ہم پھول کھلاتے رہے گلزار سے ہٹ کر

جاری ہے، ظفر، بلکہ مرے شعر کا ہر شو
اور، سارا سخن تھا مرے معیار سے ہٹ کر

-☆-

بھول بیٹھا تھا، مگر، یاد بھی خود میں نے کیا
وہ محبت جسے برباد بھی خود میں نے کیا

دنگ تھا ریت کے احوال سے آگاہی پر
پھر اسی ریت کو بنیاد بھی خود میں نے کیا

جال پھیلائے تھے جس کے لیے چاروں جانب
اس گرفتار کو آزاد بھی خود میں نے کیا

خواہشیں مجھ کو ڈراتی رہیں پہلے، اور، پھر
ان چڑیلوں کو پری زاد بھی خود میں نے کیا

نوچ کر پھینک دیے آپ ہی خواب آنکھوں سے
یوں دلِ شاد کو ناشاد بھی خود میں نے کیا

کام تیرا تھا، مگر، مارے مروت کے اسے
تجھ سے پہلے بھی، ترے بعد بھی خود میں نے کیا

شہر میں کیوں مری پہچان ہی باقی نہ رہی
اس خرابے کو تو آباد بھی خود میں نے کیا

ہر نیا ذائقہ چھوڑا ہے جو اوروں کے لیے
پہلے اپنے لیے ایجاد بھی خود میں نے کیا

انکساری میں مرا حکم بھی جاری تھا، ظفر
عرض کرتے ہوئے ارشاد بھی خود میں نے کیا

-☆-

خیال اندر خیال کرنا پڑے گا اُس کو
معاملہ حسبِ حال کرنا پڑے گا اُس کو

میں طائرِ خواب ہوں ، اگر مجھ کو پھانسنا ہے
تو جسم سارا ہی جال کرنا پڑے گا اُس کو

بہت وہ اہلِ کمال خود کو سمجھ رہا ہے
تو ایک یہ بھی کمال کرنا پڑے گا اُس کو

جواب درکار ہے تو کیسی انا پرستی
وہ جو بھی کچھ ہے ، سوال کرنا پڑے گا اُس کو

نہیں ہے سارا ہی کر گزرنے کی موج میں تو
کہیں کہیں ، خال خال کرنا پڑے گا اُس کو

نہیں رہی نقد کی اگر کوئی حیثیت ہی
تو مال کے بدلے مال کرنا پڑے گا اُس کو

اُسے ہی میری طرح کا ہونا ہے ، یا پھر اک دن
مجھے بھی اپنی مثال کرنا پڑے گا اُس کو

اگر محبت کو زندہ رکھنا ہی چاہتا ہے
تو میرا جینا مُحال کرنا پڑے گا اُس کو

میں سوچتے سوچتے ، ظفر ، تھک گیا ہوں آخر
مجھے یہیں پر نڈھال کرنا پڑے گا اُس کو

☆

باہر کے علاوہ ہے کہ اندر کے علاوہ
تصویر سی بنتی ہوئی منظر کے علاوہ

اک راستہ ہے بچھڑا ہوا اُس کے سفر سے
اک روشنی اُس ماہِ منوّر کے علاوہ

ایک آدھ مکیں اس میں اضافی بھی ہو جیسے
گھر میں کوئی گھر اور بھی ہے گھر کے علاوہ

پابند بھی ہوں میں ، مگر ، اب چاہیے مجھ کو
لمحہ کوئی اوقاتِ مقرّر کے علاوہ

رکھتا کوئی اُس کا بھی حساب اپنی طرف سے
کرتا رہا پرواز جو میں پر کے علاوہ

قسمت مری اوروں میں بھی ہو جاتی ہے تقسیم
ملتا ہے مجھے میرے مقدّر کے علاوہ

سارے ہی مرے واسطے ہیں واجبِ تعظیم
مطلوب ہے لیکن مجھے اکثر کے علاوہ

ہم پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تُو نے
کچھ تھا بھی جو تجھ میں ترے پیکر کے علاوہ

دشمن بھی جو مجھ کو ، ظفر ، انصاف سے دیکھیں
کچھ اور بھی ہوں اپنے برابر کے علاوہ

☆

یہ عمر گزرتی مرے منشا کے مطابق
ہوتی تری دنیا مری دنیا کے مطابق

کچھ عقل سے ہم کام اگر لیں تو بہر طور
دیوانگی ہو سکتی ہے صحرا کے مطابق

بس ڈوب کے مر جانے کی حسرت رہی سب کو
گہرائی نہیں تھی کہیں دریا کے مطابق

آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی ہے ، ورنہ
تصویر تماشا ہے تماشا کے مطابق

پھر بھی یہ کمی سی کوئی کیوں ہوتی ہے محسوس
ہر شے ہے اگر خواب تمنا کے مطابق

کیا ہو کسی گنتی میں یہاں پر دلِ خالی
جب جانچتے ہیں گھر کو بھی اشیا کے مطابق

اتنی بھی یہاں تندی و ترشی کا ہے کیا کام
ماحول کو رکھیے رُخِ زیبا کے مطابق

اس شہر سے اب کوئی شکایت نہیں مجھ کو
سب کچھ ہے مری ہستیِ رُسوا کے مطابق

کیسی یہ مری سعیِ سخن ہے ، ظفر ، اب کے
پہلے کے مطابق نہ دوبارہ کے مطابق

-☆-

اہلِ دنیا سے تو اتنا ربط کیا رکھتے تھے ہم
اپنے اندر ہی کوئی محشر بپا رکھتے تھے ہم

تیسرے کی بھی قسم دیتے نہیں ، ورنہ یہاں
ایک اپنے ساتھ کوئی دوسرا رکھتے تھے ہم

موڑتی تھی رُخ ہمارا چاہتی تھی جس طرف
اس فضا میں ایک اپنی بھی ہوا رکھتے تھے ہم

کیا زمانہ تھا کہ قبل از شام ہی ، اُس کے سمیت
ساری اشیائے ضرورت اپنی لا رکھتے تھے ہم

کام سارا کر بھی لیتے تھے مگر ، کیا جانے کیوں
دوسرے دن کے لیے بھی کچھ اُٹھا رکھتے تھے ہم

شور ہوتا تھا ہمارا اور ہی انداز کا
گھر میں رہ کر بھی اسے کیا بے صدا رکھتے تھے ہم

رہ گیا ہے اک خیالِ خام ہی اُس کی جگہ
اپنے چاروں سمت جو اک خواب سا رکھتے تھے ہم

رابطہ کچھ بھی نہیں تھا اُس کے ساتھ اپنا ، مگر
باوجود اس کے بھی کوئی سلسلہ رکھتے تھے ہم

دن بھر اُس پر ہی بسر اوقات ہوتی تھی ، ظفر
رات کا جو ایک ٹکڑا سا بچا رکھتے تھے ہم

-☆-

اس دل کے اندھیرے ہیں تری رات سے آگے
اور، خواب مُلاقات سے آگے

اک شہر سا آباد ہے دل میں مرے، لیکن
میں جا نہ سکا اُس کے مُضافات سے آگے

لہراتے ہیں مُنھ بند شگوفے جو لہو میں
جا کر یہ رُکیں گے ترے باغات سے آگے

جاگے مرے اندر ترے منظر، ترے موسم
دیکھوں کبھی اس طرفہ طلسمات سے آگے

رفتار کی اک دھول سی اُڑنے لگی ہر سُو
ہیں سارے جوابات سوالات سے آگے

رہتا نہیں یُوں ہی تو زمانہ ہمہ تن گوش
ہوتی ہے کوئی بات ہر اک بات سے آگے

مجھ کو جو یہاں کُچھ بھی دکھائی نہیں دیتا
ہے میری نظر صورتِ حالات سے آگے

رہ جاتی ہے اک تازہ ہوا جس کے پیچھے
بادل سے برس جاتے ہیں برسات سے آگے

رہ جاتا ہُوں خود سے بھی جو پیچھے، ظفر، اکثر
میں سوچتا رہتا ہُوں خیالات سے آگے

★

مہربانی نہ عنایت کے لیے دیکھتا ہُوں
اُس کو آنکھوں کی سہولت کے لیے دیکھتا ہُوں

دیکھنا اُس کو تو اک بات ہے خُود اپنی جگہ
مَیں اُسے رنج نہ راحت کے لیے دیکھتا ہُوں

اکثر اوقات تو ایسا ہے کہ مَیں اُس کی طرف
دیکھ سکنے کی اجازت کے لیے دیکھتا ہُوں

مَیں تو حیران ہُوں پہلے ہی سے اتنا، لیکن
اُس طرف اور بھی حیرت کے لیے دیکھتا ہُوں

جیسے بیمار سی رہتی ہیں وہ آنکھیں دن رات
جیسے مَیں اُن کی عیادت کے لیے دیکھتا ہُوں

اک مُصیبت سے نکل آؤں تو اُس کی جانب
پھر کسی تازہ مُصیبت کے لیے دیکھتا ہُوں

کیا خبر اُس کو کہ نیت مری کیا ہوتی ہے
مَیں بظاہر تو عقیدت کے لیے دیکھتا ہُوں

رائگاں جینے کی حالت سے نکلتا ہُوں کبھی
اور، مر جانے کی مُہلت کے لیے دیکھتا ہُوں

مَیں اگر اُس کی طرف دیکھ رہا ہُوں تو، ظفر
اپنے حصے کی محبت کے لیے دیکھتا ہُوں

★

ہجوم جمع ہوا اُس کو دیکھنے کے لیے
بس ایک مَیں ہی نہ تھا اُس کو دیکھنے کے لیے

وہ اک زمانے کے بعد آ رہا تھا جب واپس
تو شہر ٹوٹ پڑا اُس کو دیکھنے کے لیے

بکھر چکا تھا فسوں کوئی اُس کی راہوں پر
بدل گئی تھی فضا اُس کو دیکھنے کے لیے

وہ چل رہا تھا کسی اپنے ہی خیال میں گم
رُکی ہوئی تھی ہوا اُس کو دیکھنے کے لیے

زمیں تھی پانو کے نیچے نثار، اور، سر پر
تُلی ہوئی تھی گھٹا اُس کو دیکھنے کے لیے

وہ آتے آتے اگر رُک گیا کہیں، کسی دن
تو ایک شور رہا اُس کو دیکھنے کے لیے

یہ روشنی ہے اسی رنگِ رُخ کی رکھوالی
یہ راستے ہیں سدا اُس کو دیکھنے کے لیے

کچھ اس طرح سے کہ آنکھوں میں اُس کو بھر لایا
یہاں سے جو بھی گیا اُس کو دیکھنے کے لیے

وہ کوئی چیز ہی ایسی ہے دیدنی کہ، ظفر
کھڑے تھے شاہ و گدا اُس کو دیکھنے کے لیے

-☆-

رونقِ راہ گھٹی ہے نہ تماشا کم ہے
شہر میں سب سے زیادہ ترا ہونا کم ہے

رات روشن ہے ترے بعد بھی آبادی کی
ایک حصے میں، مگر، جیسے اُجالا کم ہے

یُوں تو ہر چیز ہمارے لیے کم ہے، لیکن
ایک شے وہ ہے کہ جو سب سے زیادہ کم ہے

اب تو منظر بھی کوئی اور ہے، موسم بھی کچھ اور
یعنی اس آب و ہوا میں ہمیں رہنا کم ہے

اس میں کچھ اور بھی ہے جس سے چھلکتا ہے یہ دل
ورنہ ظاہر میں تو اب تیری تمنا کم ہے

جس نے دیکھے ہوں سمندر تری آنکھوں میں رواں
ڈوبنے کے لیے اُس شخص کو دریا کم ہے

مَیں نے بس ہونٹ بھگونے کی لگائی تھی اُمید
تُو نے شاید یہی سمجھا کہ یہ پیاسا کم ہے

ایک یہ گوشۂ دل ہم کو بہت ہے، ورنہ
اہلِ دُنیا کے لیے آج بھی دُنیا کم ہے

جب بھی وہ آئے، کہ مَیں خود ہی سُلگتا ہوں، ظفر
اُس کے رستے پہ دیا مَیں نے جلایا کم ہے

-☆-

کیا خبر سلسلۂ ناز ہی بدلا ہُوا ہو
واپسی پر ترا انداز ہی بدلا ہُوا ہو

اجنبی اور نئی آب و ہوا ہو ہر سمت
موسمِ چشمِ فسوں ساز ہی بدلا ہُوا ہو

عکس اپنا تری آنکھوں میں کبھی دیکھنے جائیں
اور، آئینۂ الفاظ ہی بدلا ہُوا ہو

طرز و اُسلوب میں اعلانِ عداوت ہو کچھ اور
دل کی سلوٹ میں چھپا راز ہی بدلا ہُوا ہو

تُو اُترتا ہو کسی اور ہی چھت پر، یعنی
تیرا پیرایۂ پرواز ہی بدلا ہُوا ہو

منتظر ہو کسی انجامِ تمنا کا یہ دل
اور، ترا نقشۂ آغاز ہی بدلا ہُوا ہو

یہ بھی ہو سکتا ہے، ویسے نہ رہے ہوں خُود بھی
اپنا یہ رنگِ تگ و تاز ہی بدلا ہُوا ہو

کوئی پسپائی کی صورت نکل آئے شاید
یعنی اپنا دلِ ناراض ہی بدلا ہُوا ہو

یہ بھی ممکن ہے کہ اس خوابِ خموشی میں، ظفر
اپنا اندازۂ آواز ہی بدلا ہُوا ہو

☆

جہاں کھڑا ہوں یہیں ہی وہاں سے آگے ہے
زمین میرے لیے آسماں سے آگے ہے

ابھی تو فیصلہ ہونا ہے یہ کہ یہ دُنیا
کہاں سے پیچھے ہے آخر کہاں سے آگے ہے

ہوا عقب کی ہے، اور کچھ نظر نہیں آتا
کہ گردِ راہ جو ہے کارواں سے آگے ہے

کیا تھا منع جہاں پیش رفت سے اُس نے
ابھی سے اپنا قدم اُس نشاں سے آگے ہے

ابھی تو اس کی کچھ وضاحت ہی نہیں ممکن
کہ شاعری تو زبان و بیاں سے آگے ہے

حریمِ ناز تک اُس کے میں آ تو پہنچا ہوں
اگرچہ جانتا ہوں وہ یہاں سے آگے ہے

وہیں سے آتے ہیں موسم بدل بدل کے ابھی
وہ باغ جو مرے خوابِ گراں سے آگے ہے

پناہ چاہتے ہیں مُستقل جہاں دونوں
سو، وہ جگہ کسی کنجِ اماں سے آگے ہے

مرا وجود کہ پسماندہ اس قدر ہے، ظفر
ابھی تو یہ مرے وہم و گماں سے آگے ہے

☆

دیکھو تو کچھ زیاں نہیں کھونے کے باوجود
ہوتا ہے اب بھی عشق نہ ہونے کے باوجود

شاید یہ خاک میں ہی سمانے کی مشق ہو
سوتا ہوں فرش پر جو بچھونے کے باوجود

کرتا ہوں نیند میں ہی سفر سارے شہر کا
فارغ تو بیٹھتا نہیں سونے کے باوجود

ہوتی نہیں ہے میری تسلّی کسی طرح
رونے کا انتظار ہے رونے کے باوجود

پانی تو ایک عمر سے مجھ پر ہے بے اثر
میلا ہوں جیسے اور بھی ، دھونے کے باوجود

بوجھل تو میں کچھ اور بھی رہتا ہوں رات دن
سامانِ خواب رات کو ڈھونے کے باوجود

تھی پیاس تو وہیں کی وہیں اور میں وہاں
خوش تھا ذرا سے ہونٹ بھگونے کے باوجود

یہ کیمیاگری مری اپنی ہے ، اس لیے
میں راکھ ہی سمجھتا ہوں سونے کے باوجود

ڈرتا ہوں پھر کہیں سے نکالیں نہ سر ، ظفر
میں اُس کو اپنے ساتھ ڈبونے کے باوجود

-☆-

ٹوٹتی کیوں نہیں ، دیوار کے اندر کیا ہے
ہے جو انکار تو انکار کے اندر کیا ہے

خلق سہمی ہوئی پھرتی ہے گلی کوچوں میں
آخر اس ابرِ گراں بار کے اندر کیا ہے

لوگ اک دوسرے سے بات چھپاتے کیوں ہیں
بولتے کیوں نہیں اخبار کے اندر کیا ہے

کچھ تو ہے اور بھی پیچیدہ ہوا سے ہٹ کر
دیکھنا چاہیے اشجار کے اندر کیا ہے

دل جو ہے اتنا پُر اُمید تو کیوں ہے ، ورنہ
ہے تو اصرار ہی ، اصرار کے اندر کیا ہے

سر پہ دیوان اُٹھائے ہوئے پھرتے بھی ہیں ، اور
جانتے بھی نہیں طومار کے اندر کیا ہے

خود ہی کھل جائے گا پوشیدہ شرر کے دم سے
نہیں معلوم جو انبار کے اندر کیا ہے

مال بکتا نہیں کیوں اتنے خریداروں میں
یعنی اس گرمیِ بازار کے اندر کیا ہے

زیب و زینت ہے فقط ظاہری ، ورنہ تو ، ظفر
آپ ہی کہیے ان اشعار کے اندر کیا ہے

-☆-

بات جب ہے جو کسی کی بھی رسائی ہوئی ہو
خواہ وہ راہ تو اپنی ہی دکھائی ہوئی ہو

اُس کو دیکھیں بھی نہیں، اُس کو پکاریں بھی نہیں
اور، وہ شکل اگر دل میں سمائی ہوئی ہو

رنج ہو گا نہیں کس طرح گنوا کر اُس کو
وہ محبت جو کبھی ہم نے کمائی ہوئی ہو

انتظار اُس کا ہے، جس رنگ میں آئے، بے شک
بے رُخی ہی کوئی چہرے پہ سجائی ہوئی ہو

نظرانداز ہوئے ہوں کسی بنیاد پہ ہم
کہیں تقسیم مُروّت کی مٹھائی ہوئی ہو

کیسا لگتا ہے اُسے تازہ محبت کا لباس
ہم بھی ہوتے جہاں وہ جلوہ نمائی ہوئی ہو

تُو نے تو خیر مزہ ہی نہیں چکھا اُس کا
پُوچھنا اُس سے بھی جس کی جُدائی ہوئی ہو

کوئی تو شہر میں یُوں ہاتھ اُٹھا کر کہتا
تیرے ہاتھوں جو کسی کی ہی بھلائی ہوئی ہو

ایک ہی بات ہے جو اُس کو سُنائیں گے، ظفر
چاہے سو بار اُسے پہلے بھی سُنائی ہوئی ہو

☆

فقط الفاظ ہیں، الفاظ کی تاثیر غائب ہے
کہ سب پتے ہی پتے ہیں یہاں، انجیر غائب ہے

عجب ہی طرح کی یہ صورتِ احوال ہے پیدا
کہ دیوانہ تو حاضر ہے، مگر، زنجیر غائب ہے

کہیں فرشِ ہوا پر خواب کے ٹکڑے نہیں ملتے
کہیں دیوارِ دل سے آپ کی تصویر غائب ہے

مزہ ہی کیا ہے جب تنگ ہو نہ کوئی پوچھنے والا
کہ اک مدّت سے وہ دستِ گریباں گیر غائب ہے

ہدف بھی کچھ نہیں تھا، اور، جلدی بھی نہ تھی ہم کو
مگر، خالی کماں ہی رہ گئی ہے، تیر غائب ہے

زبانی جمع و خرچ اب سِکّۂ عہدِ رواں ہو گا
اگر لکھے ہُوئے الفاظ کی توقیر غائب ہے

ستارے بھی وُہی ہیں، اور، گردش بھی وُہی، لیکن
انھی کے درمیاں سے اک مری تقدیر غائب ہے

کبھی میں خُود قفس میں قید ہو کر پھڑپھڑاتا ہُوں
کسی لمحے مرے فتراک سے نخچیر غائب ہے

بیاضِ آرزو کی اب، ظفر، صورت ہے کچھ ایسی
کہیں صفحہ نہیں ملتا، کہیں تحریر غائب ہے

☆

دل کے اندر جی سکتی ہے، مر سکتی ہے
خواہش خود مختار ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے

میں نے کھول دیا ہے جتنا سا دروازہ
ساری دنیا اب اس میں سے گزر سکتی ہے

چہروں کی چادر سی بچھا رکھی ہے میں نے
اس میں سے کوئی صورت بھی اُبھر سکتی ہے

جتنا جتنا جمع کیا تھا میں نے جس کو
اب وہ ذات کسی بھی وقت بکھر سکتی ہے

گری ہوئی مخلوق بھی اٹھ سکتی ہے کسی دن
چڑھی ہوئی ندی بھی کبھی اُتر سکتی ہے

تبدیلی اچھی بھی آ سکتی ہے مجھ میں
حالت ہے یہ، کسی بھی روز سنور سکتی ہے

چاروں سمت چھلکنے لگ جائے رہ رہ کر
آنکھ اس کے منظر سے اتنی بھر سکتی ہے

ایک مسافر کی صورت میں میری محبت
چلتے چلتے تھک جائے تو ٹھہر سکتی ہے

میں بھی، ظفر، ہر بات سے منکر ہو سکتا ہوں
وہ بھی اگر چاہے تو صاف مکر سکتی ہے

☆

پرانی بات کا کوئی نیا مفہوم لینا ہے
اسی معلوم سے کچھ رنگ نامعلوم لینا ہے

سنا کرتا ہوں اور میری تسلی ہی نہیں ہوتی
تری آواز کو میں نے کسی دن چوم لینا ہے

خیالی سی کوئی تصویر لوٹاتی ہے تجھ کو، اور
تری تحویل سے واپس دلِ محروم لینا ہے

کبھی یوں ہے کہ پروا ہی نہیں رکھنی ہے آپس میں
کبھی اک دوسرے کو لازم و ملزوم لینا ہے

کبھی سر سے گزر جاتی ہے اس کی بات بھی اپنے
کبھی اس سے اشارہ ہی کوئی موہوم لینا ہے

یہاں پر چھوڑنا ہے نقش ناموجود ہی سارا
نشاں اپنا کہیں سے اور بھی معدوم لینا ہے

نہیں احساں اٹھانا اب کسی بھی دینے والے کا
جو لینا ہے تو اپنا ہی کوئی مقسوم لینا ہے

کوئی حد آپ نے بھی دیکھنی ہے ظلم کی اپنے
اگر ہم سے حسابِ خاطرِ معصوم لینا ہے

ظفر، اک نقطہ ہے اس دہر میں اُس کا نہ ملنا بھی
کوئی موسم ہو، اس نقطے میں ہم نے جھوم لینا ہے

☆

کس طرف ، اور ، کہاں آگے ہے
یہ جو ہونے کا نشاں آگے ہے

رُک گئی ہے مری آنکھوں میں یہ رات
خواہشِ خواب رواں آگے ہے

صرف سودائے تجارت ہے ابھی
کاہشِ سُود و زیاں آگے ہے

وہم ہے اُس کی محبت کا ابھی
کہیں نفرت کا گُماں آگے ہے

اپنی توفیق یہی تھی سرِ دست
آگ حاضر ہے ، دُھواں آگے ہے

اک جہاں اور بھی ہو گا سرِ راہ
وہ عیاں ہو کہ نہاں ، آگے ہے

رنگِ دہشت ہے یہاں چاروں طرف
اور ، کہیں جائے اَماں آگے ہے

رہ گیا ہُوں کہیں پیچھے ، مجھ سے
میرا نام اور نشاں آگے ہے

شرط ہے صبر سے سُننا کہ ، ظفرؔ
بات کرتا ہُوں ، بیاں آگے ہے

☆

نظر سے دُور وہ رہنا ، نظر بھی آ جانا
خبر سی رکھتے ہُوئے بے خبر بھی آ جانا

چھپے بھی رہنا کبھی اُس کا سات پردوں میں
کبھی نکل کے سرِ رہگذر بھی آ جانا

یہاں تک آ ہی گیا ہے اگر تو اُس کے لیے
زیادہ دُور نہیں راہ پر بھی آ جانا

ہم اپنے آپ میں ہوتے نہیں کسی لمحے
کبھی ہماری طرف بے خبر بھی آ جانا

تُمھارے اپنے ہیں سب سلسلے ، سبھی سمتیں
تم آؤ تو سہی آخر ، جدھر بھی آ جانا

رکھی ہُوئی ہو جہاں جان سی ہتھیلی پر
وہاں بجا ہے محبت میں ڈر بھی آ جانا

ہوائے دشتِ سیلابِ خواب کا اب کے
عجب نہیں ہے یہاں دربدر بھی آ جانا

ہم اپنے عیب ہی اُس سے کبھی چھپا سکتے
ہمارے بس میں نہ تھا یہ ہُنر بھی آ جانا

ظفرؔ ، بُری نہیں آوارگی ، مگر ، پھر بھی
کبھی اِدھر سے جو گزرو تو گھر بھی آ جانا

☆

جتنا حاصل تھا ہمیں اُس سے سوا چھوڑ دیا
زندگی بھر کا کہا ، اور ، سُنا چھوڑ دیا

کس لیے آخری سجدے کو بچا کر لے آئے
نقشِ پا آپ کا رستے میں پڑا چھوڑ دیا

مطلعِ صبح سے محروم رہے خود ہی وہاں
تھا جہاں پر ، سو ، وہیں بندِ قبا چھوڑ دیا

اپنی نخوت میں کیا ترکِ سخن اُس سے الگ
دیکھنا اُس کی طرف ہم نے جُدا چھوڑ دیا

مجھے اُس وقت ضرورت تھی زیادہ اُس کی
اُس نے جس مرحلے پر ساتھ مرا چھوڑ دیا

گھر سے ہی جب نکل آئے تو اب اس کی کیا فکر
ہم نے اسباب میں کیا رکھا ہے ، کیا چھوڑ دیا

نشہ کرتے تھے کبھی دیکھتے رہنے کا اُسے
سو بھی ، اک عمر ہوئی ، چھوڑ دیا ، چھوڑ دیا

خود کو پابندِ محبت بھی نہیں رکھتے ہم
جب پڑے تنگ ، طبیعت کو کھلا چھوڑ دیا

وحشتِ خلق ہی اتنی تھی ہمارے ہر سمت
ہم نے گھبرا کے ، ظفر ، خوفِ خدا چھوڑ دیا

☆

محبت کا اعلان کرنا پڑا
ہمیں اُس کو حیران کرنا پڑا

کئی روز خود بھی رہے منتشر
اُسے بھی پریشان کرنا پڑا

بہت کم منافعے کی خاطر ہمیں
بہت سارا نقصان کرنا پڑا

کسی اور سے بھی ہوئی سازباز
کوئی اور سامان کرنا پڑا

بدلنا پڑا منظرِ ماہ و سال
تماشے کو طوفان کرنا پڑا

کبھی دشت میں در بناتے رہے
کبھی دل کو دالان کرنا پڑا

جو سب سے بڑا کفر تھا ، ایک دن
اُسے اپنا ایمان کرنا پڑا

طبیعت تو تھی اپنی مشکل پسند
مگر ، کام آسان کرنا پڑا

کہاں جا کے اب خاک اُڑاتے ظفر
بدن کو بیابان کرنا پڑا

☆

یہ بھی ہو سکتا ہے باتیں کبھی مانے ہوئے ہوں
اور، ہم اصل میں کچھ اور ہی ٹھانے ہوئے ہوں

کیا خبر آپ کی آنکھوں میں جو آباد ہے شہر
چند روز اُس میں ہمارے بھی ٹھکانے ہوئے ہوں

جو سلوک آپ کا پہلے تھا سو رہنا ہے وہی
آپ بیگانے رہے ہوں کہ یگانے ہوئے ہوں

طفلِ مکتب ہیں وہی آپ کے آگے ہم تو
اپنے میدان میں جتنے بھی سیانے ہوئے ہوں

ہم نے ہر کام شرافت سے کیا ہے، ورنہ
اپنے مشہور تو جیسے بھی فسانے ہوئے ہوں

بس، الفاظ بھی پہچان ہے ایک اپنی الگ
آپ جتنا بھی زیادہ ہمیں جانے ہوئے ہوں

کچھ نہ کچھ تو اثر اپنا بھی رہے گا باقی
ہم کو گزرے ہوئے جتنے بھی زمانے ہوئے ہوں

باوجود اس کے حفاظت کی ضمانت کیا ہے
آسماں کا بھی یہ تمبو کہیں تانے ہوئے ہوں

ہر طرف اب تو وہاں دھول ہی اُڑتی ہے ظفر
جابجا ہم نے جہاں پھول کھلائے ہوئے ہوں

-☆-

ہم نے آواز نہ دی برگ و نوا ہوتے ہوئے
اور، ملنے نہ گئے اُس کا پتا ہوتے ہوئے

آنکھ کے ایک اشارے سے کیا گُل اُس نے
جل رہا تھا جو دیا اتنی ہوا ہوتے ہوئے

ایک پتا سا لرزتا ہوں سرِ شاخِ گماں
اپنے ہر سو کوئی طوفانِ بلا ہوتے ہوئے

چل رہے ہوتے ہیں دھارے کئی دریا میں، سو، ہم
سب میں شامل بھی رہے سب سے جُدا ہوتے ہوئے

وقت پر آ کے برس تو گئے بادل، لیکن
دیر ہی لگ گئی جنگل کو ہرا ہوتے ہوئے

ہم بھلا دادِ سخن کیوں نہیں چاہیں گے کہ وہ
آپ تعریف کا طالب ہے خدا ہوتے ہوئے

کچھ ہمیں بھی خبر اس کی نہ ہوئی خاص کہ ہم
کیا سے کیا ہوتے گئے، اصل میں کیا ہوتے ہوئے

بات کا اور بھی ہو سکتا ہے مطلب، اور، پھر
لفظ تبدیل بھی ہوتا ہے ادا ہوتے ہوئے

کیا زمانہ ہے کہ اس گنبدِ بے در میں، ظفر
اپنی آواز کو دیکھا ہے فنا ہوتے ہوئے

-☆-

میرے جانے، ترے آنے پہ نہیں ہے موقوف
دوستی ملنے ملانے پہ نہیں ہے موقوف

ختم ہو سکتا ہے یہ بھی جو میسّر ہے مجھے
تجھے کھونا تجھے پانے پہ نہیں ہے موقوف

تیرے ہوتے ہُوئے بھی رہتا ہے دل بوجھل سا
کچھ اُداسی ترے جانے پہ نہیں ہے موقوف

ہو چکے ہیں کئی رونے کے طریقے دریافت
گریہ اب اشک بہانے پہ نہیں ہے موقوف

دُور سے چُوم لیا کرتی ہیں آنکھیں اُس کو
لمس کچھ ہاتھ لگانے پہ نہیں ہے موقوف

خُود سمجھدار ہے، اندازہ لگا سکتا ہے
بات بھی اُس کو بتانے پہ نہیں ہے موقوف

یہ تو آباد ہی رہتا ہے خزاں ہو کہ بہار
گھر محبت کا بسانے پہ نہیں ہے موقوف

رت نئے خواب میں ہوتا ہے بسیرا دل کا
جو کسی ٹھور ٹھکانے پہ نہیں ہے موقوف

اب بھی ہو سکتے ہیں دریوزہ گرِ وصل ظفر
یہ کسی خاص زمانے پہ نہیں ہے موقوف

☆

نفرت ہے کہ نخرا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم
کیا اُس کا ارادہ ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

باہر سے تو ایسا ہے کہ بس دیکھتے رہیے
اندر سے وہ کیسا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

پانی کی چمک ریت میں بھی ہوتی ہے اکثر
ہے دشت کہ دریا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

دراصل تو اس میں ابھی آئے ہی نہیں ہم
کیسا یہ زمانہ ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

ہیں پھول فلک پر تو درختوں پہ ستارے
یہ کون سی دُنیا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

ممکن ہے کہ معلوم بھی ہو جائے کسی دن
فی الحال تو لگتا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

پھیلاؤ تو پانی کا بہت دُور تلک ہے
گہرائی میں کتنا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

ہر شے مجھے معلوم بھی ہو سکتی ہے، لیکن
مُنہ سے یہی کہنا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

یہ جامۂ معنی جو، ظفر، پہنے ہُوئے ہیں
سیدھا ہے کہ اُلٹا ہے، ابھی کچھ نہیں معلوم

☆

باہر حساب تھا کبھی اندر حساب تھا
جب کر چکے تو سب کا برابر حساب تھا

اندازہ کیا وہاں یہ لگاتا کوئی کہ وہ
میرے شمار و شرح سے باہر حساب تھا

تفصیل کوئی اور تھی ترتیب اور کچھ
تیرے مرے حساب سے ہٹ کر حساب تھا

اُس کے بغیر ہی رہی ساری لکھت پڑھت
ہم بھی وہاں نہیں تھے جہاں پر حساب تھا

لکھا ہُوا تھا میں نے بھی شاید یہیں کہیں
لیکن اُسے تو سارا ہی ازبر حساب تھا

جو کچھ لیا دیا تھا کبھی ہم نے بیش و کم
اُس کے مقابلے میں فروتر حساب تھا

پیمائشیں تھیں ، زاویے تھے ، اور ، دائرے
کہتے تھے جس کو حُسن ، سراسر حساب تھا

اعداد خوشگلوں کی طرح کھِل رہے تھے ، اور
کچھ اُس کی گفتگو سے معطّر حساب تھا

اپنا ہی کوئی ذکر نہیں تھا جہاں ، ظفرؔ
کھاتے کھلے ہوئے تھے وہاں ، ہر حساب تھا

☆

آگ پکڑی ہے تو شعلہ سا لپکنے لگے ہم
ہو گئے راکھ تو کچھ اور چمکنے لگے ہم

اپنا موسم تو نہیں تھا یہ ٹپکنے کا ، مگر
شاخِ دُنیا پہ بہُت پہلے ہی پکنے لگے ہم

باغِ ہستی کی ہوا میں تھی کُچھ ایسی تاثیر
چار دن سانس لیا اور بہکنے لگے ہم

دل کے مانند رہے جس کی طلب میں خاموش
کبھی آتے اُسے دیکھا تو دھڑکنے لگے ہم

اپنی رفتار تمنّا تو وُہی تھی ، لیکن
مہرباں وہ نظر آیا تو جھجکنے لگے ہم

اُس کی اِک دید سے کرتے رہے روشن آنکھیں
پھر ہُوا یُوں کہ اُسے دیکھ نہ سکنے لگے ہم

سوچنا ، اور ، غلط سوچتے رہنا ہر وقت
یہ مشقّت ہی کُچھ ایسی ہے کہ تھکنے لگے ہم

اکثر اوقات مُسلسل ہی رہے ہیں پایاب
اور ، کسی رات کناروں سے چھلکنے لگے ہم

نظرانداز ہوئے گھر میں ہی اپنے تو ، ظفرؔ
در و دیوار سے ناچار جھلکنے لگے ہم

☆

اُس کی بابت کبھی سوچا ہی نہیں کرتے ہم
جیسے اب اُس کی تمنا ہی نہیں کرتے ہم

وہ نظر آنے کی کوشش تو بہت کرتا ہے
آنکھ اُٹھا کر اُسے دیکھا ہی نہیں کرتے ہم

منتظر رہتا ہے وہ روز ہمارا شاید
بے غرض آتے ہیں ، پروا ہی نہیں کرتے ہم

جیسے وہ چاہتا تھا ، ہو گئے ہم ویسے ہی
اب کسی بات پہ جھگڑا ہی نہیں کرتے ہم

کون سا اُس نے بھلا سُن کے چلا آنا ہے
اس لیے اُس کو پکارا ہی نہیں کرتے ہم

ہے محبت میں تو ظاہر بھی کبھی کرتا وہ
اب تو خیر اس کا تقاضا ہی نہیں کرتے ہم

خُوئے تسلیم ہمیں زیب تو دیتی ہے ، مگر
یہ وہ جامہ ہے کہ پہنا ہی نہیں کرتے ہم

کچھ پہنچتا ہے کہیں شور ہمارا کہ نہیں
کوئی آواز تو پیدا ہی نہیں کرتے ہم

عشق سب کچھ نہیں ، عزت بھی کوئی شے ہے ، ظفر
یہ سمجھتے بھی ہیں ، غوغا ہی نہیں کرتے ہم

-☆-

باہر کے رنگ چھوڑ کے گھر واپس آئے گا
بے شک چلا گیا ہے ، مگر ، واپس آئے گا

کوئی تو فرق اُس میں پڑا ہو گا بیش و کم
وہ اور اور ہو گا اگر واپس آئے گا

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ
آخر کہاں گیا ہے ، کدھر واپس آئے گا

ملتی ہے ایک رات کی مہلت یہاں فقط
جو رات کو گیا ہے سحر واپس آئے گا

بن ٹھن کے عشق جائے گا پھر اس گلی میں ، اور
اُلٹے ہی پانو خاک بسر واپس آئے گا

پلٹیں گے جلد شہر میں ، ہجرت جنھوں نے کی
کاٹا ہُوا ہر ایک شجر واپس آئے گا

کتنی ہی عمر بے ہنری میں گزار دی
اس آس میں کہ اپنا ہنر واپس آئے گا

اس بار جس سفر پہ میں نکلا ہوں ، دیکھنا
میرے بجائے رختِ سفر واپس آئے گا

وہ واپس آ کے جا بھی چکا ہے ، مگر ، ظفر
تُم دیکھنا کہ بارِ دگر واپس آئے گا

-☆-

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھیں ہوں، تماشا ہی نہ ہو
راس آنے لگے ہم کو تو یہ دنیا ہی نہ ہو

کہیں نکلے کوئی اندازہ ہمارا بھی غلط
جانتے ہیں اُسے جیسا کہیں ویسا ہی نہ ہو

ہو کسی طرح سے مخصوص ہمارے ہی لیے
یعنی جتنا نظر آتا ہے وہ اُتنا ہی نہ ہو

ٹکٹکی باندھ کے مَیں دیکھ رہا ہوں جس کو
یہ بھی ہو سکتا ہے وہ سامنے بیٹھا ہی نہ ہو

وہ کوئی اور ہو جو ساتھ کسی اور کے ہے
اصل میں تو وہ ابھی لوٹ کے آیا ہی نہ ہو

خواب در خواب چلا کرتا ہے آنکھوں میں جو شخص
ڈھونڈنے نکلیں اُسے اور کہیں رہتا ہی نہ ہو

چمک اُٹھا ہو ابھی رُوئے بیاباں اک دم
اور، یہ نظارہ کسی اور نے دیکھا ہی نہ ہو

کیفیت ہی کوئی پانی نے بدل لی ہو کہیں
ہم جسے دشت سمجھتے ہیں وہ دریا ہی نہ ہو

مسئلہ اتنا بھی آسان نہیں ہے کہ ظفر
اپنے نزدیک جو سیدھا ہے وہ اُلٹا ہی نہ ہو

☆

تھا اپنے ہی اندر کے اشارے سے نکلنا
پانی کا اُچھل کر وہ کنارے سے نکلنا

معمول کا منظر ہے کچھ اپنے لیے اب تو
ہر شام ستارے کا ستارے سے نکلنا

ممکن جو نہیں تھا، سو ہُوا اب وُہی ممکن
اک نقشِ تماشا کا نظارے سے نکلنا

درکار ہے اس کے لیے ایک اور سہارا
آساں بھی نہ تھا اتنا سہارے سے نکلنا

تھا عرصۂ حیرت سے گزرنا ہمیں مشکل
اور، اُس کے لیے دھیان ہمارے سے نکلنا

وہ بھی کہیں آزاد ہُوا میرے اثر سے
مجھ کو بھی پڑا اُس کے اجارے سے نکلنا

جتنا بھی نکل آئے ہیں یہ بھی ہے غنیمت
آساں بھی نہیں تھا وہاں سارے سے نکلنا

رکھنا وہ قدم دائرۂ خواب سے باہر
جیسے ہو کسی پینگ ہُلارے سے نکلنا

مرضی سے کروں گا، ظفر، آوارہ خرامی
اچھا ہی رہے گا مرا دھارے سے نکلنا

☆

رت نئے رنگ بدلتے ہوئے آثار سے تھی
وہ جو اُمید سی ہم کو ترے انکار سے تھی

در کوئی تھا بھی تو ہم اُس سے رہے ناواقف
وہاں اپنی تو شناسائی ہی دیوار سے تھی

کچھ غبار اپنا بھی تھا پھیلا ہوا چاروں طرف
کچھ شکایت ہمیں آئینۂ اظہار سے تھی

ہم خریدار نہیں تھے ، مگر ، اس کے باوصف
کچھ غرض تھی تو ہمیں گرمیِ بازار سے تھی

زندگی کا تو وہی اصل زمانہ تھا کہ جب
اپنی وابستگی سر سے نہیں ، دستار سے تھی

میں کنارے پہ کھڑا تھا یونہی خالی ، خاموش
گفتگو جب مری دریا کے بہت پار سے تھی

جو پریشانیِ خاطر تھی عیاں چہرے سے
وہی ظاہر تری جانب مری رفتار سے تھی

تجھ سے مل کر تو ہوئے اُس سے بھی محروم اب کے
ایک نسبت سی جو ہم کو گل و گلزار سے تھی

یاد سا پڑتا ہے ، آباد تھا جب شہر ، ظفر
رسم و راہ اپنی بھی شاید یہاں دو چار سے تھی

☆

غبارِ دل مری چشمِ ہنر میں کیا رہتا
وہ خود حریفِ نظر تھا ، نظر میں کیا رہتا

چلا تو روک لیا رنگِ رہگزر نے مجھے
وہاں تمھارا مسافر سفر میں کیا رہتا

تمام شہر ہوا جمع راہ پہ اُس کی
وہ آ رہا تھا تو پھر کوئی گھر میں کیا رہتا

ہوائیں اور تھیں اُس کی ، فضائیں اور کی اور
سو ، وہ بگولا مرے دشت و در میں کیا رہتا

ہم اُس کو ڈھونڈ رہے تھے یہاں وہاں بے سود
کہیں جو تھا ہی نہیں ، خشک و تر میں کیا رہتا

وہ ہم سے جس کے زمانے ہی مختلف تھے بہت
ہمارے حلقۂ شام و سحر میں کیا رہتا

ہم اپنے آپ سے بھی دست کش ہوئے ہیں تو پھر
شعور اُس کی تمنا کا سر میں کیا رہتا

بدل لیا ہے اگر اپنا راستہ اُس نے
تو دل ہی اور اب اُس کے اثر میں کیا رہتا

وہ ، جا کے جس نے کنارے پہ ڈوبنا تھا ، ظفر
ہمارے دل کا سفینہ بھنور میں کیا رہتا

☆

سنگینیِ صدمات کے مارے کی طرف سے
گزرو کبھی اک روز ہمارے کی طرف سے

ہے شہر کا اب مجھ سے نیا روز تقاضا
آدھے کی طرف سے، کبھی سارے کی طرف سے

فارغ نہیں اس شام کہ پہنچائی ہے مجھ کو
اک بات سفینے کو ستارے کی طرف سے

پل بھر کا ہی کافی ہے یہ ہنگامۂ ہستی
خوش ہیں خس و خاشاک شرارے کی طرف سے

دیوار گرا دینے ہی کی دیر تھی ساری
آزاد ہوا ہوں جو سہارے کی طرف سے

میں ہوں کہ نہیں ہوں، کچھ اسی طرح کا پیغام
آتا ہے تمھارے ہی اشارے کی طرف سے

جاتا ہوں کسی خواہشِ بے نام کی جانب
آیا ہوں کسی خواب تمھارے کی طرف سے

اتنا تو بھنور سے بھی نہ تھا مجھ کو، بہرطور
جتنا مجھے خطرہ ہے کنارے کی طرف سے

حیراں ہوں، ظفر، اپنے رویے پہ کہ اب تک
منہ موڑ کے بیٹھا ہوں نظارے کی طرف سے

✩

ہمارا جھگڑا ہے یا تمھارا جھگڑا ہے
پسِ دیوارِ دنیا اب یہ کیسا جھگڑا ہے

جو دیکھو تو کئی رنگوں کے گلدستے سجے ہیں
جو سمجھو تو فقط الفاظ ہی کا جھگڑا ہے

زمانوں سے نہیں ہے فرد فرد افتاد میری
کہ میری جستجو، میرا طریقہ جھگڑا ہے

نکلنے کا کسی جانب نہیں رستا ہی کوئی
مرے چاروں طرف اس بار ایسا جھگڑا ہے

گھروں کو بھیج کر آتا ہوں لوگوں کو جہاں سے
وہیں پر دوسرے لمحے دوبارہ جھگڑا ہے

سمندر میں سفر کی ساری سمتیں ہیں سلامت
سفینہ ہے اگر تنہا، ستارہ جھگڑا ہے

یہ اندر جا کے دیکھیں گے تو کچھ معلوم ہو گا
کہ آدھا اور کچھ ہے، اور، آدھا جھگڑا ہے

کئی مطلب ہیں اس کے، اور، کئی الجھاؤ اس میں
کچھ اس انداز کا اس کا اشارہ جھگڑا ہے

ظفر ظاہر میں جو ایک آدمی لگتا ہے، دراصل
ہجومِ خواب ہے، سارے کا سارا جھگڑا ہے

✩

مطلب اب مائلِ پرواز تو ہونے لگا ہے
اک بڑے کام کا آغاز تو ہونے لگا ہے

صرف و نحو، اور، مضامین و معانی کے بغیر
مصرعِ خواب خوش آواز تو ہونے لگا ہے

اب سمجھتی ہے اشارے بھی ہمارے دُنیا
کام بے منتِ الفاظ تو ہونے لگا ہے

خلقتِ شہر میں بدنام ہمارا ہونا
اب کہیں باعثِ اعزاز تو ہونے لگا ہے

سخن اپنا یہاں کچھ مُنہ پہ سیاہی مل کر
دُوسروں سے ذرا ممتاز تو ہونے لگا ہے

شعبدہ ہم بھی دکھانے کے ہوئے ہیں قابل
اپنے ہاتھوں کوئی اعجاز تو ہونے لگا ہے

کچھ خبر تو ملے، دیوار کے اُس پار ہے کیا
درمیاں میں کوئی در باز تو ہونے لگا ہے

بے رُخی تو وُہی اگلی سی ہے موجود مگر
اب کسی بات پہ ناراض تو ہونے لگا ہے

شعر کہتے ہوئے رہ جاتا ہے کچھ باقی بھی
ظفر، اس طرح پس انداز تو ہونے لگا ہے

-☆-

اُس کے علاوہ اور بھی ہیں اس خدائی میں
کیا چاہیے اُداس ہوں کس کی جدائی میں

گزرے نہ کیوں، بتایئے، آرام سے یہ عمر
مَیں ہوں بُرائی میں نہ کسی کی بھلائی میں

دونوں طرح کے ذائقے رہتے ہیں دستیاب
بیگانگی بھی ہے کہیں اس آشنائی میں

تکتا ہوں اُس کو، اور، بناتا ہوں اُس کے نقش
کٹتا ہے سارا وقت پڑھائی لکھائی میں

بدحال اور اُن سے زیادہ نہیں کوئی
جو لوگ پک گئے تھے تری خُودنمائی میں

دینے لگا وہ بھیک تو آگے نکل گئے
کیا سوچ کر پڑے تھے بھلا اس گدائی میں

بکھروں تو میرے رنگ نکلتے ہیں صد ہزار
بدرنگ سا ہی رہتا ہوں اپنی اکائی میں

فارغ ہی دن گزرتا ہے، اور، اس کے ساتھ ساتھ
مصروفِ کار بھی ہوں لگائی بُجھائی میں

مَیں بھی زیادہ خوش نہیں تھا قید میں، ظفر
تاخیر اس نے آپ ہی کی ہے رہائی میں

-☆-

کہیں آ سکنے والے ہیں نہ ہم جا سکنے والے ہیں
کہ گھر بیٹھے ہی جو کچھ بھی ہے ، فرما سکنے والے ہیں

تماشائی ہیں خالی ، اور ، تصویرِ تماشا کو
بگڑوا سکنے والے ہیں نہ بنوا سکنے والے ہیں

بہت خفیہ نہیں ہے واردات اپنی ، اگر چاہو
تو کچھ دن میں ہی سب کے سامنے لا سکنے والے ہیں

بجھا رکھا ہے دل میں کچھ اُسے بیکار ہی ، ورنہ
ہم اس محفل کو اپنے آپ گرما سکنے والے ہیں

بہت مصروف ہیں شام و سحر ، اس کارِ دُنیا میں
ابھی سو کر اُٹھے ہیں ، اور ، ستا سکنے والے ہیں

نکلتا جا رہا ہے وقت کا سیلِ رواں آگے
کوئی پروا نہیں ، ہم اس کو ٹھہرا سکنے والے ہیں

ہمارے ساتھ چل سکتے نہیں یہ لفظ ، اور ، ہم بھی
نیا ملبوسِ معنی اِن کو پہنا سکنے والے ہیں

کسی کو اب تردّد کی ضرورت ہی نہیں ہو گی
جو ہم اپنے کہے کو خود ہی جھٹلا سکنے والے ہیں

ہمارے اپنے دم سے ہے ، ظفرؔ ، ہنگامۂ ہستی
کبھی رو سکنے والے ہیں ، کبھی گا سکنے والے ہیں

-☆-

کشاکش میں نہ ایسی ناصبوری پر کھڑے ہیں
جہاں پہلے تھے ہم ، اُتنی ہی دُوری پر کھڑے ہیں

یہیں تک تھی بہر طور اس محبت کی مسافت
اَدھوری ہی بہت ہے ، اور ، اَدھوری پر کھڑے ہیں

تُمھارا خواب ہم کو لے کے آیا ہے یہاں تک
کہ خاکی ہیں اگر دریائے نُوری پر کھڑے ہیں

کوئی دیکھے تو ناہموار پتھریلی زمیں ہے
کوئی سمجھے تو ہم فرشِ سموری پر کھڑے ہیں

یہاں سے کُوچ بھی کر جائیں گے جب تُو نے چاہا
ابھی تک تو ترے حکمِ عُبوری پر کھڑے ہیں

کوئی ٹکڑا کوئی خِطّہ بھی تھا اپنے لیے کم
زمیں پُوری ہی تھی درکار ، پُوری پر کھڑے ہیں

ملا موقع تو ستائیں گے سب کے ساتھ ہی اب
ہمیں آرام کرنا تھا ضروری ، پر کھڑے ہیں

حقیقت میں خطاکاری پہ استادہ ہیں کب سے
سمجھتے ہیں کہ اپنی بے قصوری پر کھڑے ہیں

ظفرؔ ، قائم ہیں اپنے نخوت و پندار پر ہم
مگر ، لگتا ہے جیسے جی حضوری پر کھڑے ہیں

-☆-

عجیب ذکر تھا ، اور ، داستاں میں چھوڑ دیا
وہ کام کیا تھا جسے درمیاں میں چھوڑ دیا

یہ روشنی ہی بہت ہے کہ اُس نے جاتے ہُوئے
جو ایک پارۂ برق آشیاں میں چھوڑ دیا

وہ ایک لاحقہ سمجھے تھے بے بہا جس کو
ترنگ آئی تو پھر رایگاں میں چھوڑ دیا

عداوت اپنی جگہ ، اعتبار اپنی جگہ
سو ، اپنے آپ کو اُس کی اماں میں چھوڑ دیا

ہماری سعیِ سخن کی مثال بس یہ تھی
حباب سا کوئی آبِ رواں میں چھوڑ دیا

کچھ اور طرح کی عادت پڑی ہُوئی تھی جنھیں
کچھ اور ذائقہ پیر و جواں میں چھوڑ دیا

کوئی ستارہ تو آئے گا راستے میں کہیں
جو ہم نے تیر کھُلے آسماں میں چھوڑ دیا

ہمارا شور ہی ایسا تھا ، اس لیے اُس کو
کبھی مکاں میں ، کبھی لامکاں میں چھوڑ دیا

اُسی کا شہرہ ہُوا ہے یہاں جو ہم نے ، ظفر
دقیقہ ایک زبان و بیاں میں چھوڑ دیا

☆

عشق یہ کیا ہے کہ ہوتے ہُوئے سائل تیرے
آ گئے ہم ہی بہر طور مقابل تیرے

ہم نے دیکھا نہیں کچھ تندیِ طوفاں کے سوا
یعنی آسودہ ہیں کس رنگ میں ساحل تیرے

تھا مدار اپنا کسی خواب ہم آغوشی پر
اور ، بازو تھے کہیں اور حمائل تیرے

اختلافات رہے پہلے پہل تو ، اور ، پھر
رفتہ رفتہ سبھی ہوتے گئے قائل تیرے

میں جو نکلا ہُوں اندھیروں کے سفر پر اِس رات
کر رہے تھے یہ ستارے ابھی جھلمل تیرے

تُو نے اتنی ہی سہولت سے کیے آخر کار
فیصلے جو نظر آتے رہے مشکل تیرے

میں نے دو حصّوں میں تقسیم کیا جب خُود کو
درمیاں میں کئی پردے ہُوئے حائل تیرے

میں رہا اپنی پریشانیِ خاطر میں یہاں
وہاں مجھ سے بھی زیادہ تھے مسائل تیرے

اب ہے خاموشی و پسپائی ہی بہتر کہ ظفر
ہوتے ہوتے سبھی دعوے ہُوئے باطل تیرے

☆

نظر آتے ہیں سر ہی سر، سو، اتنا جھگڑا ہے
حقیقت میں نہیں ہے کوئی بھی، کیا جھگڑا ہے

زمیں پر رنگ ہیں، اور، آسماں پر پھول ہی پھول
ہوا میں روشنی ہے، کیا تماشا جھگڑا ہے

سبھی شامل ہیں اس میں، آپ خود بھی، اور، وہ بھی
کہ بس کہنے کی حد تک یہ ہمارا جھگڑا ہے

اگر جا بھی چکے ہیں اپنے اپنے کام پر لوگ
تو پھر بھی قائم و دائم یہ کیسا جھگڑا ہے

اسے اب چھوڑ کر جا تو رہے ہو، جاؤ! لیکن
دوبارہ بھی جب آؤ گے، دوبارہ جھگڑا ہے

گزرنے کے لیے رستا نہیں ملتا کسی کو
مرے ہر سمت کتنی بھیڑ، کتنا جھگڑا ہے

بظاہر اس کا طول و عرض کم لگتا ہے سب کو
مگر سمجھو تو پہلے سے زیادہ جھگڑا ہے

جو صرف و نحو سے باہر ہے، معنی آفریں بھی
یہ دیکھو تو فقط الفاظ ہی کا جھگڑا ہے

ظفر، احوال اتنا ہے مری سعیِ سخن کا
کہ آدھی جستجو ہے، اور، آدھا جھگڑا ہے

☆

دل تو بیگانہ ہے، دُنیا بھی کسی اور کی ہے
یہ مری تابِ تماشا بھی کسی اور کی ہے

میرے ہونے سے زیادہ ہے نہ ہونا میرا
اور، مری ہستیِ بے جا بھی کسی اور کی ہے

یہ ہوا اور کی ہو سکتی ہے اک بار تو پھر
جان لیجے کہ دوبارہ بھی کسی اور کی ہے

میرے حصے کی ہر اک چیز بہرطور یہاں
کم نہیں ہے تو زیادہ بھی کسی اور کی ہے

دُور و نزدیک خوشی کی یہ بھٹکتی ہوئی لہر
مَیں نہیں ہوں تو لہٰذا بھی کسی اور کی ہے

یہ مری عمر گزاری ہے نہ جانے کس نے
لطف یہ ہے کہ بقایا بھی کسی اور کی ہے

میرا اپنا تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے جیسے
کہ مرے دل میں تمنا بھی کسی اور کی ہے

مَیں نے سر پر جو اُٹھا رکھی ہے اور اپنے آپ
کیا کیا جائے کہ بپتا بھی کسی اور کی ہے

بادشاہ اصل میں اپنا ہے کوئی اور، ظفر
اور، یہ ساری رعایا بھی کسی اور کی ہے

☆

کچھ آتشِ معنی میں پگھلتا بھی نہیں ہوں
الفاظ کے جھرمٹ سے نکلتا بھی نہیں ہوں

کھاتا ہوں ہیئت زیرِ زمیں پیچ بھی دن رات
اس خاک سے چشمہ سا اُبلتا بھی نہیں ہوں

اک عالمِ لغزش ہوں جو اس کام کے اندر
گرتا بھی نہیں ، اور ، سنبھلتا بھی نہیں ہوں

اچھے نہیں لگتے ہیں مجھے لوگ یہاں کے
اس بزمِ خرافات سے ٹلتا بھی نہیں ہوں

تنگی سے گزرگاہ کی نالاں بھی ہوں اتنا
اور اپنے کناروں سے اُچھلتا بھی نہیں ہوں

باہر بھی نکلتا نہیں اس آب و ہوا سے
اک عمر ہوئی پھولتا پھلتا بھی نہیں ہوں

یہ راکھ سی کیوں جھڑتی ہے مجھ سے سحر و شام
میں اب تو کسی آگ میں جلتا بھی نہیں ہوں

اک بے سفری بھی ہے اسی زورِ سفر میں
رُکتا بھی نہیں ، اور ، میں چلتا بھی نہیں ہوں

اُلٹا کے بھی دیکھا ہے ، ظفر ، مصرعِ تر کو
اس فرشِ تماشا سے پھسلتا بھی نہیں ہوں

-☆-

کسی کے وصل کا سامان تو نہیں کیا ہے
کہیں ضرر ، کوئی نقصان تو نہیں کیا ہے

اسی طرح سے ہیں سب مشکلیں محبت کی
کچھ اپنے کام کو آسان تو نہیں کیا ہے

اگرچہ ذکر تمھارا ہے جابجا اس میں
تمھیں فسانے کا عنوان تو نہیں کیا ہے

ابھی تو کرتے ہیں تاراج دل کا نظارہ
ابھی یہ باغ بیابان تو نہیں کیا ہے

میں خوش خیال زیادہ سہی ، مگر ، میں نے
اُمید کو کبھی امکان تو نہیں کیا ہے

محبت اُس کے مضافات میں ہے روکی ہوئی
وہ باخبر سہی ، اعلان تو نہیں کیا ہے

خیال رکھتی ہیں آنکھیں بُرے بھلے کا ضرور
کسی طرح انھیں دربان تو نہیں کیا ہے

اندھیرے ، اور ، اُجالے کو اکثر آپس میں
ملائے رکھتا ہوں ، یک جان تو نہیں کیا ہے

ظفر نے بعضوں کو حیران تو کیا ہو گا
مگر ، کسی کو پریشان تو نہیں کیا ہے

-☆-

میں نے کب دعویٰ کیا تھا، سر بسر باقی ہوں میں
پیشِ خدمت ہوں تمھارے، جس قدر باقی ہوں میں

میں بہت سا جیسے ضائع ہو چکا ہوں جابجا
ہاتھ سے محسوس کرتا ہوں کدھر باقی ہوں میں

ڈھونڈتے ہیں اب جہاں میرا نشاں تک بھی نہیں
اُس طرف بھی دیکھ لینا تھا جدھر باقی ہوں میں

میری تفصیلات میں جانے کا موقع اب کہاں
اب تو آساں ہے سمجھنا، مختصر باقی ہوں میں

دن چڑھے ہونا نہ ہونا ایک سا رہ جائے گا
یہ بھی کیا کم ہے کہ اب سے رات بھر باقی ہوں میں

خرچ سارا ہو چکا ہوں اور دُنیا میں کہیں
کچھ اگر ہوں بھی تو خود سے بے خبر باقی ہوں میں

میں کسی کام آ بھی سکتا ہوں اگر سمجھے کوئی
آج بھی خس خانۂ دل میں شرر باقی ہوں میں

میں اگر باقی نہیں ہوں تو بھی ہے کس کو غرض
اور ہے پروا یہاں کس کو اگر باقی ہوں میں

کچھ بھی ہو، بے سُود ہے مجھ سے سفر کرنا، ظفر
جو کہیں جاتی نہیں وہ رہگزر باقی ہوں میں

☆

باہر نہیں رہا کبھی اندر نہیں گیا
الزام اس طرح کا مرے سر نہیں گیا

خالی ہی لگ رہی تھی مجھے ساری کائنات
جب تک کہ اپنے آپ سے میں بھر نہیں گیا

بنتے گئے ہیں مجھ میں ہی دیوار و بام و در
اک عمر ہو گئی ہے کہ میں گھر نہیں گیا

جب تک میں کود ہی نہ پڑا اُس میں ایک دم
پانی سے آتی دیر مرا ڈر نہیں گیا

اکثر بہم رہی ہے یہ صورت مرے لیے
میں ہی کہیں ہواؤں کے رُخ پر نہیں گیا

گزرا ہوں زندگی میں کبھی جس سے ایک بار
میں ایسے راستے سے مکرر نہیں گیا

آغاز ہی کچھ ایسے کیا تھا کہ آج تک
سر سے فتور، پانو سے چکر نہیں گیا

آگے بھی لوگ تھے، مرے پیچھے بھی سر بسر
افسوس میں کسی کے برابر نہیں گیا

جیتا ہوں اپنے شور کی بنیاد پر، ظفر
نقاد کے سکوت سے میں مر نہیں گیا

☆

ہوا ہی اور ہے، بچے سیانے ہو چکے ہیں
زمانہ ہے نیا، اور، ہم پرانے ہو چکے ہیں

محبت آپ اب تو آ گرے جھولی میں، ورنہ
خطا اپنے تو سارے ہی نشانے ہو چکے ہیں

کسی کی یاد بھی سر سے گزر جاتی ہے اب تو
کہ ہم ویسے ہی کافی بے دھیانے ہو چکے ہیں

ہم اتنے منتظر ہیں جس کے ہونے کے ابھی تک
ہوئے اس کو بھی اب کتنے زمانے ہو چکے ہیں

محبت عذر تھا جو پیش کر رکھتے تھے اس کو
بنا سکتے تھے جو حیلے بہانے ہو چکے ہیں

کوئی سازش تھی جو تیار ہے پوری طرح سے
ضروری تھے جو سارے تانے بانے ہو چکے ہیں

کسی بھی وقت ہو سکتی ہے اب تقسیم میری
کہ حصے بن چکے ہیں، اور، خانے ہو چکے ہیں

اندھیری رہگزر سے بالا بالا ہی یہاں پر
ہواؤں، اور، دیے میں دوستانے ہو چکے ہیں

ظفر پہنچے ہیں اب اس بزمِ بے احوال میں، جب
تماشا ختم ہے، گانے بجانے ہو چکے ہیں

-☆-

ابھی نہیں کوئی غم، روزگار چلتا ہے
کہ اعتبار ہے باقی، اُدھار چلتا ہے

میں صبح و شام خسارے میں جا رہا ہوں ابھی
رُکا ہوا ہے، مگر، کاروبار چلتا ہے

کسی اُمید کا در بند ہے، کھلا ہے کہیں
وہ آ رہا نہیں، اور، انتظار چلتا ہے

گرا پڑا کوئی مجھ سا جہاں میں اور نہیں
مجھی پہ آپ کا بھی اختیار چلتا ہے

یہ اور طرح کی حرکت ہے چار سُو، جیسے
ہوا رُکی ہوئی ہے، کوہسار چلتا ہے

تلاش ہے خس و خاشاک آرزو کی اُسے
لہو کے ساتھ رگوں میں شرار چلتا ہے

مرے خیال میں دریا ہے کوئی اور اُدھر
جو ایک عمر سے دریا کے پار چلتا ہے

نکال لیتا ہوں منت سے کام گاہ بگاہ
ہمیشہ اس پہ مرا انحصار چلتا ہے

یہاں پہ جھوٹ ہی وہ سِکہ رواں ہے، ظفر
جو ایک بار نہیں، بار بار چلتا ہے

-☆-

بدن بہار ہے یا پیرہن تماشا ہے
یہاں تو جو بھی ہے ، سارا چمن تماشا ہے

بس ایک شیشے کی حد تک ہے اس میں آمد و رفت
یہ شہر خواب ہے ، یہ انجمن تماشا ہے

جو اصل شے ہے اندھیرا ہے ان خلاؤں میں
کہ چاند وہم ہے ، اس کا گہن تماشا ہے

جو دیکھیے تو ہے پیشِ نظر نئی ترتیب
جو سوچیے تو جہانِ کہن تماشا ہے

کوئی صدا ہے تمنائی خامشی کی طرف
کوئی ہوا ہے تماشائی ، تن تماشا ہے

ابھی یہ بھید نہیں کھل رہا ہے خلقت پر
کہ گھاس آئنہ ہے یا چمن تماشا ہے

یہ روشنی ہے کہ رنگوں کا ایک سیلِ رواں
طلسم زار ہے سورج ، کرن تماشا ہے

ہنسی مذاق میں ہوتے ہیں سارے کام یہاں
کہ فکر کھیل ہے ، اور ، میرا فن تماشا ہے

ہوں اپنی گانٹھ کا پورا ابھی طرف سے ، ظفر
یہ سب کا سب مرا دیوانہ پن تماشا ہے

☆

اس آئنے میں جھلکتے ہی ، دل دھڑکتے ہی
پلٹ گیا بھی منظر پلک جھپکتے ہی

کچھ اور اگر کہیں ممکن نہ تھا ، تو پھر اس بار
ہجوم میں تو کہیں اس کو دیکھ سکتے ہی

بس ایک آن میں کیسا بدل گیا موسم
ثمر مہکتے ہی ، شاخ کمر لچکتے ہی

مری گرفت میں آتا تھا اس نے کیا کہ مری
ہنسی نکل گئی اس کی طرف لپکتے ہی

ٹھہر سکا نہیں ، اس کا سفر ہی ایسا تھا
میں اور تیز ہوا راستے میں تھکتے ہی

کوئی بہاو ہی اتنا ہے گفتگو میں یہاں
ہوئی ہے بات رواں بیچ میں اٹکتے ہی

فصیل سی تھی کوئی دل کے ہر طرف پیدا
وگرنہ چار دن اس دشت میں بھٹکتے ہی

ہمارا دخل نہ تھا اس میں کچھ ، مگر ، گھر سے
نکل کھڑے ہوئے فصلِ ہوا کے پکتے ہی

وہ ایک پل کا اجالا تھا آس پاس ، ظفر
چراغ سا کہیں میں بجھ گیا بھڑکتے ہی

☆

کسی بھی طرح سے اقرار تو نہیں کیا تھا
اگرچہ آپ نے انکار تو نہیں کیا تھا

کبھی کبھار ہی آتی تھی اُس کی یاد ہمیں
خیال اُس کا لگاتار تو نہیں کیا تھا

ابھی تو ہم تھے یونہی دیکھ بھال میں مصروف
کہ دل کو اس کا خریدار تو نہیں کیا تھا

مسائل آپ کو اپنے بھی تھے بہت درپیش
وگرنہ ہم نے بھی اصرار تو نہیں کیا تھا

سمجھنے میں غلطی ہم ہی کر گئے ، ورنہ
کچھ اُس نے بام کو بازار تو نہیں کیا تھا

میں اپنے آپ میں دریائے تند موج تھا ایک
سو ، میں نے اس کو ابھی پار تو نہیں کیا تھا

یہاں جو در تھے وہ خود بند ہو گئے تھے کہیں
کسی نے بھی انھیں دیوار تو نہیں کیا تھا

ہمارے دل کو تم اچھے لگے بھی تھے ، لیکن
اسے تمھارا طلبگار تو نہیں کیا تھا

کیا تھا شور ، ظفر ، ہم نے دل کے اندر ہی
زمیں کو خواب سے بیدار تو نہیں کیا تھا

☆

ڈھونڈو مجھے نہ میرے ٹھکانے کے آس پاس
رہتا ہوں آنے والے زمانے کے آس پاس

رکھتے ہیں سب مجھے ترے آنے سے دور دور
ہوتا ہوں رات دن ترے جانے کے آس پاس

وہ تیر ہوں کہ چھوڑتے ہیں جب کبھی مجھے
لگتا نہیں ہوں جا کے نشانے کے آس پاس

کچھ اتنا فاصلہ بھی نہیں تھا تلاش میں
پھرتا رہا ہوں بس تجھے پانے کے آس پاس

مصروف رائگاں ہی رہا شوقِ وصل میں
ہر رات بوریا سا بچھانے کے آس پاس

جب عمر کا اخیر ہوا ہے تو اب کہیں
پہنچا ہوں اُس کو پاس بلانے کے آس پاس

کیا اُٹھ سکے گا بارِ محبت کہ ہوں کہیں
اپنا ہی بوجھ سر سے گرانے کے آس پاس

موسم ہو جو بھی ، چلتے بکھرتے ہیں ایک ساتھ
اک خواب ہے نیا بھی پرانے کے آس پاس

بیکار ہی پڑا ہوں ، خطرناک بھی ، ظفر
پتھر سا ایک آئنہ خانے کے آس پاس

☆

سمندروں میں سراسر پہاڑ جھونکتا ہوں
میں جو بھی کرتا ہوں، آخر تو بھاڑ جھونکتا ہوں

کئی سجھاؤ ہیں جو میری زد پہ رہتے ہیں
کئی بناؤ ہیں جن میں بگاڑ جھونکتا ہوں

نعیم پر، کہ یہ ہتھیار آخری تھا مرا
میں جس میں بیٹھا ہوا تھا وہ آڑ جھونکتا ہوں

مجھے پسند نہیں ہیں یہ صلح کی باتیں
سو، اس میں اپنی بھی کچھ مار دھاڑ جھونکتا ہوں

یہ خواہشیں مجھے کرتی ہیں تنگ جس لیے
کچھ آگ میں انہی کانٹوں کے جھاڑ جھونکتا ہوں

جہاں جہاں مرا مطلب ادا نہیں ہوتا
وہاں وہاں یہ کبھی چیر پھاڑ جھونکتا ہوں

جمود سا نظر آنے لگے اگر مجھ کو
تو بات چیت میں اک چھیڑ چھاڑ جھونکتا ہوں

بچا کے کچھ نہیں رکھتا ہوں گفتگو کے لیے
غزل میں سارا ہی کوڑا کباڑ جھونکتا ہوں

کھڑا ہوں میں کسی ٹیلے پہ، اور، ہوا میں، ظفر
اُکھاڑ جھونکتا ہوں، اور، پچھاڑ جھونکتا ہوں

☆

جھگڑا کبھی خود سے، کبھی دُنیا سے رہا ہے
کچھ یہ تو اُصول اپنا ہمیشہ سے رہا ہے

پلٹے گی بہت دیر میں اس شہر کی رونق
خالی یہ بہت اہلِ تمنا سے رہا ہے

حق بات تو اتنی ہے کہ ربط اپنا کسی طور
مسجد سے رہا ہے نہ کلیسا سے رہا ہے

اوروں سے تو رہتا ہے گلہ روز ہی مجھ کو
کچھ آپ کی بھی ہستیِ والا سے رہا ہے

وحشت ہو تو میں گھر سے نکل جاؤں اسی وقت
اتنا تو علاقہ مجھے صحرا سے رہا ہے

یوں ہے کہ یہاں میری محبت کا سفینہ
آگے کبھی پیچھے ترے دریا سے رہا ہے

جھلمل کوئی باقی ہے کسی داغِ طلب کی
کچھ یاد مجھے رنگِ تماشا سے رہا ہے

اس زود ملاقات پہ ناراض ہے وہ بھی
میرا بھی تنازع دلِ رُسوا سے رہا ہے

اپنا بھی رہا ہے، ظفر، اک خواب تعلق
یہ کم سے رہا ہے کہ زیادہ سے رہا ہے

☆

میں ہوں برائے نام، ہوا ہے برائے نام
موجود ہے، اگرچہ خدا ہے برائے نام

تقدیر میں ہیں اس کی پریشانیاں بہت
سارا یہ خواب ارض و سما ہے برائے نام

یہ بھی بہت ہے خار و خس و کاہ کے لیے
آثار باغ پر جو صبا ہے برائے نام

دنیا کو میں نے، ٹھیک ہے، کچھ بھی نہیں دیا
دنیا سے میں نے خود بھی لیا ہے برائے نام

اپنی ہی ذات کے لیے مقصود ہے مجھے
شاید اسی لیے یہ صدا ہے برائے نام

اندر ہو میرے جتنا بھی پھیلا ہوا یہاں
یہ ہر طرف تو میرے خلا ہے برائے نام

چہرہ جو میری آنکھوں میں پھرتا ہے رات دن
یہ کائنات اس کے سوا ہے برائے نام

اس نے تو مجھ کو اور بھی گمنام کر دیا
جو کام شاعری میں کیا ہے برائے نام

باقی رہے تو یہ بھی غنیمت ہے، اے ظفر
آنکھوں میں آپ کی جو حیا ہے برائے نام

☆

اثر بھی ہے تو کوئی شے اثر سے غائب ہے
سمجھ سکو تو ہنر خود ہنر سے غائب ہے

میں پڑھ رہا ہوں جو تحریر جستہ جستہ ابھی
ہوا پہ لکھی ہوئی ہے، نظر سے غائب ہے

وہ ایک شے کہ نہیں خاک و خشت میں موجود
وہ ایک چیز مرے دشت و در سے غائب ہے

اس آب و تاب میں کچھ بھی پتا نہیں چلتا
کدھر کو ہے کوئی حاضر، کدھر سے غائب ہے

وہ ماہتاب محبت، وہ رنج رفتہ خواب
طلوع ہو گا وہیں پر جدھر سے غائب ہے

عجب طرح کا مسافر ہے یہ دل درویش
سفر میں بھی ہے، مگر، رہگزر سے غائب ہے

کہاں کی چیز تھی، لیکن، پہنچ گئی ہے کہاں
خیال ابر میں الجھا ہے، سر سے غائب ہے

سب اس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں پاگلوں کی طرح
کہاں پہ ہے وہ اگر خشک و تر سے غائب ہے

ظفر کو اور کہاں سے تلاش کیجیے گا
کہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی جو گھر سے غائب ہے

☆

ناکام ابر و باد کی سازش نہیں ہوئی
ہے کون سی جگہ جہاں بارش نہیں ہوئی

ملنے کا اُس سے کوئی سبب ہی نہ بن سکا
یہ بھی نہیں ہُوا ہے کہ خواہش نہیں ہوئی

اُس نے بھی کچھ زیادہ تردُّد نہیں کیا
اپنی طرف سے بھی کوئی کاوش نہیں ہوئی

اتنا بھی کوئی تنگ نہیں تھا یہ گھر، مگر
اب کیا کریں جو اُس کی رہائش نہیں ہوئی

پتا چلا نہیں ہے کوئی اُس کے باغ کا
صحرا کی ریت میں کوئی لرزش نہیں ہوئی

اندر تو پیچ و تاب رہا طرح طرح کا
اور، سطحِ خاک پر کوئی جنبش نہیں ہوئی

مدّت ہوئی بنا نہیں پانی پہ کوئی نقش
عرصے سے اس ہوا پہ نگارش نہیں ہوئی

اب چھوڑیے بھی، آپ کا جیسا بھی تھا سلوک
کہہ جو دیا ہمیں کوئی رنجش نہیں ہوئی

کچھ شکل بھی وہ بھولنے والی نہ تھی، ظفرؔ
کچھ ٹھیک سی اِدھر سے بھی کوشش نہیں ہوئی

-☆-

بے نشاں تھا وہ، اگر، اُس کو نشاں کیسا کیا
تب وہاں کیسا کیا تھا، اب یہاں کیسا کیا

دیکھ لو چلتی ہوا روکی ہے میں نے کس طرح
اور، یہ رُکتا ہوا پانی رواں کیسا کیا

آسماں کو کھینچ لایا ہوں زمیں پر، اور، پھر
اس طرح سے اِس زمیں کو آسماں کیسا کیا

خود بھی جس میں رہ نہیں سکتا ہوں آسانی کے ساتھ
مَیں نے اپنے واسطے پیدا جہاں کیسا کیا

آگ کیسی اپنے اندر عمر بھر روشن رکھی
اور، اپنے آپ کو آخر دھواں کیسا کیا

ساتھ لے جاتی ہوا اپنا سفینہ بھی، مگر
چادرِ صحرا کو مَیں نے بادباں کیسا کیا

داستاں سے جس کو باہر کر دیا تھا ایک بار
مَیں نے پھر اُس کو بھی زیبِ داستاں کیسا کیا

چپ بہت تھا وہ، مگر، اثنائے بوسہ میں کہیں
رفتہ رفتہ اُس کو اپنا ہم زباں کیسا کیا

بات کا کیا ہے، نئی تھی یا پُرانی تھی، ظفرؔ
دیکھنا یہ ہے اسے مَیں نے بیاں کیسا کیا

-☆-

کچھ نہ کچھ گرتی ہوئی ساکھ سنبھالی ہوئی ہے
بات سے ہم نے جو یہ بات نکالی ہوئی ہے

کیا تماشا ہے کہ پردے میں بٹھایا ہے اُسے
شکل جب اُس کی ذرا دیکھنے والی ہوئی ہے

یہ بھی ہو سکتی ہے جلدی ہی ، اگر غور کرو
آج تھوڑی سی جگہ دل میں جو خالی ہوئی ہے

مجھ کو باہر رکھا اِس کھیل سے ، اور ، خواہشِ وصل
اندر اندر ہی کہیں اُس کی سوالی ہوئی ہے

درمیاں میں ہیں ابھی اور فصیلیں کتنی
ایک دیوار اگر میں نے گرا لی ہوئی ہے

کون ہو سکتا ہے وہ ، سوچتا ہوں جس کے لیے
میں نے بے کاری یہ عمر بچا لی ہوئی ہے

لُطف آ جائے جو وہ چاند چڑھے ہی نہ کہیں
رات جس کے لیے کچھ اور بھی کالی ہوئی ہے

میں ہی تھا بیچ میں دریا ، سو ، بالآخر میں نے
راستے سے یہ رُکاوٹ بھی ہٹا لی ہوئی ہے

عشق بھی کام تھا کرنے کا بھلا کوئی ، ظفر
مفت میں ایک مصیبت اُسے ڈالی ہوئی ہے

☆

یہ سہولت ہی کوئی ہے نہ سہارا ہونا
شہر میں پھر بھی غنیمت ہے تمہارا ہونا

دشت سے پار اُترنا وہ کسی خواب کی طرح
اور ، پھر تیرے سمندر کا کنارہ ہونا

کچھ سمجھ میں ہی نہ آنا مری ، اور ، پھر ہر بار
اور کا اور اُن آنکھوں کا اشارہ ہونا

دیکھ لیتے ہیں بہرحال یہ کوشش کر کے
ورنہ مشکل ہے بظاہر تو گزارہ ہونا

اس چکاچوند میں اب تو کہیں ممکن ہی نہیں
مری نظروں کے لیے کوئی نظارا ہونا

جلنے بجھنے کی سہولت ہے اسی کے دم سے
اپنے ہی خس کے لیے آپ شرارہ ہونا

ایک ہی بار کے ہونے سے تامّل تھا مجھے
اب پڑا ہے اُسی حالت میں دوبارہ ہونا

ہم کہیں تھے ہی نہیں ، اصل حقیقت یہ ہے
کہ نہ ہونے کے برابر تھا ہمارا ہونا

اور بھی اب تو ضروری ہے ، ظفر ، میرے لیے
اپنے اندر کے اندھیرے کا ستارہ ہونا

☆

جو سمندر ہے اُسے کس لیے ساحل کرنا
اپنا منشا ہی نہیں تھا اُسے حاصل کرنا

وہ جہاں بھی ہو ، کبھی ڈھونڈ کے لانا اُس کو
اور ، پھر اپنے کسی خواب میں شامل کرنا

راستہ ایک بھی جاتا نہیں جس کی جانب
ہم نے کیوں ٹھان رکھا ہے اُسے منزل کرنا

آپ ہی اُس کو خیال آئے کسی دن شاید
کچھ مناسب نہیں خود کو وہاں سائل کرنا

یاد کرتے رہے اُس کو سحر و شام ، مگر
بھول جاتے رہے خود کو کسی قابل کرنا

جا کے اس عمر میں کیا عرض گزاری کرتے
ورنہ مشکل بھی نہیں تھا اُسے قائل کرنا

کوئی شے خود سے جدا کرنے میں رہنا مصروف
اور ، کوئی چیز لہو میں کہیں داخل کرنا

کسی مہتاب کا ہر رات چمکنا مجھ میں
اک ستارے کا مری خاک پہ جھلمل کرنا

دور اب رہ کے دکھاتے بھی کبھی اُس سے ، ظفر
یعنی کہنا بہت آسان ہے ، مشکل کرنا

☆

ہاتھوں سے اُس کے چہرے کو پیالہ ہی کرتے ہم
غمروں کی تشنگی کا ازالہ ہی کرتے ہم

آتا نظر کہ ہم ہیں کہاں ، اور ، وُہ کدھر
تھوڑا سا زندگی میں اُجالا ہی کرتے ہم

سارے کے انتظار میں تھوڑے سے بھی جیتے
اپنا تو کوئی کام نکالا ہی کرتے ہم

پھنسنا تو مچھلیوں کا مقدر کی بات ہے
دریا میں اپنا جال تو ڈالا ہی کرتے ہم

کرتے ہمیں بھی یاد اگر وہ کبھی کبھار
رونق اُس انجمن کی دوبالا ہی کرتے ہم

آپس میں کیوں ملائے رکھا ہر طرح کا مال
کوئی تمیز ادنیٰ و اعلیٰ ہی کرتے ہم

اس عمرِ چند روزہ میں کچھ بھی نہیں کیا
کرتے تو کوئی کام نرالا ہی کرتے ہم

اس شہر سے جو کوچ نہ کرتے ابھی کچھ اور
لوگوں کی پگڑیاں تو اُچھالا ہی کرتے ہم

بے ذائقہ ہی رہ گیا خوانِ سخن ، ظفر
تھوڑا سا اور تیز مسالا ہی کرتے ہم

☆

جسے ہم ڈھونڈتے ہیں وہ کہیں پر بھی نہیں ہے
کہ اندر بھی نہیں ہے ، اور ، باہر بھی نہیں ہے

ہمارا گھومتے پھرنا بھی ہے اک رائیگانی
کہ اپنا کوئی مرکز ، کوئی محور بھی نہیں ہے

محبت کر رہی ہے یہ اشارے سے کہاں سے
کئی دن سے اگر یہ دل کے اندر بھی نہیں ہے

ہمارے دیکھنے کی نوعیت ہی اور ہے اب
سو ، اپنے سامنے اب کوئی منظر بھی نہیں ہے

نہیں معلوم دل کے دوسری جانب ہے کیا کچھ
یہ کیا دیوار ہے جس میں کوئی در بھی نہیں ہے

حساب خواب رکھتے بھی ہیں اپنے طور پر ہم
مسائل کا ہمیں اندازہ کھل کر بھی نہیں ہے

خدا سے ، یا کسی سے بھی کریں ہم کیا تقاضا
کہ شکر اس کا بھی ہے جو کچھ میسّر بھی نہیں ہے

یہ کیسی دوڑ ہے جس میں پتا چلتا نہیں کچھ
کہ آگے اور پیچھے کیا ، برابر بھی نہیں ہے

ظفر ، کمرے کی مشترکہ ہوا میں سانس لینا
اگر سمجھو تو عیاشی سے کم تر بھی نہیں ہے

☆

بظاہر زنگ پیدا کر رہا ہوں
مگر ، ارژنگ پیدا کر رہا ہوں

میں رات اور دن کو آپس میں ملا کر
نیا اک رنگ پیدا کر رہا ہوں

بہت ساری بد آہنگی کے بل پر
کوئی آہنگ پیدا کر رہا ہوں

مجھے اوروں کے ڈھب سے کیا سروکار
میں اپنا ڈھنگ پیدا کر رہا ہوں

نہیں آتا جو میری بھی سمجھ میں
عجب نیرنگ پیدا کر رہا ہوں

میں خود ہی صلح کروانے کی خاطر
سوال جنگ پیدا کر رہا ہوں

مجھے جلدی نہیں سر پھوڑنے کی
سو ، اپنا سنگ پیدا کر رہا ہوں

کوئی رسوائی میری منتظر ہے
جو نام و ننگ پیدا کر رہا ہوں

ظفر ، پیدا نہیں کچھ کر سکا جب
تو عذر لنگ پیدا کر رہا ہوں

☆

تماشا ہونے والا ہے نہ وحشت کرنے والے ہیں
جو سچ پوچھو تو اظہار ندامت کرنے والے ہیں

ہماری کوئی خواہش، کوئی فرمائش نہیں تم سے
ہمیں سمجھا کرو، ہم تو محبت کرنے والے ہیں

توقع ہی نہ رکھنا ایسی ویسی بات کی ہم سے
معزز ہوں نہ ہوں، آخر تو عزت کرنے والے ہیں

جو ہم چپ ہیں تو اب چپ ہی رہیں گے آخری حد تک
مگر، تم نے تو یہ سمجھا شکایت کرنے والے ہیں

پتا پوچھا تو ہے اُس کی رہائش گاہ کا ہم نے
ضروری بھی نہیں ایسا کہ زحمت کرنے والے ہیں

خدا ہرگز کسی کی سعی کو ضائع نہیں کرتا
ہم اپنے عشق میں ہیں، اور، محنت کرنے والے ہیں

مُنافع جس میں سب اُس کا ہو، اور، نقصان سب اپنا
کسی کے ساتھ ہم ایسی شراکت کرنے والے ہیں

کسی کا کچھ نکلتا ہو تو آئے، اور، طلب کر لے
ہم اس شہرِ شناسائی سے ہجرت کرنے والے ہیں

ظفر، جتنا زیادہ چاہتے ہیں اہلِ دُنیا کو
ہم اپنے آپ سے اُتنا ہی نفرت کرنے والے ہیں

☆

کیا تو ہو گا، مگر، دوبارہ نہیں کیا تھا
بھی کہ تم نے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا

خطا ہماری بھی کوئی ہو گی ضرور، لیکن
لحاظ تم نے بھی کچھ ہمارا نہیں کیا تھا

کسی کو اِس کا یقین شاید کبھی نہ آئے
کہ ہم نے یہ کچھ کبھی گوارا نہیں کیا تھا

وہ ایک دیوار جو رہی ساتھ ساتھ اپنے
اُسی کو ہم نے کبھی سہارا نہیں کیا تھا

ہمیشہ رہنا تھا دل نے خاشاکِ خواب ہی میں
اسی لیے تو اسے شرارہ نہیں کیا تھا

جبھی تو پیوستہ رہ گئے کارِ عشق سے ہم
کہ تھوڑا تھوڑا کیا تھا، سارا نہیں کیا تھا

چمک اُٹھا ہے پڑے پڑے اپنے آپ، ہم نے
وہ سنگ جس کو ابھی ستارہ نہیں کیا تھا

اُسی سمندر میں ایک دن ڈوبنا تھا ہم کو
سو، ہم نے اُس سے کبھی کنارہ نہیں کیا تھا

ظفر، اندھیرا تھا اُس کی باتوں میں وہ کہ ہم نے
وہ سامنے تھا، مگر، نظارا نہیں کیا تھا

☆

جو بھی ہے شبِ وصل کا ہنگام بہت ہے
میں سو نہیں سکتا کہ ابھی کام بہت ہے

اب تک تو محبت میں کمی کچھ نہیں آئی
آغاز بہت ہے کبھی انجام بہت ہے

کافی ہے ابھی دل پہ کوئی بُجھتا ہُوا نقش
دیوار سے اک مِٹتا ہُوا نام بہت ہے

نکلے گا یہیں سے کوئی اندر کا بھی رستہ
فی الحال تو یہ ربط سرِعام بہت ہے

ہوں خود ہی اگر شوق اسیری میں گرفتار
یہ دانہ ہی کافی ہے ، یہی دام بہت ہے

تُو ہے تو یہاں اک ترے ہونے کے سبب سے
تکلیف بہت ہے کہیں آرام بہت ہے

یہ اصل ہے ، تصویر ہے یا عکس ہے اُس کا
جھلسے ہُوئے لوگوں کے لیے شام بہت ہے

منسوب اگر طرز نہیں مجھ سے کوئی خاص
ظاہر ہے ابھی طبع مری خام بہت ہے

ہے گھاس کی پتی بھی ، ظفر ، غیرتِ گلشن
میرے ہی لیے ہے تو یہ انعام بہت ہے

☆

جہاں خواب کی کوئی خامشی ہے مری صدا سے بجھی ہوئی
وہیں ایک لہر ہوا کی ہے کسی بے ہوا سے بجھی ہوئی

اگر ابر و باد ہیں مختلف تو یہ دھوپ چھانو بھی اور ہے
کسی اور طرح کی یہ فضا ہے مری فضا سے بجھی ہوئی

یہ جو دل میں پھول سے کھل رہے ہیں ، نظر میں رنگ ہی رنگ ہیں
کوئی ، ہو نہ ہو ، مری تار ہے کسی خوش نما سے بجھی ہوئی

اُسی پل پلٹ گئی خوشگوار بنا کے موسمِ ہجر کو
جو بدن کی ایک بہار سی تھی کہیں قبا سے بجھی ہوئی

مرے عرصۂ شب و روز میں تھی ہر ایک شام اسی طرح
کوئی سُو بہ سُو سے بنی ہوئی ، کوئی جابجا سے بجھی ہوئی

مری طبعِ خام کی ایک سمت کہ میری بے خبری میں ہے
کہیں ماسوا سے کٹی ہوئی ، کہاں ماورا سے بجھی ہوئی

میں خود آپ دونوں کے درمیاں ہوں برائے نام سا رابطہ
کہ یہ ابتدا ہے بجائے خود کسی انتہا سے بجھی ہوئی

وہ زمانہ ہے کہ یہاں کسی کا کسی سے پردہ نہیں رہا
کہ ہر ایک چیز چھپی ہوئی بھی ہے برملا سے بجھی ہوئی

ظفر ، ایک آدمی کا تو کام یہ ہے نہیں کسی طرح بھی
کسی اور کی بھی فغاں ہے یہ جیسے مری نوا سے بجھی ہوئی

☆

گراں جانی وُہی ہے ، اور ، سُبکساری نہیں آئی
بھٹک بیٹھے ہیں سب ، لیکن مری باری نہیں آئی

رواں ہُوں گرتا پڑتا ٹھوکریں کھاتا تری جانب
ذرا سی بھی ابھی رستے میں ہمواری نہیں آئی

مَیں کھل کر ہنس بھی سکتا ہُوں، اُمنڈ کر رو بھی سکتا ہُوں
طبیعت میں ابھی اِتنی بھی لاچاری نہیں آئی

مرے حصے کی روزی رہ گئی رستے میں ہی اکثر
کبھی آدھی نہیں پہنچی ، کبھی ساری نہیں آئی

محبت کام ہی ایسا ہے کرتے جایئے پیہم
عجب کیا ہے کبھی ہم پر جو بیکاری نہیں آئی

سفر میں اس دفعہ سمتِ سفر ہی تھی غلط اپنی
وگرنہ راستے بھر کوئی دُشواری نہیں آئی

ہُوا ہے کام پہلے بھی ہمارا وقت پر کس دن
وہ تب آیا ہے جب اُس کی طلبگاری نہیں آئی

مسائل رات بھر بھی جاگتا رکھتے ہیں خلقت کو
مگر ، پھر بھی ابھی لوگوں میں بیداری نہیں آئی

ظفر ، ہو مال ہی ایسا تو گاہک سے شکایت کیا
مُناسب ہے جو ہم پر گرم بازاری نہیں آئی

☆

محبت ہو چکی ، ملنا ملانا رہ گیا ہے
جو سچ پوچھو تو خالی آنا جانا رہ گیا ہے

مُدارات آپ نے کر دی ہے پہلے ہی کُچھ اتنی
بس اب تو ایک محفل سے اُٹھانا رہ گیا ہے

ہُوئے ہیں شہر میں باقی تو سب تبدیل موسم
تُمھارا بادلوں کے ساتھ آنا رہ گیا ہے

کریں گے سیر ابھی حیرت سرائے دہر کی ہم
جو کُچھ اپنا یہاں پر آب و دانہ رہ گیا ہے

ہوا نے لا کے پھینکا ہے وہاں ہم کو جہاں پر
زمیں کم ہو چکی ہے ، اور ، زمانہ رہ گیا ہے

ہمارے ترکِ دُنیا کی مثال اب اور کیا ہو
تعلُّق آپ سے بھی غائبانہ رہ گیا ہے

کُچھ اپنے خواب، موسیقی پہ ہے اُفتاد ایسی
ترنُّم کھو چکا ہے ، بس ترانہ رہ گیا ہے

ہماری شاعری تو قصّۂ ماضی ہُوئی اب
فقط اُسلوب اپنا شاعرانہ رہ گیا ہے

ظفر ، اسرارِ ہستی کھول بیٹھا ہُوں سراسر
مگر ، اک آخری پردہ ہٹانا رہ گیا ہے

☆

پھر سرِ راہ کسی دوست کے مارے ہُوئے ہیں
اور ، مدد کے لیے دُشمن کو پُکارے ہُوئے ہیں

اب تو آنکھوں میں رُکے رہتے ہیں آنسو ، ورنہ
یہ مُسافر انہی رستوں سے گُزارے ہُوئے ہیں

اب ہمیں ڈھونڈتے پھرتے ہو گلی کُوچوں میں
ہم جو اس شہر سے مُدّت کے سدھارے ہُوئے ہیں

پھول اپنے بھی ہیں اس خاک پہ ، اور ہم نے یہاں
خواب و خواہش کے پرندے بھی اُتارے ہُوئے ہیں

پھیل جاتا تھا یہ سیلابِ سُخن سا ہر سُو
آخر کار ہم اپنے ہی کنارے ہُوئے ہیں

حق تو یہ ہے کہ تجھے اس کی خبر ہو کہ نہ ہو
تیرے ہونے سے بہُت کام ہمارے ہُوئے ہیں

ہیں کُچھ ایسے بھی کہ ممنونِ محبت ہوں گے
کئی ویسے بھی طرفدار تمھارے ہُوئے ہیں

آسمانوں پہ مزاج اُس کا بھی ہے پہنچا ہُوا
آئے گردش میں ہمارے بھی ستارے ہُوئے ہیں

شہر میں اپنا مُخالف ، ظفرؔ ، اس سے پہلے
کوئی کوئی تھا ، مگر ، اب یہاں سارے ہُوئے ہیں

-☆-

کبھی آ کر وہ اگر شکل دکھا جاتا ہے
اہلِ دُنیا کا بھلا پُوچھیے کیا جاتا ہے

موڑ دیتا ہے کسی اور طرف رُوئے سُخن
کام جو اتنا ضروری تھا ، رہا جاتا ہے

ساتھ لے جاتا ہے ساری وہ مری تاب و تواں
رو ہی سکتا ہُوں نہ پھر مجھ سے ہنسا جاتا ہے

بات ہے دل میں کوئی اور ، زباں پہ کُچھ اور
وہ کیا بھی کہیں جاتا جو کہا جاتا ہے

دھوپ جب دھوم مچاتی ہے سفر میں ہر سُو
ابر سا تب مرے اندر کوئی چھا جاتا ہے

خلق پس ماندہ ہے ، اور ، سانس بھی لینا مُشکل
آگے آگے ہی کہیں خواب ہوا جاتا ہے

دشت و در میں کہیں ٹھہراو کی صُورت ہی نہیں
گرد اُٹھتی ہے کہیں رنگ اُڑا جاتا ہے

رزق ہوتا ہے کسی اور کے حصّے کا ، مگر
چھینا جھپٹی میں کوئی اور ہی کھا جاتا ہے

وہ کہیں تخت نشیں اور بھی آگے ہے ، ظفرؔ
آسماں تک تو مرا دستِ دُعا جاتا ہے

-☆-

غمِ زُلفِ سیہ میں اِس دلِ رنجور کا کُھلنا
ہو جیسے صبحِ کاذب میں شبِ دیجور کا کُھلنا

جھجکتے ، اور شرماتے وہ اُس کا بوسہ اوّل
لرزنا ، اور ، پھر مُنہ میں بڑے انگور کا کُھلنا

نظر آنا نہ آنا اُس کی مرضی ہے ، مگر ، ہر دم
خود اپنی ہی چمک سے اُس مہِ مستور کا کُھلنا

اب آنکھوں کے بجائے دل سے رونے لگ گیا ہوں مَیں
مری نظروں میں ہے دن رات اِس ناسُور کا کُھلنا

اندھیرے ، اور ، اُجالے کی ہے آویزش وہی اب بھی
ازل سے جاری و ساری ہے شمعِ طور کا کُھلنا

اِس آمیزے سے کوئی اور ہی صورت نکل آئی
کِسی گمنام کے اندر کسی مشہور کا کُھلنا

سیاہی اور سفیدی کی ہم آغوشی سے اُس لمحے
وہ گاڑھی تیرگی میں اِک ضیائے نُور کا کُھلنا

کھلاوٹ تھی کِسی بھنچی ہوئی بے نام خواہش کی
عجب تھا ذائقے میں آج موتی چُور کا کُھلنا

فراق و وصل دونوں میں ، ظفر ، میرا زیاں ہے اب
مجھے معدوم کر دے گا قریب و دُور کا کُھلنا

-☆-

کُچھ ایسا ہے کہ اُس کو بے سبب چاہوں جہاں چاہوں
ترسنے کے لیے وہ کُنجِ لب چاہوں جہاں چاہوں

جو خواہش مُجھ میں بُجھتی ، اور ، روشن ہوتی رہتی ہے
ابھی کُچھ کہہ نہیں سکتا ہوں کب چاہوں جہاں چاہوں

کوئی موقع محل ایسا بھی آئے خوابِ ہستی میں
وہ خود بھی چاہتا ہو ، مَیں بھی تب چاہوں جہاں چاہوں

اب ایسی رائیگانی میں کوئی امکان بھی کیا ہو
جو پھر سے زندہ یہ خاکِ طلب چاہوں جہاں چاہوں

طریقہ چاہیے کوئی سلیقہ چاہیے کُچھ تو
یہ کیا انداز ہے آخر کُڈھب چاہوں جہاں چاہوں

کِسی کو بھی نہ چاہوں یہ جو ہر سُو لوگ ہیں اِتنے
کبھی چاہوں اگر تو سب کے سب چاہوں جہاں چاہوں

حقیقت میں تو میرے چاہنے سے ہی چلے گا کُچھ
سو ، بہتر ہے کہ چاہوں ، اور ، اب چاہوں جہاں چاہوں

کُچھ اپنے نالۂ ناپختہ پر ہوں شرمسار اِتنا
کہ مَیں دن میں بھی کوئی شورِ شب چاہوں جہاں چاہوں

ظفر ، کیا کیا پرندے پھڑپھڑاتے ہیں مرے اندر
مَیں اِن کو چھوڑتا رہتا ہوں جب چاہوں جہاں چاہوں

-☆-

شاہنشہِ زماں کا جو فرمانِ جنگ ہے
مضمونِ دار و گیر پہ عنوانِ جنگ ہے

برباد سرزمین پہ کھنڈرات کے خلاف
اِتنی جدید فوج کا اعلانِ جنگ ہے

آئیں گے خود تو بعد میں، اور، اُس کی آڑ میں
ہر سمت سے رواں سروسامانِ جنگ ہے

آغازِ کار سے ہی سروکار ہے ابھی
حال آں کہ اصل چیز تو پایانِ جنگ ہے

انجامِ کار پھیل بھی سکتی ہے چار سُو
اِس جنگ سے زیادہ بھی امکانِ جنگ ہے

اس کا بھی کچھ خیال رہے، آپ کے لیے
میدانِ مرگ بھی ہے جو میدانِ جنگ ہے

سب کو لیے بکھرے گا پرکاہ کی طرح
مُصحف خود اپنے آپ ہی طوفانِ جنگ ہے

تاریخ سے تو بس یہی ثابت ہے آج تک
ہر جنگجو اخیر پشیمانِ جنگ ہے

اُس کی تباہ کاریاں مخفی نہیں، ظفر
اِس پر بھی دل میں آپ کے ارمانِ جنگ ہے

☆

آئیں گی ہر طرف سے صدائیں نئی نئی
چلنے کو ہیں یہاں پہ ہوائیں نئی نئی

کرتے ہیں اب بھی لوگ خطائیں وہی، مگر
ایجاد ہو رہی ہیں سزائیں نئی نئی

تبدیل ہونے والا ہے منظر ہی سربسر
طے ہو رہی ہیں اپنی فضائیں نئی نئی

بارش بھی اُن میں ہو گی کبھی، اور، برق بھی
چھانے کو ہیں سروں پہ گھٹائیں نئی نئی

اب آئے گا اثر تو کہیں اور دُور سے
اب مانگنی پڑیں گی دُعائیں نئی نئی

اب کے بدن بھی تازہ اُگیں گے زمیں سے
اور، اُن پہ چُست ہوں گی قبائیں نئی نئی

ہو گی نئے سرے سے محبت اُسی کے ساتھ
دکھلائے گا وہ شوخ ادائیں نئی نئی

دُنیا یہی پرانی رہے گی اسی طرح
ہم آپ اگر اسے نہ بنائیں نئی نئی

مَیں تو خراب و خستہ بہت ہو چکا، ظفر
اُتریں گی اب فلک سے بلائیں نئی نئی

☆

میری طرف جو اُس کا ذرا سا جُھکاؤ تھا
کہنے لگا کہ وہ تو فقط رکھ رکھاؤ تھا

ہمسائے کی جو آگ بُجھانے میں تھا مگن
پیشِ نظر کچھ اپنا بھی اُس میں بچاؤ تھا

آہوں کے بعد سلسلۂ اشک ہے رواں
بارش جو آئی ہے تو ہوا کا دباؤ تھا

گردش میں تھے زمیں پہ ستارے عجب عجب
کیا گھاس تھی کہ جس کا فلک پر اُگاؤ تھا

وہ مہرباں ہُوا تو ہُوا اُن دنوں کہ جب
اس شہر سے ہمارا کہیں چل چلاؤ تھا

درپیش اس دفعہ تھا کوئی اور ہی سفر
اپنا تُمھارے شہر میں پہلا پڑاؤ تھا

اُس نے بھی تھا کیا ہُوا پُورا ہی بندوبست
چلتا اگر تو آخری اپنا بھی داؤ تھا

باہر کی آگ سے تو نمٹتے رہے، مگر
ایک اور بھی الاؤ کے اندر الاؤ تھا

گم ہو گئی جو تھی بھی محبت کہیں، ظفرؔ
دونوں کے درمیان کچھ ایسا کھچاؤ تھا

☆

پھر وہی دائرۂ کار سے باہر ہونا
شاعری کا مرے معیار سے باہر ہونا

کوئی پہچان کی صُورت بھی تو ہو اس کے بغیر
نہیں قسمت میں اس انبار سے باہر ہونا

ہم سمجھتے ہیں کہ ہو گا یہ ہمیشہ کے لیے
ایک بار اپنا لگاتار سے باہر ہونا

کبھی پانی میں گراں بارِ معانی کا سفر
کبھی الفاظ کا اشجار سے باہر ہونا

وہی بانہوں کی طرح پھیلی ہوئی خاکِ طلب
وہی اُس کا مرے آثار سے باہر ہونا

ڈوبنا عرضِ ہوس کا مرے اندر باہر
کچھ مری ہمتِ اظہار سے باہر ہونا

اپنے اثبات کا جب تک مجھے ہو گا نہ یقیں
نہیں ممکن ترے انکار سے باہر ہونا

راستے کے کبھی اَسرار میں داخل ہو کر
اپنی رُکتی ہوئی رفتار سے باہر ہونا

اپنے آپے ہی میں رہنے کی ہوس تھی، سو، ظفرؔ
تھا یہ کردار نہ گفتار سے باہر ہونا

☆

ہجوم شہر کی حالت بیاں ہی کر سکتا
میں اور کچھ بھی نہ کرتا، فغاں ہی کر سکتا

یہ داستاں کسی انجام کو پہنچ پاتی
شروع سلسلہء این و آں ہی کر سکتا

کرایے دار ہی رہتا بہت ہے اس دل میں
چلو، میں گھر نہیں، اس کو مکاں ہی کر سکتا

اگر یہاں پہ نہیں کر سکا کوئی خدمت
تو جا کے تھوڑی بہت کچھ وہاں ہی کر سکتا

وہاں بھی میرے مسائل کا حل نہیں، نہ سہی
جو خوش نہیں تو اسے سرگراں ہی کر سکتا

خطِ خیال پہ لانا تو تھا کبھی اس کو
یقیں تو چھوڑیے، اس کا گماں ہی کر سکتا

زباں دراز اگر ہو نہیں سکا ہوں بہت
تو اپنے آپ کو میں بے زباں ہی کر سکتا

رہا ہوں اپنے کنارے ہی باندھنے میں فضول
جو بحر تھا تو اسے بے کراں ہی کر سکتا

طمع فضول کیا داد خواہیوں کا، ظفر
یہ شاعری کا سفر رائیگاں ہی کر سکتا

☆

کچھ ڈوبنے کی ہے نہ ابھرنے کی اطلاع
اب تک وہی ہے اپنے بھنورنے کی اطلاع

ترکِ زمیں کی اب کہیں دیتا نہیں خبر
کرتا نہیں فلک سے اترنے کی اطلاع

روتا ہے دل تو مجھ کو بڑی مدتوں کے بعد
ملتی ہے کوہسار سے جھرنے کی اطلاع

ہوتا ہے جب دوبارہ روانہ تو پھر مجھے
دیتے ہیں قافلے کے گزرنے کی اطلاع

ظاہر نہیں کیا کبھی، ہوتی ہے سب مجھے
اس راستے سے اس کے گزرنے کی اطلاع

جو خود ہی ایک خواب سراسیمگی میں ہوں
کیا دیجیے انھیں مرے ڈرنے کی اطلاع

مزدور کارگاہ محبت سے آئے دن
آتی ہے کوئی کام نہ کرنے کی اطلاع

لوگوں کے ہاں مزید جھمیلوں کے باوجود
یکسو ہے اپنے اپنے بکھرنے کی اطلاع

اخبار آرزو میں، ظفر، اپنی آج کل
جینے کی چھپ رہی ہے نہ مرنے کی اطلاع

☆

دل ہے کسی گماں کے یقیں سے بھرا ہوا
لایا تھا میں یہ ظرف کہیں سے بھرا ہوا

پُر ہے مری زمین کسی آسمان سے
یا، آسماں ہے میری زمیں سے بھرا ہوا

اس فرشِ خاک سے ہو لبالب وہ عرشِ پاک
یہ خاکداں ہو خلدِ بریں سے بھرا ہوا

پڑتا ہے راہ میں ہی، اگر دیکھتے چلیں
اک سجدہ گاہ میری جبیں سے بھرا ہوا

گنجایش اس میں اب کسی مہماں کی ہو کہاں
جب یہ مکاں ہے اپنے مکیں سے بھرا ہوا

پوشیدہ ہے خزانۂ خواب اس نواح میں
ہے کیسۂ خیال وہیں سے بھرا ہوا

گھر ہے شراب خانۂ اُمید کے قریب
دیتے ہیں جام بوسہ یہیں سے بھرا ہوا

ہونا ہے مختلف بھی جواب اُس کا ایک دن
فی الحال تو ہے صاف نہیں سے بھرا ہوا

جب کُوچ کر گئے تو یہ جانو گے تب، ظفر
یہ شہر تھا بس ایک ہمیں سے بھرا ہوا

☆

دیکھا پھر اُس کو دھوپ کنارے پڑے ہوئے
مشکل میں تھا جو ساتھ ہمارے پڑے ہوئے

سو کر اُٹھے تو رونق اُسی طرح تھی ابھی
آنکھوں میں اُس کے خواب تھے سارے پڑے ہوئے

تھے کاہشِ زمانہ سے ہٹ کر کسی طرف
ہم بھی، تمھارے وصل کے مارے پڑے ہوئے

ہے کوئی خاص بات، کسی میں بھی جو نہیں
پیچھے نہیں ہیں یُوں ہی تمھارے پڑے ہوئے

شاید یہاں سے اپنا گزر پھر کبھی نہ ہو
ہم نے اُٹھا لیے ہیں نظارے پڑے ہوئے

گلدان تھا کسی کے یہاں، اور تھے وہاں
پھولوں کے ساتھ ساتھ شرارے پڑے ہوئے

اس کاروبارِ خاک سے مایوس بھی نہیں
ہوں گے کبھی تو دُور خسارے پڑے ہوئے

اُٹھیے کہ یہ خدا کی زمیں ہے بہت وسیع
کب تک رہیں کسی کے سہارے پڑے ہوئے

سبزہ تھا، اور، پھول سرِ آسماں، ظفر
اور، فرشِ خاک پر تھے ستارے پڑے ہوئے

☆

خواہشوں کے جو مخالف تھے نہ خوابوں کے خلاف
طبلِ جنگ آج بجاتے ہیں خرابوں کے خلاف

جی میں ٹھانی ہے تو یلغار رہے گی ، بے شک
سب اُصولوں کے ہو برعکس ، کتابوں کے خلاف

چندرہ لاکھ تو ہیں طفلکِ معصوم اُن میں
آگ بھڑکی ہے ابھی زرد گلابوں کے خلاف

اُن سے کیا شکوہ ہے جو برسرِ پیکار ہیں خود
اپنے اعداد و شمار ، اور ، حسابوں کے خلاف

عاقبت خاک بسر کیوں نہ ہو اُس قوم کی جو
صاف حق میں ہو گناہوں کے ، ثوابوں کے خلاف

پڑھ تو رکھا تھا مکاتب میں اُنھوں نے کچھ اور
کر رہے ہیں جو اب اپنے ہی نصابوں کے خلاف

خیمہ کس طرح گرے گا نہ سروں کے اوپر
پنجہ فرما ہیں جو اپنی ہی طنابوں کے خلاف

ان میں ہو سکتا ہے صد گونہ اضافہ بھی کہیں
لڑنے آئے ہیں جو ان خفیہ عذابوں کے خلاف

ہم بھی نکلے ہیں مدد کے لیے اُن کی کہ ظفر
جن کی اپنی ہی نگاہیں ہیں رکابوں کے خلاف

☆

چراغ بجھ گئے سارے ، چمن خراب ہوا
کچھ اس طرح سے یہ سازِ سخن خراب ہوا

ملول کچھ نہ ہُوا رنگِ لب اُتار کے بھی
وہ بوسہ جس سے تُمھارا دہن خراب ہوا

کچھ اس طرف بھی رہی تیز عمر کی آندھی
شجر اُکھڑ گئے ، باغِ بدن خراب ہوا

وجود ہی کوئی شیریں کا جب نہ تھا کوئی
تو پھر ، بتایئے ، کیوں کوہکن خراب ہوا

رُکی ہوئی تھی جہاں پر بہار چاروں طرف
وہیں پہ موسمِ جاں دفعتاً خراب ہوا

ہمارے روکنے سے رُک نہیں سکا آنسو
نکل کے گھر سے جو یہ بے وطن خراب ہوا

اگرچہ خوب ہے آب و ہوائے کوچۂ دل
گیا ہے جو بھی وہاں لازماً خراب ہوا

ہمارا اپنا تو کچھ بھی رہا نہ پاس اپنے
کہ فکر عام ہوئی ، اور ، فن خراب ہوا

ٹھٹھکتے ہوئے پھرتے ہیں جیسے خود کو ، ظفر
کہ چال بھول گئی ، اور ، چلن خراب ہوا

☆

ہماری تمھاری ملاقات چھُپی نہیں
لبوں پہ اندھیرا رہا ، بات چھُپی نہیں

کڑکتی رہیں بجلیاں رائگاں کوہ پہ
کسی بھی طرف سے کوئی دھات چھُپی نہیں

سرِ راہ بھی بوسہ اُس نے چھپا کر دیا
اسی خاطر اُس کی یہ خیرات چھُپی نہیں

دُھندلکا سا تھا کوئی دل کے کناروں کے ساتھ
بہُت روشنی تھی ، مگر ، رات چھُپی نہیں

عجب شخص تھا ، پھر بھی اُس نے یقیں کر لیا
اگرچہ ہماری کرامات چھُپی نہیں

بہُت جھلملاتی پھری ہے ادھر سے اُدھر
وہ موجِ محبت مرے ساتھ چھُپی نہیں

مری شاعری پہ کوئی سایہ سخت ہے
جبھی تو کہیں سے یہ نُبجات چھُپی نہیں

اُمڈتے ہُوئے اشک اُسی سمت واپس مُڑے
گھڑی بھر کو بھی اپنی برسات چھُپی نہیں

بہُت سنگِ ہستی نے رگڑے دیے ہیں ، ظفرؔ
مگر ، پھر بھی اتنی مری ذات چھُپی نہیں

کئی دن سے یہ کیسے آئنوں میں آ رہا ہُوں
مجھے دیکھو مَیں اپنے آنسوؤں میں آ رہا ہُوں

اندھیری رات کی چڑھتی ہوا ہُوں ، اس لیے مَیں
دیا بن کر تمھارے راستوں میں آ رہا ہُوں

بڑا ہی لطف تھا آزاد پھرنے میں یہ ہر طور
مگر اب مَیں تمھارے دائروں میں آ رہا ہُوں

ابھی کُچھ اور اپنا منتظر رہنا ہے مُجھ کو
کہ مَیں اب کے تمھاری خوشبوؤں میں آ رہا ہُوں

اگر چل ہی پڑا ہُوں باغِ ہستی سے تو سُن لو
تمھارے ہی برہنہ بازوؤں میں آ رہا ہُوں

مرا تو دخل اس میں ہو نہیں سکتا ہے کوئی
جو کُچھ دن سے تمھاری اُلجھنوں میں آ رہا ہُوں

تمھیں معلوم تو ہو گا کہ تھوڑے ہی دنوں میں
صبا ہو کر تمھارے گلشنوں میں آ رہا ہُوں

فضائیں اور کی کُچھ اور ہوتی جا رہی ہیں
محبت کے بدلتے موسموں میں آ رہا ہُوں

مری موجیں مُوّاج ہیں ، سو ، ایک آہنگی سے
نمی بن کر تمھارے ساحلوں میں آ رہا ہُوں

ستارے گھلتے گھلتے دن نکل آتا ہے اکثر
محبت کر رہا ہوں، رت جگوں میں آ رہا ہوں

بہت مجبور ہوں، کفرانِ نعمت کیا کروں میں
نہایت عجز سے بعشرت کدوں میں آ رہا ہوں

ہوائے حرص ہوں، مجھ پر کوئی قدغن نہیں ہے
دریچوں سے گزرتا ہوں، دروں میں آ رہا ہوں

مرے پیچھے مدد اُس حسنِ کامل کی ہے شاید
مرادِ خاص ہوں اور دامنوں میں آ رہا ہوں

محبت کی دھڑکتی دھند بن کر ہر طرف سے
چھتوں پر چھا رہا ہوں اور گھروں میں آ رہا ہوں

روانہ ہی مجھے رہنا ہے شامِ زندگی تک
کہ اپنے اور کسی کے فاصلوں میں آ رہا ہوں

بہت سوچا گیا ہے، کچھ مجھے چاہا بھی جائے
دماغوں کے بجائے اب دلوں میں آ رہا ہوں

میں اپنا راستہ خود بھی نہیں اب روک سکتا
کرن ہوں اور اندھیرے روزنوں میں آ رہا ہوں

ابھی تو پیش گوئی کوئی بھی ممکن نہیں ہے
ابھی تو صرف اُس کے رابطوں میں آ رہا ہوں

تمھاری رات کا ہوں آج بھی تنہا مسافر
مگر اب کے ذرا میں جگنوؤں میں آ رہا ہوں

کوئی شے اور مجھ کو چاہیے ہے درحقیقت
بہ ظاہر تو تمھاری صحبتوں میں آ رہا ہوں

میں اپنے ہمہموں سے دور ہو کر کچھ دنوں سے
ندانستہ تمھاری رونقوں میں آ رہا ہوں

اِسے آگے بھی کچھ تقسیم ہونا چاہیے تھا
تمھارا زہر ہوں اور شیشیوں میں آ رہا ہوں

جو سچ پوچھو تو یہ پاپڑ مرے بیلے ہوئے ہیں
سو از خود ہی تمھارے چکروں میں آ رہا ہوں

کچھ اپنے گم شدہ گُل کی مجھے بھی جستجو تھی
اکیلا ہی نہیں ہوں، تتلیوں میں آ رہا ہوں

تقاضا عمر کا بھی یہ نہیں ہے، لیکن اب کے
اُسے دیکھا ہے اور کیا مستیوں میں آ رہا ہوں

تمنا ہو کے ہونا ہے ادا اُس کی نظر سے
تلاطم بن کے اُس کی چھاتیوں میں آ رہا ہوں

محبت میں یہی اک راستہ باقی بچا ہے
کسی صورت کسی کے زانوؤں میں آ رہا ہوں

ابھی تو لوگ ہیں اور شور ہے میرے پس و پیش
یہ میں کس طرح کی تنہائیوں میں آ رہا ہوں

میں ظاہر ہونے والا ہوں دلوں کی حسرتوں میں
نہ پوری ہونے والی خواہشوں میں آ رہا ہوں

کسی کا خواب ہوں اور ٹوٹنے والا ہوں یک سر
کسی کی پیاس ہوں اور بارشوں میں آ رہا ہوں

بہت گزرا ہوں اُس کے قرب کی کٹھنائیوں سے
سو ، اب میں ہجر کی آسائشوں میں آ رہا ہوں

ہوائیں میرے استقبال کو موجود ہوں گی
کہیں جو رُک گئی ہیں اُن رُتوں میں آ رہا ہوں

مری آواز بھی ہے اُن میں شامل ہونے والی
ابھی سازِ تماشا کی دُھنوں میں آ رہا ہوں

کوئی تو بات ہے جس کی بہ دولت ہوتے ہوتے
لہو ہونے سے پہلے ہی رگوں میں آ رہا ہوں

ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا کہ میں تقسیم ہو کر
مآلِ کار کتنے سلسلوں میں آ رہا ہوں

بالآخر پارسا لوگوں کی صحبت چھوڑ کر میں
دوبارہ سے پُرانے ساتھیوں میں آ رہا ہوں

نہ جانے کب سے اشیائے ضرورت کی طرح سے
سرِ بازارِ دُنیا پیکٹوں میں آ رہا ہوں

مسائل اور بھی پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں
میں جب سے دفتروں اور کھڑکیوں میں آ رہا ہوں

فقط اشراف ہوتے ہیں کبھی ہم راہ میرے
کبھی میں چرسیوں اور بھنگیوں میں آ رہا ہوں

مری اوقات اس سے صاف ظاہر ہے کہ اب میں
چماروں ، دھوبیوں اور موچیوں میں آ رہا ہوں

یہی ہے راز میرے مُنفرد ہونے کا سب میں
کہ خود سے بھی زیادہ بے تکوں میں آ رہا ہوں

مجھے خود شامتِ اعمال بھی کہتے ہیں یہ لوگ
میں وہ پھندا ہوں ، سب کی گردنوں میں آ رہا ہوں

کرو گے میرا استقبال بھی اب احتراماً
کہ پاجی ہی سہی میں حاجیوں میں آ رہا ہوں

مری عزت ہے روز افزوں کہ میں کب سے یہاں پر
حکومت کے خصوصی مُخبروں میں آ رہا ہوں

خُدا کی خاص مجھ پر مہربانی ہے کہ اب میں
بڑوں میں جا رہا ہوں ، افسروں میں آ رہا ہوں

مرے درجات بڑھتے جا رہے ہیں رفتہ رفتہ
مُسلسل تذکروں اور فائلوں میں آ رہا ہوں

ابھی کچھ فیصلے کرنے کی حالت میں نہیں مَیں
ابھی تو صرف خالی مشوروں میں آ رہا ہوں

مُجھے خود سے بڑا ہونے کی خواہش اِس قدر ہے
کہ بَونا ہوں، مگر، مَیں ہاتھیوں میں آ رہا ہوں

گواہی میری کتنی معتبر ہونے لگی ہے
سزایابی کے سارے فیصلوں میں آ رہا ہوں

مُجھے اپنی سمجھ خود بھی نہیں آتی ہے اب تو
کہ خود مظلوم ہوں اور ظالموں میں آ رہا ہوں

ابھی موجود ہوں اپنی جگہ پر مَیں، ابھی تو
جہاں بھی آ رہا ہوں کاغذوں میں آ رہا ہوں

مرے آنے کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اب مَیں
بگولوں میں رواں ہوں، آندھیوں میں آ رہا ہوں

مَیں اپنے منطقی انجام سے دوچار ہوتے
بالآخر آج اپنے بھائیوں میں آ رہا ہوں

مُجھے اب دشمنوں کی کوئی حاجت کیا رہے گی
کہ مَیں اپنے پُرانے دوستوں میں آ رہا ہوں

درختوں اور درندوں پر مُصیبت کی گھڑی ہے
کوئی جگنو ہوں اور مَیں جنگلوں میں آ رہا ہوں

یہ کیسا آئے دن تبدیل ہو جاتا ہوں اب مَیں
مُصفّا ہو کے پھر آلائشوں میں آ رہا ہوں

مُجھے تھیلوں میں سپلائی کیا اہلِ دُکاں نے
اور اب مَیں کیسے کیسے برتنوں میں آ رہا ہوں

مَیں خود مہنگائی کا مارا ہُوا ہوں، اس لیے مَیں
اچاروں، دال دلیوں، چٹنیوں میں آ رہا ہوں

مرے آنے کا اور امکان ہی کوئی نہ تھا اب
کہ مالک ہوں مگر مَیں نوکروں میں آ رہا ہوں

مُسلّم ہے افادیت مری اب ہر طرف سے
مُسلسل اور پیہم سازشوں میں آ رہا ہوں

مرا لانا اُترنا ہی تردُّد ہے بہ ہر طور
وگرنہ بوریوں کی بوریوں میں آ رہا ہوں

مَیں اپنے ہمدموں کے ساتھ آتا ہوں تو اکثر
مُجھے لگتا ہے جیسے مسخروں میں آ رہا ہوں

مری کایا پلٹ جاتی ہے کیوں کر بیٹھے بیٹھے
کُچھ اب کے اور ہی خاصیتوں میں آ رہا ہوں

جہاں سارے کے سارے خُون کے پیاسے ہیں میرے
برابر ایسے ایسے جنگلوں میں آ رہا ہُوں

اگر میں بستیوں سے کر رہا ہوں شہر کا رُخ
تو شہروں سے نکل کر بستیوں میں آ رہا ہُوں

زمیں سیراب کرتے پانیوں میں چلتے چلتے
فلک سے چھانو کرتے بادلوں میں آ رہا ہُوں

چمکتی دُھوپ کی صُورت کہیں زینہ بہ زینہ
پہاڑوں سے اُتر کر وادیوں میں آ رہا ہُوں

کبھی سمجھو گے ، کیا کیا ہیں تمہیں پوشیدہ مُجھ میں
ابھی دیکھو گے ، کتنے ذائقوں میں آ رہا ہُوں

اگر میں گر رہا ہُوں اتنی اُونچائی سے یک دم
تو سمجھو اپنی ہی گہرائیوں میں آ رہا ہُوں

یہاں سے تب مُجھے کس شکل میں بھیجا گیا تھا
سو ، واپس کیسی کیسی صُورتوں میں آ رہا ہُوں

کبھی میں آپ ہی تھا قابلِ دید ایک منظر
مگر اب کیسے کیسے منظروں میں آ رہا ہُوں

مرا ہونا سبھی کے ساتھ ہے اس روز و شب میں
کہ میں جیسا بھی سودا ہُوں ، سروں میں آ رہا ہُوں

مجھے لے جائے گا کتنی بلندی پر بہ ہر حال
میں جتنا زور ہُوں ، سارا پروں میں آ رہا ہُوں

کبھی مضمون میں بھی آئے گا میرا حوالہ
ابھی تو صرف ذیلی حاشیوں میں آ رہا ہُوں

کبھی کوئی مرے قد سے بھی پہچانے گا مُجھ کو
ابھی تو مختلف پیراہنوں میں آ رہا ہُوں

چراغوں کا دُھواں بھی اب نہیں باقی جہاں پر
کئی دن سے اُن اُجڑی محفلوں میں آ رہا ہُوں

اکیلا بھی چلا آتا تھا ان آبادیوں میں
مگر اس بار اپنے قافلوں میں آ رہا ہُوں

ابھی بادل تو چھایا ہی نہیں ہے آسماں پر
ابھی سے میں کڑکتی بجلیوں میں آ رہا ہُوں

اُڑا لے جائے گا پھر ساتھ کوئی جھنڈ مُجھ کو
ابھی کُچھ دیر پہلے طائروں میں آ رہا ہُوں

نتائج سے مُجھے اتنی غرض کوئی نہیں ہے
میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کاوشوں میں آ رہا ہُوں

میں اپنی خُوبیوں میں بھی ہُوا ہُوں خُوب ظاہر
مگر اب کے میں اپنی خامیوں میں آ رہا ہُوں

گھروں کو چھوڑنے والوں سے میرا رابطہ ہے
کئی دن سے اُجڑتے مسکنوں میں آ رہا ہُوں

بھروسا ۔ نہیں ہے مُجھ کو اپنے آپ پر کُچھ
ہمیشہ سے ہی جیسے دُوسروں میں آ رہا ہُوں

خُدا ہی میرا حافظ ہے کہ مَیں اس مرحلے پر
خُدا سے جا رہا ہُوں اور بُتوں میں آ رہا ہُوں

غنیمت ہے کہ اس بے رہ روی کی اِنتہا پر
اگر مَیں بھی ہوس کے قاعدوں میں آ رہا ہُوں

مَیں اپنے جوڑ سے باہر نکلنا چاہتا تھا
جو پیلوں سے جُدا ہو کر ہروں میں آ رہا ہُوں

مُسخّر کر لیا ہے اپنے آبا کی کشش نے
سو، مَیں صد احتراماً بندروں میں آ رہا ہُوں

توانائی نئی درکار ہے لوگوں کو اب کے
سلادوں، سبزیوں میں، اور پھلوں میں آ رہا ہُوں

گُلوں کے گال میرے منتظر ہوں گے سراسر
صبا سے پہلے پہلے شبنموں میں آ رہا ہُوں

مرے آنے سے پہلے کُھل نہیں سکتا کِسی پر
خُوشی سے چل رہا ہُوں یا دُکھوں میں آ رہا ہُوں

مرے رُخ اور بھی ہیں غور سے دیکھو تو جانو
چُھپا ہُوں جلوتوں میں، خلوتوں میں آ رہا ہُوں

مجھے پھر بھی کوئی پہچان سکتا ہو تو آئے
مَیں خُود سالم ہُوں اور ٹُوٹے ہُوؤں میں آ رہا ہُوں

سمندر مُجھ سے باغی ہو گیا ہے اس لیے مَیں
سفینوں سے اُتر کے کشتیوں میں آ رہا ہُوں

اِدھر میرا ستارہ ہے کہ چکّر کھا رہا ہے
اُدھر میں بھی مُسلسل گردشوں میں آ رہا ہُوں

ابھی پُوری طرح ظاہر نہیں ہوتا ہے مُجھ کو
ابھی اپنی ہی مَیں پرچھائیوں میں آ رہا ہُوں

مرا ہونا بھی ہوتا ہے کوئی دو ایک پَل کا
کہ سطحِ آب پر ہُوں، بُلبُلوں میں آ رہا ہُوں

کبھی میری خبر ملتی ہے رنگِ آسماں سے
کبھی لمبے زمیں کی کروٹوں میں آ رہا ہُوں

مَیں خُود میں زمزمہ پرداز ہُوں سب سے الگ ہی
کبھی دھیمے، کبھی اُونچے سُروں میں آ رہا ہُوں

کسی بھی طور معرُوف و مُعزز بھی نہیں مَیں
تو پھر کِس وجہ سے رُسوائیوں میں آ رہا ہُوں

کہیں عمرِ گذشتہ کی کبھی برکات لے کر
پُرانے جسم و جاں کی جھڑیوں میں آ رہا ہُوں

کہیں پیچیدہ گرہوں سے گزر ہوتا ہے میرا
کہیں حل ہونے والی گتھیوں میں آ رہا ہُوں

یہ لمحات سے آگے گزر جانا ہے مُجھ کو
ستارہ سی چمکتی ساعتوں میں آ رہا ہُوں

بھلا دیکھوں کہاں سے یہ نمو آتی ہے مُجھ میں
تنے سے ہو کے مَیں اپنی جڑوں میں آ رہا ہُوں

نہیں معلوم اُدھم کیوں نہیں مَیں نے مچایا
خلافِ طبع کیوں خاموشیوں میں آ رہا ہُوں

بشارت دے رہا ہُوں اپنے آنے کی ، مگر مَیں
بتا سکتا نہیں کتنے دِنوں میں آ رہا ہُوں

مجھے جس روز سے اپنا یقیں ہونے لگا ہے
مَیں تب سے کیسے کیسے واہموں میں آ رہا ہُوں

مرا آنا ابھی ظاہر نہیں ہو پا رہا ہے
ابھی کُچھ سلوٹوں ، کُچھ آہٹوں میں آ رہا ہُوں

مرا مصرف کوئی البتہ بہتر چاہیے ہے
کفایت کیوں کریں گے ، درجنوں میں آ رہا ہُوں

کبھی شرمندہ شرمندہ پھرا ہُوں عاشقوں میں
کبھی مَیں ڈرتے ڈرتے شاعروں میں آ رہا ہُوں

غزل میں غرق ہو جانا بھی کوئی مُجھ سے سیکھے
ردیفوں میں پڑا ہُوں ، قافیوں میں آ رہا ہُوں

ظفرؔ ، یہ بھی غنیمت ہے کہ اتنا پھیل کر بھی
مَیں اپنے آپ ہی اپنی حدوں میں آ رہا ہُوں

☆

احمد ندیم قاسمی

عرضِ ناشر

قارئین و ناقدین و محققین ادب کے لیے نوید ہے کہ ظفر اقبال کی کلیاتِ غزل ''اَب تک'' کی اس جلد دُوم میں دو نئے (غیر مطبوعہ) مجموعہ ہائے کلام بعنوانات ''ترتیب'' اور ''تماشا'' بھی شامل ہیں، جو یقیناً قابلِ توجہ اور موضوعِ مُباحث ٹھہریں گے۔

اس جلدِ دُوم کا دیباچہ بعنوان ''خامہ بگوشیاں'' مشفق خواجہ مرحوم کے کالموں کے اقتباسات پر مبنی ہے جو ظفر اقبال کو ہمیشہ ''شاعرِ بے مثال'' لکھا کرتے تھے، اور اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں ظفر اقبال صاحب کی فرمائش پر اپنے کالموں کا مجموعہ ''سخن در سخن'' اُنھیں بھجوا دیا تھا، جس میں سے دو کالم، اور نصف کالم اُن کے بھیجے ہُوئے ہفت روزہ ''تکبیر'' کے ایک شمارے سے لیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے ظفر اقبال کو اجازت دی تھی کہ اسے آپ ایڈٹ بھی کر سکتے ہیں یعنی جن جُملوں میں ظفر اقبال صاحب کی بھد اُڑائی گئی ہے وہ حذف کر سکتے ہیں، لیکن ظفر اقبال اس پر رضا مند نہ ہُوئے کہ اپنی بھد تو وہ خُود بھی بڑے ذوق و شوق سے اُڑایا کرتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی تحریریں من و عن درج کی گئی ہیں۔

یُوں اب تک کی جلد دُوم بھی بروقت طباعت کے مراحل طے کر کے قارئین کے ذوقِ مُطالعہ کے سپرد ہو گئی ہے۔ یعنی رائٹرز ایسوسی ایشن لاہور کے زیرِ اہتمام ملٹی میڈیا افیئرز جناب ظفر اقبال کے کُلیاتِ غزل کا لگ بھگ نصف سے زائد کلام تاریخ ادب کی حفاظت میں دینے کا انصرام کر چُکا ہے۔

ایک ضرُوری بات جو ''اَب تک'' کی جلد اوّل کی اشاعت کے موقع پر آپ کے علم میں نہ لائی جا سکی، وہ یہ کہ ہر جلد کے ٹائٹل پر نہ صرف ظفر اقبال نے عُنوان ''اَب تک'' کی خطاطی از خود (بقلم خُود) کی ہے، بلکہ ٹائٹل پر چھپا ہُوا اُن کا نام بھی اُن ہی کا آٹوگراف ہے، جس کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ یقیناً جلد از جلد جلد سوم بھی شائع ہو کر آپ تک پہنچا دی جائے گی۔

اظہر غوری